جدید ادب جرمنی

www.jadeedadab.com

شمارہ: 16

بچپن کے خزانے میں
کتنے زمانے تھے
اُس ایک زمانے میں

حیدر قریشی

JADEED ADAB Literary Urdu Journal (January to June 2011)

Haider Qureshi Rossertstr.6, Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر رضیہ حامد

الوقار پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے شائع کردہ
۵۵۶ صفحات پر مشتمل حیدر قریشی کی کتاب "اردو ماہیا تحقیق وتنقید"
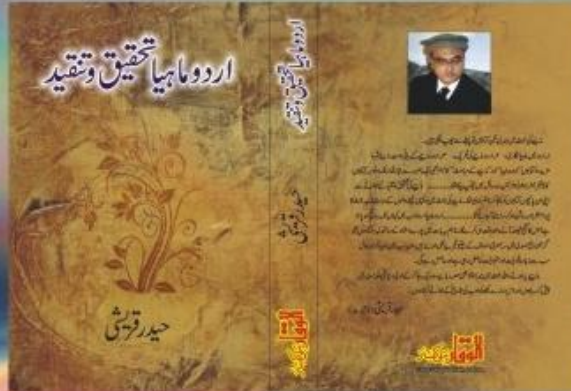
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

اردوستان: انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جو اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدر قریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر: حسن علی کی مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی ایک اہم ویب سائٹ،جس میں مختلف موضوعات پر متعدد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جا سکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔

www.kitaabghar.com

اردو دوست ڈاٹ کام: **خورشید اقبال** کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات**،ادبی خبرنامہ **اردو ورلڈ**،ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**، ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اور دلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

اردو ماہیا

http://www.urdudost.com/archive/old-mahya.html

حیدر قریشی کی تخلیقات کی ویب سائٹ اور تراجم کے لنکس

www.haiderqureshi.com

---

http://haiderqureshi.spaces.live.com/

حیدر قریشی کی شاعری کے تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدر قریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

بقول ڈاکٹر وزیر آغا: حیدر قریشی کی زندہ رہنے والی کتاب

گیارہ کتابوں پر مشتمل **عمر لاحاصل کا حاصل** شائع ہو گئی

حیدر قریشی کی کتاب **عمر لاحاصل کا حاصل** کا لائبریری ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔میگزین سائز کی یہ ضخیم کتاب ۶۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں تخلیقی کام پر مشتمل حیدر قریشی کی یہ گیارہ کتابیں یکجا کی گئی ہیں۔۱۔**سلگتے خواب** (غزلیں)۔۲۔**عمر گریزاں** (غزلیں،نظمیں اور ماہیے)۳۔**محبت کے پھول** (ماہیے)۴۔**دعائے دل** (غزلیں اور ماہیے) ۵۔**درد سمندر** (غزلیں،نظمیں اور ماہیے) اور ان مجموعوں کے بعد کی شاعری۔۶۔**روشنی کی بشارت** (افسانے)۷۔**قصے کہانیاں** (افسانے) ۸۔**میری محبتیں** (خاکے)۔۹۔**کھٹی میٹھی یادیں** (یادیں)۔۱۰۔**فاصلے قربتیں** (انشائیے) ۱۱۔**سوئے حجاز** (سفرنامہ) اور ان مجموعوں کے بعد کی تخلیقات۔ان مختلف شعری ونثری کتابوں میں ایسا ربط باہم ہے کہ گیارہ کتابیں ایک کتاب لگتی ہیں۔کتاب کے آخر میں ۴ صفحات پر حیدر قریشی کی اب تک کی جملہ تصنیفات (صرف تصنیفات) کی طویل فہرست کتابوں کے سال اشاعت اور پبلشر کے ادارہ کے نام کے ساتھ درج کی گئی ہے۔اور ایک صفحہ پر **پاکستان** سے ڈاکٹر وزیر آغا،**جرمنی** سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ،**انڈیا** سے دیویندر اسر،**روس** سے ڈاکٹر لڈمیلا،**انگلینڈ** سے ڈاکٹر ڈیرک لعل ووڈ،**مصر** سے ہانی السعید اور **امریکہ** سے کساندرا راؤزن کے اردو یا انگریزی میں تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے ”حیدر قریشی نے اپنی اس زندہ رہنے والی کتاب کو ”عمر لاحاصل کا حاصل“ کہا ہے۔غور کیجئے کہ اس عنوان میں لاحاصل سے حاصل تک کا سفر ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کم کم دیکھنے میں آئی ہے۔“ ڈاکٹر کرسٹینا لکھتی ہیں کہ ”حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے“۔دیویندر اسر کے بقول ”حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی ابتدا ہیں۔“ڈاکٹر لڈمیلا حیدر قریشی کی مجموعی ادبی صلاحیت کو معجزہ قرار دیتے ہوئے اس پر حیرت کا اظہار کر رہی ہیں تو ڈاکٹر ڈیرک لعل ووڈ حیدر قریشی کو فلاسفیکل کہانی کار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

Haider Qureshi'splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation

ہانی السعید نے حیدر قریشی کو جدید اردو ادب کا ایک بڑا شہسوار قرار دیا ہے تو کساندرا راؤزن نے حیدر قریشی کے بارے میں لکھا ہے کہ Haider Qureshi is a breath of fresh air for our time

کتاب کا سرورق **مصطفیٰ کمال پاشا** (دہلی) نے بنایا ہے جبکہ منفرد نوعیت کا بیک ٹائٹل **خورشید اقبال** (۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال) کا بنایا ہوا ہے۔ **عمر لاحاصل کا حاصل** کو دہلی کے معروف و ممتاز اشاعتی ادارہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔اس کے حصول کے لیے براہ راست پبلشر سے یا پھر حیدر قریشی سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔دونوں کے ای میل ID یہ ہیں: **پبلشر**: ephdelhi@yahoo.com

مصنف: haider_qureshi2000@yahoo.com **اور** hqg786@arcor.de

ارشد خالد (اسلام آباد) کی جانب سے انٹرنیٹ پر یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے 11.05.2009 کو ریلیز کی گئی۔جہاں سے اردو کی کئی ویب سائٹس نے اسے شائع کیا۔

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

کتابی سلسلہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ: 16 (جنوری تا جون 2011ء)

مدیر: حیدر قریشی

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے

Haider Qureshi
Rossertstr.6 , Okriftel,
65795-Hattersheim, Germany.

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de

haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: مصطفیٰ کمال پاشا

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)
PH:23215162, 23214465, FAX: 0091-11-23211540
E-MAIL: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
گفتگو	حیدر قریشی	۷
حمد و نعت		
فاذکرونی اذکرکم /دعائیہ	افتخار عارف	۸
ترا اسم ہے مری زندگی	اسلم انصاری	۹
نعتیہ	افتخار عارف	۱۰
دعائیہ	افتخار عارف	۱۰
اے شبستانِ حرا	اسلم انصاری	۱۱
حمد باری تعالیٰ	رفیق شاکر	۱۲
نعتِ رسول	غلام مرتضیٰ راہی	۱۲
نعت نبیؐ جی	حفیظ انجم	۱۳
نعتیہ	حفیظ انجم	۱۳
مضامین		
حضرت محی الدین ابن عربی	عامر سہیل	۱۴
رومال پر تحریر	ہرٹا مولر/مبشر احمد میر	۲۶
اردو میں فنی اور سائنسی تراجم	خادم علی ہاشمی	۳۷
مخدوم کی اہم نظموں کا تجزیاتی مطالعہ	شیخ محبوب ثاقب	۴۸
جرمنی کا ایک اردو رسالہ	ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	۵۵
ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے تعزیتی گوشہ		
انٹرنیٹ پر جاری کی گئی خبر	حیدر قریشی	۵۷
وزیر آغا جدید اردو ادب کے عظیم دانشور	اردو اکادمی دہلی	۵۹
نقاد،انشائیہ نگار اور شاعر	بی بی سی،لندن	۶۰
ایک بڑے ادبی تارے کا غروب	منشایاد	۶۳
روشنی سفر میں ہے	زاہدہ حنا	۶۵
آہ!ڈاکٹر وزیر آغا	اکبر حمیدی	۶۹
ڈاکٹر وزیر آغا	امجد اسلام امجد	۷۱
ڈاکٹر وزیر آغا:اردو ادب کا آخری ستون	افتخار نسیم	۷۳
ڈاکٹر وزیر آغا بھی رخصت ہوگئے	سرفراز سید	۷۵

صدرِ پاکستان، وزیرِ اعلیٰ پنجاب، چیئر مین اکادمی ادبیات	حکومتی تعزیت	۷۷

تعزیتی تاثرات ۷۸

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سی ایم نعیم، نند کشور وکرم، ڈاکٹر لڈمیلا وسیلئیو یا، گلزار، ندا فاضلی، خورشید اکبر، احمد حسین مجاہد، شمیم حنفی، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر خلیل طوق اَر، ہانی السعید، ڈاکٹر ریاض اکبر، اسلم رسولپوری، جگدیش پرکاش، ناصر جمیل، عبداللہ جاوید، مقصود جعفری، منیزہ جمال، کاوش عباسی، ارشد خالد، سردار علی، اقبال حسن آزاد، عمران مشتاق، عامر جمیل، وقار جاوید، ارمان نجمی، سہیل اختر، افضل چوہان، عصمت حیات علوی، صبیحہ صبا اور احمد صغیر جعفری، سعید شباب، فرحت نواز، انور جاوید ہاشمی، ناصر نظامی، فاروق خالد، احسان سہگل، خاقان ساجد، خادم علی ہاشمی، نذیر فتح پوری، پرویز مظفر، اقتدار جاوید، محمد عرفان صادق، ڈاکٹر رضیہ حامد، اشعر نجمی، مبشر احمد میر، معید رشیدی، **ڈاکٹر گوپی چند نارنگ**۔۔۔۔۔سلیم آغا قزلباش۔

انگریزی اخبارات

Life and Times of Dr. Wazir Agha	Dr. Amjad Parvez	۸۸
Dr. Wazir Agha	Munir Ahmad	۹۰
Dr. Wazir Agha An Era unto himself	Hammad Ghaznavi	۹۱
A Farewell to Dr. Wazir Agha	Kazy Javed	۹۴

غزلیں

وزیر آغا	وزیر آغا	۹۵
صبا اکبر آبادی	صبا اکبر آبادی	۹۶
اسلم انصاری	اسلم انصاری	۹۷
اکبر حمیدی	اکبر حمیدی	۹۸
احمد ہمیش	تاجدار عادل	۹۹
تاجدار عادل	تاجدار عادل	۱۰۰
خورشید اکبر	خورشید اکبر	۱۰۱
کاوش عباسی	کاوش عباسی	۱۰۲
صادق باجوہ	احمد حسین مجاہد	۱۰۳
رؤف خیر	رؤف خیر	۱۰۴
غلام مرتضیٰ راہی	غلام مرتضیٰ راہی	۱۰۵
افتخار نسیم	حمیدہ معین رضوی	۱۰۶
معراج رعنا	معراج رعنا	۱۰۷
حفیظ انجم	غیاث انجم	۱۰۸
خرم خرام صدیقی	خرم خرام صدیقی	۱۰۹
معید رشیدی	معید رشیدی	۱۱۰

ناصر نظامی	محمد ارباب بزمی	۱۱۱
سالم سلیم	سالم سلیم	۱۱۲
شریف احمد قریشی	رفیق شاہین	۱۱۳
سلیم محی الدین	سلیم محی الدین	۱۱۴
حیدر قریشی	حیدر قریشی	۱۱۵

عبداللہ جاوید کی پانچ غزلیں ۱۱۶

رشید قیصرانی کی آٹھ غزلیں ۱۱۸

سہیل اختر کی نو غزلیں ۱۲۲

ساجد حمید کی چھ غزلیں ۱۲۷

عطاء اللہ کی چار غزلیں ۱۳۰

ڈاکٹر ریاض اکبر کی چھ غزلیں ۱۳۲

افسانے

گرین ہاؤس	جوگندر پال	۱۳۵
ایفل ٹاور	عبداللہ جاوید	۱۵۲
جانی پہچانی کہانی	سلطان جمیل نسیم	۱۵۸
عورت	شہناز خانم عابدی	۱۷۱
خوشبو کا سفر	ڈاکٹر بلند اقبال	۱۷۸
ملاپ	ڈاکٹر بلند اقبال	۱۸۰
بندوبست	اقبال حسن آزاد	۱۸۲
آگ	طالب کاشمیری	۱۸۸
بھوک اپنی اپنی	مسعود علی تماپوری	۱۹۵

نظمیں

مگر کوئی گروہِ منکراں تو ہے	ایوب خاور	۱۹۷
سرکاری ونیم سرکاری اعلامیہ	ایوب خاور	۱۹۹
نظم بہت آسان تھی پہلے	ندا فاضلی	۲۰۱
صدیوں کا سفر	رشید قیصرانی	۲۰۲
حرفِ عجز	رشید قیصرانی	۲۰۳
خوشبو کا سفر	اسلم انصاری	۲۰۳
ہم اتنا کچھ کھوئے ہوئے	کاوش عباسی	۲۰۴

عنوان	مصنف	صفحہ
بیس برس پہلے	کاوش عباسی	۲۰۴
شکریہ	احمد حسین مجاہد	۲۰۵
زندگی بھر کا مسافر	احمد حسین مجاہد	۲۰۵
نہ جانے کیوں	پروین شیر	۲۰۶
نسیان/ادھورا عنصر	پروین شیر	۲۰۷
مِرے بچوں کی خواہش ہے	افضل چوہان	۲۰۸
سن باتھ	قاضی اعجاز محور	۲۰۹
تنہا تما پوری کی سولہ نظمیں		۲۰۹
فرحت نواز کی گیارہ نظمیں		۲۱۸
فہیم شناس کاظمی کی چھ نظمیں		۲۲۴
خرم خرام صدیقی کی پانچ نظمیں		۲۲۶
خصوصی مطالعہ		
انشائیہ: سفر کی تھکن	محمد زبیر ٹیپو	۲۲۹
انشائیہ: ہمسائیہ	محمد زبیر ٹیپو	۲۳۱
زندگی در زندگی (کھٹی میٹھی یادیں)	حیدر قریشی	۲۳۳
ایک گوشہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے لیے		
سوانحی و ادبی خاکہ		۲۴۸
تحقیق و ادب کی بے لوث ادیبہ	محمد احمد سبزواری	۲۵۲
ڈاکٹر رضیہ حامد: بھوپال کی ہونہار بیٹی	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	۲۵۸
ڈاکٹر رضیہ حامد: منفرد تنقید نگار خاتون	ڈاکٹر بشیر بدر	۲۶۳
ڈاکٹر رضیہ حامد	سلطانہ مہر	۲۶۵
ادب اور صحافت کی جاوداں نقیب	رشید انجم	۲۷۰
لمحوں کا سفر۔۔ایک نظر میں	پروفیسر اظہار الحسن	۲۷۵
نقوشِ بھوپال	ڈاکٹر خلیق انجم	۲۷۹
نگارشات: آسماں تری رفعتوں پہ ناز کرے	ڈاکٹر رضیہ حامد	۲۸۱
افسانہ: وراثت	ڈاکٹر رضیہ حامد	۲۸۷
افسانہ: زندگی کے ہزار رنگ	ڈاکٹر رضیہ حامد	۲۸۹
افسانہ: سہارا	ڈاکٹر رضیہ حامد	۲۹۳

ماہیے

عنوان	صفحہ
امین خیال کے ماہیے	۲۹۹
نذیر فتح پوری کے ماہیے	۳۰۱
افضل چوہان کے ماہیے	۳۰۲
عبدالوحید بسمل۔۔۔ریاض اکبر	۳۰۵
ریاض اکبر۔۔۔۔۔۔حفیظ انجم	۳۰۶
سہیل اختر کے پانچ ماہیا گیت	۳۰۷
ماہیا گیت: رفیق شاہین	۳۰۸
احسن امام احسن کے ماہیے	۳۰۹
خالد جاوید کے ماہیے	۳۱۰
غیاث انجم کے ماہیے	۳۱۱
ریحانہ احمد کے ماہیے	۳۱۱

کتاب گھر۔۔۔

کتاب میلہ: میرے منتخب افسانے (ستیہ پال آنند)، بہت کچھ کھو گیا ہے (ایوب خاور)، میرے ڈرامے لندن میں (شمس الدین آغا)، داستاں در داستاں (حمیدہ معین رضوی)، فرنٹ سیٹ (منور عثمانی)، سرحدِ لفظ نہیں (مقیم اثر بیالوی)، تاثر اور تنقید (عبدالرب استاد)۔ ۳۱۴

تفصیلی مطالعہ

عنوان	مصنف	صفحہ
فرحت پروین کے افسانے	منشا یاد	۳۲۰
نہال دل پر سحاب جیسے	ڈاکٹر انور سدید	۳۲۳
غزلیں	عبدالرب استاد	۳۲۷
کتابِ دل و دنیا	حیدر قریشی	۳۳۱
حامد اشرف کی تنقید نگاری	حیدر قریشی	۳۳۴

خطوط، ای میلز، تاثرات: ۳۳۶

ڈاکٹر یوسف خشک، ارشد خالد، رؤف خیر، منیزہ جمال، فوزیہ مغل، افضل چوہان، صادقہ نواب سحر، جگدیش پرکاش، کرامت علی کرامت، اقبال حسن آزاد، عزیز الرحمٰن سلفی، رخشندہ روحی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

گفتگو!

شمارہ:۱۵میں ڈاکٹر وزیر آغا کی دوطویل نظموں کے حوالے سے ان کے بارے میں گوشہ شائع کیا گیا تھا۔ اندازہ نہیں تھا کہ شمارہ:۱۶ کی اشاعت تک وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔۷اور۸رستمبر۲۰۱۰ء کی درمیانی شب(۲۷رمضان المبارک کو)ڈاکٹر وزیر آغا خالقِ حقیقی سے جا ملے۔**انا لله و انا اليه راجعون!**

ان کے علمی وادبی کارہائے نمایاں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جائے گا اور لکھا جاتا رہے گا۔فی الوقت مقتدرہ کے رسالہ''اخبارِ اردو''اسلام آباد نے شمارہ اکتوبر۲۰۱۰ء میں عمدہ تعزیتی گوشہ شائع کیا ہے۔میانوالی کے ایک رسالہ نے پورا نمبر چھاپنے کا اعلان کیا ہے۔عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد نے تھوڑے وقفہ کے بعد نمبر چھاپنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔دیگر کئی رسائل بھی اس حوالے سے اپنے اپنے حصے کا کام کریں گے۔جدید ادب کے اس شمارہ میں تعزیتی گوشہ دیا جا رہا ہے۔

ادارہ جدید ادب ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر ان کے صاحبزادے سلیم آغا قزلباش،ان کی صاحبزادی وقار النساء اور دیگر پسماندگان،خاص طور پر مرتضٰی حسن کے ساتھ دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔آمین

گزشتہ شمارہ میں جدید ادب کی صورتحال کا ذکر کیا تھا،اس پر پاکستان سے تین دوستوں نے اور انڈیا سے پانچ دوستوں نے خاطر خواہ تعاون کیا ہے۔میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔مزید چند دوستوں نے تعاون کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔اگر اس حد تک تعاون بھی چلتا رہا تو میری زندگی تک جدید ادب نکلتا رہے گا،انشاءاللہ۔مغربی دنیا سے تعاون کرنے والے دوست اس بار کچھ سست پڑ گئے ہیں۔صرف کینیڈا سے ایک دوست نے حسبِ معمول تعاون کیا ہے۔باقی احباب شاید اپنے اپنے مسائل میں گھرے ہیں۔

جدید ادب کے حوالے سے ایک خوشکن خبر یہ ہے کہ ایک طالبہ شازیہ حمیرا نے ایم اے کے مقالہ کے طور پر''جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث''کا موضوع الاٹ کرایا تھا۔نہ صرف یہ کہ مقالہ مکمل ہو گیا ہے بلکہ اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے۔یہ اچھی خبر جدید ادب کے بہی خواہوں کے لیے خوشی کا موجب بنے گی۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

حیدر قریشی

فاذکرونی اذکروکم

(تو تم یاد رکھو مجھ کو، میں یاد رکھوں گا تم کو)

کچھ شعر مکہ مکرمہ کے لیے

افتخار عارف (اسلام آباد)

منزلِ ذکر میں ہر شہر پہ چھائے ہوئے شہر
کیا ثنا ہو تری قرآن میں آئے ہوئے شہر

میرے آقاؤں کے مسکن،مِرے اللہ کے گھر
میرے نبیوں کی دعاؤں میں بسائے ہوئے شہر

زمزم و کوثر و تسنیم، تسلسل تیرا
چشمۂ خیر کا فیضان اُٹھائے ہوئے شہر

رُخِ سرکارؐ دو عالم کے پلٹنے کی تھی دیر
قبلہ رُو ہو گئے سب راہ پہ آئے ہوئے شہر

ایک بوسے کی اجازت حجرِ اسود پر
اے مِرے نور کی بارش میں نہائے ہوئے شہر

خاک ہم رتبۂ افلاک ہوئی جن کے سبب
اُن کی آواز سے آواز ملائے ہوئے شہر

دعائیہ

افتخار عارف

مِرا شرف کہ تو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں،زکوٰۃ اعتبار دے

میں جیسے تیسے ٹوٹے پھوٹے لفظ گھڑ کے آ گیا
کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے،سنوار دے

مِرے امین آنسوؤں کی نذر ہے قبول کر
مِرے کریم اور کیا ترا گناہ گار دے

نگاہ داریٔ بہارِ آرزو کے واسطے!
ہمارے نخلِ جاں کو بھی کوئی نگاہدار دے

ترے کرم کی بارشوں سے سارے باغ کھل اُٹھیں
ہوائے مہر نفرتوں کا سارا زہر مار دے

قیامتیں گزر رہی ہیں کوئی شہسوار بھیج
وہ شہسوار جو لہو میں روشنی اتار دے

وہ آفتاب بھیج جس کی تابشیں اند تلک
میں داد خواہِ اجر ہوں جزائے انتظار دے

ترا اِسم ہے مری زندگی

حمدیہ

ڈاکٹر اسلم انصاری (ملتان)

میں رہینِ موج و کنار تھا
تری آرزو نے گھر کیا
میں سکوتِ شاخِ خیال تھا
مجھے حرف حرف ثمر کیا
مری نارسائی کے درد کو
ہمہ تن متاعِ ہنر کیا
مرے ساز و برگِ شعور کو
غمِ احترام بشر کیا
میں نوائے شامِ فراق تھا
مجھے بہرہ یابِ اثر کیا
میں سرودِ حرفِ وداع تھا
مجھے وصلِ نقش و نظر کیا
مرا ظرف تھا مری تشنگی
مجھے اپنی یاد سے بھر دیا

میں نہاں تھا خوابِ نمود میں
مجھے اعتبارِ سحر دیا
میں رواں تھا دشتِ سراب میں
مجھے مدعائے سفر دیا
میں خزاں میں شوقِ بہار تھا
مجھے منظرِ گُلِ تر دیا
میں سوادِ شہرِ غبار تھا
مجھے حُسنِ کوچہ و در دیا
ترا اسم ہے مری زندگی
مجھے اذن دے کہ رقم کروں
جو ہے شاخ شاخ میں منتشر
اسے برگ برگ بہم کروں
جو صدف صدف میں ہے مضطرب
اُسے صرفِ لوح و قلم کروں
دل و جاں کے سارے خروش کو
کسی حرفِ شوق میں ضم کروں
ترا اسم ہے مری زندگی
مجھے اذن دے کہ رقم کروں

نعتیہ

افتخار عارف

اپنے آقاؐ کے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
دل الجھتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اب یہ دنیا جسے چاہے اُسے دیکھے سرِ سیل
ہم تو بس ایک سفینے کی طرف دیکھتے ہیں

عہدِ آسودگیٔ جاں ہو کہ دورِ ادبار
اُسی رحمت کے کزینے کی طرف دیکھتے ہیں

وہ جو پل بھر میں سرِ عرش، بریں کھلتا ہے
بس اُسی نور کے زینے کی طرف دیکھتے ہیں

بہرِ تصدیقِ سند نامۂ نسبت، عشاق
مہر خاتم کے نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھے ہیں وہ آشفتہ مزاج
جو حرم سے بھی مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

دعائیہ

افتخار عارف

بطرزِ مختلف اک نعت لکھنا چاہتا ہوں
میں ساری نعتیں اک ساتھ لکھنا چاہتا ہوں

مِرا معبود خود توفیق ارزانی کرے گا
میں وصفِ سرّ موجودات لکھنا چاہتا ہوں

حضورؐ اور محترم وابستگانِ شہرِ حکمت
میں اس بستی کے سب حالات لکھنا چاہتا ہوں

بہت برہم، بہت ہی منتشر اوراقِ جاں پر
جہاں تک سانس ہے اثبات لکھنا چاہتا ہوں

دل و دنیا مجھے آواز دیتے ہیں بیک وقت
میں جب بھی صورتِ حالات لکھنا چاہتا ہوں

نہ تسخیرِ طلسم و اسم ہے موضوع میرا
نہ تفسیرِ صفات و ذات لکھنا چاہتا ہوں

نہ استدراک کی معیار بندی میرا منصب
نہ میں ترتیبِ استنباط لکھنا چاہتا ہوں

حضورِ سیّد و سردارؐ جو توقیر پاجائیں
وہی حرفِ شرف دن رات لکھنا چاہتا ہوں

اے شبستانِ حرا !

(نعتیہ)

اسلم انصاری

اے شبستانِ حرا،
اے دلِ سنگ میں ٹھہرے ہوئے اک نقشِ جمیل
اے کہستانِ جمادات میں جاگی ہوئی تقدیر کی لو
اے نہاں خانۂ ہستی کے خزینوں کی ضیا
اے دلِ آدم و عالم کی دعا

اے شبستانِ حرا !
صبحِ آفاق نے مانگی تھی ترے ذروں کی نادیدہ کرن
تُو نے سیکھا تھا ازل سے درِ امکاں کی طرح وا رہنا
کہکشائیں تری دہلیز سے گذری ہیں زمانوں کی طرح
اور ___ زمانے، جو مہ و سال ہیں ___
سانس روکے ہوئے
اور سر کو جھکائے ہوئے، آتے ہیں یہاں
فیض روانی کے لیے
سب عبارات و اشارات ہیں خاموش یہاں
حسنِ معانی کے لیے!

اے شبستانِ حرا!
اے لبِ ہستی کی دعا
اے دلِ آدم و عالم کی تمنا کی مثیل
اے گذرتی ہوئی آنات میں اک قائم دائم کی دلیل
تو وہ خوش بخت کہ اُس مہرِ جہاں تابؐ نے بخشا تجھے
جلوؤں کا ہجوم
حُسنِ انفاس کا تنزیہہ و تعطر تری محراب کو فردوس نما کرتا
تھا
تیرے دامن میں ہوا صبحِ رسالت کا طلوع ___
اے دلِ آدم و عالم کی دُعا
اے شبستانِ حرا !
اے شبستانِ حرا !

حمد باری تعالیٰ

رفیق شاکر (اکولہ)

آسماں چاند ستاروں سے سجایا تونے
تودۂ خاک بھی گلزار بنایا تونے
علم وہ حضرتِ آدم کو سکھایا تونے
سجدۂ عجز ملائک سے کرایا تونے
کشتیٔ نوح کو طوفاں میں ترایا تونے
نارِ نمرود کو گلزار بنایا تونے
آگ میں،خاک میں،پانی میں ،ہوا میں ،ہر سو
اپنی خلقت کو جہاں چاہا بسایا تو نے
نسلِ یعقوب کو دیتی تھی فضیلت جس دَم
جبلِ طُور پہ موسیٰ کو بلایا تونے
چاہِ کنعان سے،زنداں سے چھڑا کر آخر
مصر کے تخت پہ یوسف کو بٹھایا تو نے
ساری مخلوق میں افضل ہیں،بتانے کے لیے
مِرے آقا کو سرِ عرش بلایا تونے
اے خدا! ہم کو بچا وقت کے فرعونوں سے
جیسے فرعون سے موسیٰ کو بچایا تونے
خلد میں حضرتِ آدم سے ملانا ہم کو
جیسے یعقوب سے یوسف کو ملایا تونے
کلمۂ حق پہ ہی شاکر کو اُٹھانا یارب
جیسے عشاقِ محمدؐ کو اُٹھایا تونے

نعت رسولؐ

غلام مرتضیٰ راہی (فتح پور،یوپی)

ہزار دل ،ہزار جان سے ہمیں قبول وہ
وہ اوّلینِ کائنات،آخری رسولؐ وہ

نباہ قول و فعل کا تمام اس کی ذات پر
وہ ضابطہ بہ ضابطہ،اُصول در اصول وہ

بلند قامتی میں وہ پرے مِری نگاہ سے
زمیں پر آسمان کا وسیلۂ نزول وہ

نفاذِ کفر ہر طرف، وُرودِ جہل چار سُو
بَلا کے خار زار میں کھلا تھا بن کے پھول وہ

مِری خوشی بھی کیا اگر نہ رو پڑوں یہ سوچ کر
مِری خوشی کے واسطے رہا سدا ملول وہ

طبق سب آسمان کے،پرت اک اک زمین کی
لے آیا اختتام تک سفر کو دے کے طول وہ

نعت نبیؐ جی

حفیظ انجم (کریم نگر)

راہوں سے ہٹا دیجیے سب کار نبیؐ جی
عالَم کو بنا دیجیے گلزار نبیؐ جی
خوابوں میں چلے آیئے اک بار نبیؐ جی
اس طرح کبھی کیجیے گفتار نبیؐ جی
دنیا میں برائی کے ہیں انبار نبیؐ جی
کشتی کو لگا دیجیے اب پار نبیؐ جی
فرقت میں ہے جینا مِرا دشوار نبیؐ جی
اک بار تو دیدار ہو دیدار نبیؐ جی
دنیا بھی گئی دین گیا ہاتھ سے اس کے
جس نے بھی کیا کلمہ سے انکار نبیؐ جی
اللہ کا فرمان ہے قرآن یقیناً
امّت کے لیے لائے ہیں اُپہار نبیؐ جی
کس طرح کہوں آپؐ سے دنیا کے جھمیلے
کس طرح کروں آپؐ سے اظہار نبیؐ جی
مولا کے دُلارے ہیں وہ ہیں سب کے مسیحا
ہے آپؐ کا ہر کوئی طلب گار نبیؐ جی
انجم کے طبیب آپؐ ہیں،صحت سے نوازیں
یہ آپؐ کا بیمار ہے بیمار نبیؐ جی

نعتیہ

محمدؐ کے دوانوں کا کفن میلا نہیں ہوتا

حفیظ انجم

اگر میں من کی آنکھوں سے اُنھیںؐ دیکھا نہیں ہوتا
خدا کو اور خداوندی کو پہچانا نہیں ہوتا
یہاں پر لذتِ قربِ حقیقی چاہیے ورنہ
یہی تو ''لا'' کا پردہ ہے،یہ پردہ وا نہیں ہوتا
خوشا اب چل پڑو گھر سے یہ فرمانِ محمدؐ ہے
خدا کی راہ میں نکلو،کوئی خطرہ نہیں ہوتا
جسے قربِ الٰہی ہے میسّر کملیؐ والے ہیں
وہ بندہ حشر کے میدان میں رُسوا نہیں ہوتا
حقیقت ہے،حقیقت ہے،حقیقت ہے،حقیقت ہے
''محمدؐ کے دوانوں کا کفن میلا نہیں ہوتا''
تمہارے صحن کا آقاؐ میں اک ادنیٰ کبوتر ہوں
وگرنہ نور کی بارش میں یوں بھیگا نہیں ہوتا
قلندر ہوں،تونگر تو نہیں ہوں ،آپؐ جانت ہیں
مِرے ظاہر،مِرے باطن میں اندھیارا نہیں ہوتا
نرا مورکھ ہوں میں نعتِ محمدؐ کس طرح لکھوں
کسی اک شعر میں مفہوم تک پورا نہیں ہوتا
خدا اک نور ہے،احمدؐ خدا کا نور ہیں انجم
محمدؐ کے خدا کے درمیاں پردہ نہیں ہوتا

عامر سہیل (ایبٹ آباد)

شیخ الاکبر محی الدین ابنِ عربی

ایک تعارفی مطالعہ

ابنِ عربی کا پورا نام ابوبکر محمد بن العربی الحاتمی الطائی ہے۔ اکثر مآخذ میں اُن کی کنیت ابوبکر اور کچھ تذکرہ نگاروں نے عبداللہ درج کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اپنے عہد میں اِن دونوں حوالوں سے معروف ہوں۔ آپ مشرق میں ابنِ افلاطون اور ابنِ سُراقہ کی کنیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ابنِ عربی اپنے عقیدت مندوں اور مقلدوں میں ''شیخِ اکبر'' کے خطاب سے خاص شہرت رکھتے ہیں، لقب ''محی الدین'' ہے۔ آپ ۱۷/ رمضان ۵۶۰ھ، بمطابق ۱۷/ اگست ۱۱۶۵ء کو جنوبی سپین کے شہر مُرسیہ میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا تعلق بنو طے سے ہے۔ اسلام کی فکری روایت میں ابن عربی اپنے مخصوص نظریہ تصوّف، فلسفہ اور کشف کے باعث ایک جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کو محض صوفی یا فلسفی کہنا درست نہیں، کیوں کہ ان کی فکر کا دائرہ اہم سماجی اور اسلامی علوم مثلاً قرآن کی تفسیر، علمِ حدیث، اصولِ فقہ، الٰہیات، فلسفہ، تصوّف، صرف ونحو، سیرت، وقائع نگاری، نفسیات، صوفیانہ شاعری، مابعدالطبیعیات اور فلسفہ زمان ومکان کے پیچیدہ مسائل تک پھیلا ہوا ہے۔

ابن عربی کا علمی مقام ومرتبہ کتنا بلند ہے اس کی ایک ادنیٰ جھلک محمد سہیل عمر کے بیان میں دیکھی جا سکتی ہے:

'' ہماری عرفانی روایت ایک نظامِ شمسی ہے جس کا مدار شیخ اکبر محی الدّین ابن عربی ہیں۔ ان کے ہاں بیان ہونے والا تصورِ حقیقت اپنی تمام تفصیلات اور اطلاقات سمیت، ہمارا کُل ورثہ ہے۔ ہم مابعدالطبیعی حقائق کا جتنا بھی علم اور تجربہ رکھتے ہیں، وہ سارے کا سارا انہی کا فراہم کردہ ہے۔ شیخ اکبر کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے حقائق کے جو علمی اور احوالی مراتب دریافت کیے، اُن سے ایک پوری عرفانی کائنات کی تشکیل ہوئی۔ حقائق کے حصول وحضور کی پوری درجہ بندی کر کے حقیقت کبریٰ کے حتمی اعتبار اور قطعی محل کی

تعیین، ابنِ عربی کا وہ کارنامہ ہے جس کی بدولت ہمارے عرفانی اصول اور قواعد کا قیام عمل میں آیا۔'' [۱]

ایران کے معروف عالم اور محقق سیّد حسین نصر اپنی بصیرت افروز تصنیف Three Muslim Sages ''(تین مسلمان فیلسوف اُردو مترجم محمد منور) میں ابن عربی کی قدر و قیمت کا ذکر ہوئے کہتے ہیں:

''ابن عربی کے ظہور میں آنے کے ساتھ مابعدالطبیعیات وکونیات کے لحاظ سے بھی اور نفسیات و انسانیات کی رو سے بھی تصوف کے بارے میں ہمارا واسطہ اچانک ایک ایسے وسیع الحدود اور کامل نظریے سے پڑتا ہے، جہاں بادی النظر میں تصوّف کی روایت ٹوٹتی ہوئی یا خود تصوّف کے اندر ہی ایک نیا موڑ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔'' [۲]

تاریخ فلسفہ اسلامی کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ امام غزالی، الکندی، ابن رشد، ابن سینا، ملا صدرا، اور ابن خلدون وغیرہم نے مخصوص علوم پر الگ الگ اصناف میں لکھا اور نام پیدا کیا۔ ابن عربی کا اسلوب اپنے متقدمین، متاخرین اور معاصرین سے یکسر منفرد رہا۔ وہ کثیر الاجزا علوم کو باہم مربوط کر کے نتائج اخذ کرنے کی طرف مائل تھے۔ ان کا نظامِ فکر کثرت میں وحدت کا نظارہ کرنے پر قادر ہے۔ اُن کے ہاں فکر کے تمام سرچشمے، کائنات کی سچائیوں کو سمیٹ کر ایک ایسا کُل (whole) تشکیل دیتے ہیں جہاں صداقت نُور کی صورت مجسم ہو کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ شیخ اکبر کی فکر کا نقطہء ماسکہ فلسفہ وحدت الوجود ہے، وحدت کا یہ عرفانی تصوّر اُن کی فکر کا ایک ایسا مستحکم عنصر ہے جو علوم وفنون کی درجہ بندی اور نتائج کی ترتیب کے دوران پوری طرح فعال نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں گہری بصیرت اور رمزیت کا جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ علائم ورموز کی پیچیدگی اور ابلاغ کی تمام تر مشکلات کے باوجود مشرق ومغرب میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا چرچا عام ہے۔

ابن عربی سے کئی سو کتابیں منسوب چلی آرہی ہیں، جن میں سے بیشتر غیر مطبوعہ اور مخطوطات کی شکل میں عظیم کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ویسے ان کی عمومی شہرت کا مدار صرف دو کتابوں '' **فصوص الحکم**'' اور ''**فتوحاتِ مکیّہ**'' پر ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں مغرب نے ابن عربی کی طرف خاص توجہ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی اور جرمن جیسی اعلیٰ ترقی یافتہ زبانوں میں نہ صرف شیخ اکبر کی عربی کتابوں کے تراجم ہوئے بلکہ تشریحی وتوضیحی اور سوانحی کتب کا معقول ذخیرہ منظرِ عام پر آیا۔ برطانیہ کے ایک اشاعتی ادارے ''عنقاء'' (Anqa) نے حال ہی میں ابن عربی پر آٹھ انگریزی کتب شائع کر کے شیخ اکبر سے اپنی بے پناہ محبت و عقیدت کی روشن مثال قائم کر دی ہے۔

پاکستان میں بھی کام کی رفتار خاصی حوصلہ افزا ہے، **فصوص الحکم** کا پہلا اردو ترجمہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں عبدالغفور دوستی کی ذاتی کاوش سے سامنے آیا، یہ لفظی ترجمہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکا، بعد ازاں محمد برکت اللہ لکھنوی فرنگی محلی نے ۱۹۰۱ء میں اسی لفظی ترجمے کو بامحاورہ اردو میں منتقل کر کے مطبع مجتبائی لکھنو سے شائع کرا

دیا۔اس کا دوسرا عکسی اڈیشن،تصوف فاؤنڈیشن، لاہور نے ۱۹۹۹ء میں چھاپ کر بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے،''فتوحات مکیہ'' کا پہلا اردو ترجمہ بھی اسی فاؤنڈیشن کا شائع کردہ ہے،ایک تحقیقی اندازے کے مطابق ابن عربی کی یہ ضخیم تصنیف پندرہ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔''فصوص الحکم'' کا ایک اور مستند اردو ترجمہ مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی (نذیر پبلشرز، لاہور،طبع اول ۱۹۹۲) کا ہے۔جو معیاری ترجمہ کی عمدہ مثال ہے۔

'' **ابن عربی فاؤنڈیشن پاکستان**'' کا قیام اگرچہ ۲۰۰۷ء میں عمل پذیر ہوا،لیکن اتنی کم مدّت کے باوجود سن ۲۰۱۰ء تک یعنی صرف تین قلیل برسوں میں ابن عربی پر سولہ (۱۶) کتب و رسائل اردو میں طبع کر چکے ہیں اور مزید اہم کام اشاعت کے مختلف مراحل سے گذر رہا ہے۔

ابن عربی نے زندگی کے ابتدائی ایّام مُرسیہ میں گذارے پھر اشبیلہ روانہ ہو گئے۔اس دوران دو بزرگ درویش خواتین،مُرسیہ کی یاسمین اور قُرطبہ کی فاطمہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا،جس کے باعث اُن کی زندگی پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔فاطمہ ایک کہن سال خاتون تھی اور دو سال تک بطور روحانی والدہ،ان کے مرشدِ روحانی کا فریضہ انجام دیتی رہیں۔شیخ اکبر تقریباً بیس برس کی عمر تک اُندلس کے شہروں میں گھومتے پھرتے رہے، نیز درویش عورتوں اور مردوں کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔فکر ونظر کے اس سفر میں ان کی ملاقات ارسطو کے شارح و مترجم اور یکتائے روزگار فلسفی **ابن رشد** کے ساتھ ہوئی، **فتوحات مکیہ** میں ملاقات کا تفصیلی حال درج ہے۔یہ ملاقات اس وقت ہوئی جب ابن رشد فکر کی معراج پر فائز تھا اور ابن عربی عالم روحانی اور مشاہدہ و تجلیات کی منازل طے کر رہے تھے۔ابن رشد سے دوسری ملاقات روحانی اسباب کے تحت ہوئی، جو محض یک طرفہ تھی کیونکہ ابن عربی ان کو دیکھ سکتے تھے،لیکن وہ اِن کی موجودگی کو محسوس نہ کر سکے،وجہ اس کی یہ بتائی گئی کہ دونوں کے درمیان روشنی کا ایک پردہ حائل تھا۔تاہم ابن عربی نے ان دونوں ملاقاتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

''اُس کا تفکر و تامل اُسے وہاں نہیں لے جا سکتا جہاں میں ہوں۔''

سیّد حسین نصر اُس دور کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے کہتے ہیں :

''۵۹۵ھ (۱۱۹۸ء) تک ابن عربی اندلس اور شمالی افریقہ کے مختلف شہروں میں زندگی کے دن گزارتے رہے۔صوفیا و علماء سے ملاقاتیں کیں۔کبھی کبھی معتزلہ جیسے مختلف الخیال لوگوں سے بحث و مناظرہ کیا جو اسلام کی عقلی و استدلالی تعبیریں کرتے تھے۔اس دوران میں وہ تیونس تک گھوم پھر آئے، جہاں اُنھوں نے'' خلع النعلین'' کا مطالعہ کیا جو ابن قسیسی کی تصنیف ہے اور اس کے شرح بھی لکھی۔علاوہ ازیں وہ **المریہ** میں بھی گئے، جو ابن مسرہ اور ازاں بعد ابن العارب کے مکتب و مسلک کا مرکزی مقام تھا اور جہاں Asin Palacios کے بقول ابن عربی نے تصوف کی راہ میں پہلا قدم رکھا تھا۔'' [۳]

ابن عربی کا یہ دور ذات صفات کی معرفت اور کشف و الہام کے حوالے سے خاصا اہم ہے۔ان کے روحانی

قویٰ کی استعداد روز بروز ترقی کرتی چلی جا رہی تھی۔علمِ نظری اور وہبی کے دروا ہونے کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ان برسوں میں شیخ کو عرفانی مشاہدات کا تجربہ ہوتا رہا۔سیّد حسین نصر کا بیان ملاحظہ ہو:

''ان سالوں کے دوران شیخ کو عرفانی مشاہدات کا تجربہ ہوتا رہا۔ان کو رجال الغیب کے سلسلۂ مراتب کا ،جو کائنات کے حاکم ہیں، پہلے ہی سے مشاہدہ ہو رہا تھا۔اُن میں سے ایک قطب ہے،دو امام،چار اوتاد ہیں جو بنیادی اطراف کے فرماں روا ہیں۔سات ابدال ہیں،ان میں سے ہر ایک کا اثر ایک اقلیم پر ہے۔بارہ نقباء ہیں جو بارہ بروج پر حکمرانی کرتے ہیں۔آٹھ نجبا ہیں جو آٹھ آسمانی طبقات سے مماثل ہیں۔'' [۴]

شیخ اکبر کی تمام زندگی اس نوع کی روحانی کیفیات و واردات سے لبریز ہے۔مرسیہ میں ایک روحانی کیفیت کے دوران اُن کو زمانہ قبل از مسیح کے روحانی اقطابِ وحی کا مشاہدہ نصیب ہوا،عرشِ الٰہی کی زیارت کا تذکرہ بھی ملتا ہے،جس میں انھوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ عرش کے گرد محوِ پرواز ہے اور عرش کو نوری ستونوں نے اُٹھا رکھا ہے۔

ابن عربی نے ایک روحانی حکم کے تحت مشرق کا رخ کیا۔ ۱۲۰۱ء میں خانہ کعبہ کی زیارت کی،اسی مقام پر **فتوحات مکیہ** کے لکھنے کا آغاز ہوا،دورانِ قیامِ مکہ ایک اصفہانی دوشیزہ سے ملاقات ہوئی جو حد درجہ حسین، پارسا اور تصوف کی طرف طبعی رجحان رکھتی تھی۔ابن عربی کی زندگی پر اس خاتون کے وہی اثرات مرتّب ہوئے جو دانتے کی زندگی پر Beatrice کے تھے۔

مکہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد آپ ترکی روانہ ہو گئے، جہاں بمقام قونیہ ان کی ملاقات صدرالدین قونوی سے ہوئی، جو بعد ازاں سرزمین مشرق میں شیخ اکبر کی تصانیف کے سب سے اہم مبلغ اور شارح کے طور پر شہرت حاصل کرنے میں سب سے آگے نکل گئے۔ابن عربی کثیر التصانیف مصنف ہونے کے ناطے محققین کے لیے بڑے کشش رکھتے ہیں، کیونکہ تا حال ان کی تصانیف کی حتمی تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکا، ہر محقق کا بیان دوسرے سے مختلف ہے۔ماجد فخری ''تاریخ مسلم فلسفہ'' میں لکھتے ہیں:

''جدید تحقیق کے مطابق،ابن عربی سے آٹھ سو چھیالیس (۸۴۶) کتابیں منسوب کی جاتی ہیں،جن میں سے پانچ سو پچاس (۵۵۰) تک ہماری رسائی ممکن ہے،لیکن ان میں سے صرف چار سو (۴۰۰) رسائل و کتب کو ٹھیک تصور کیا جا سکتا ہے'' [۵]

ابن عربی کے ایک اور بڑے محقق و شارح اے۔ای۔عفیفی کا کہنا ہے:

''ابن عربی مسلم تاریخ کے زود نویس مصنف ہیں، بروکلمان نے شیخ اکبر کی اس خوبی کے لئے "colossal fecundity" (عظیم الشان زرخیزی) کے الفاظ استعمال کیے ہیں ان کی طویل اور مختصر تحریروں کی تعداد ۱۴۰ بنتی ہے۔تاہم حتمی تعداد کا تعین محال ہے۔عبدالوہاب شیرانی کے بقول یہ تعداد ۴۰۰ ہے۔محمد رجب حلیمی کے نزدیک ۲۸۴ ہے۔ابن عربی نے اپنی کتاب'' Memorandum ''(اس کتاب کا عربی نام دستیاب نہیں ہو سکا) میں ۲۵۱

کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ''سرِ دست یہی یاد ہیں باقی کا حال معلوم نہیں'' چونکہ مصر میں ابن عربی کے دشمن بہت ہیں جنھوں نے ذاتی اور فکری عناد کی بنیاد پر کافی من گھڑت ذخیرہ ان کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔(آزاد ترجمہ)'' ۶

اس نزاعی بحث کے بعد عفیفی کی رائے کچھ اس طرح سامنے آتی ہے :

" To establish the identity and authenticity of all the works that have been ascribed to him is a task which has not been undertaking by any scholar yet .But we know within limits the genuineness of most of his major works,although doubt might arise with regard to certain parts of their contents." (7)

محولہ بالا مسائل کی تمام تر ذمہ داری مخطوطات کی کثرت اور تراجم کے عدم معیار پر عائد ہوسکتی ہے، ایک عام قاری ذرا توجّہ سے مطالعہ کرے تو بڑی حد تک ان سب لغزشوں سے بچا جا سکتا ہے، البتہ اس تمام بکھرے مواد میں شیخِ اکبر کے ذاتی حالات اور حسب ونسب پر کافی تفصیلی روشنی پڑتی ہے اور نئے حقائق کا انکشاف بھی ہوتا ہے، مثلاً اُن کے اپنے بیان سے پتا چلتا ہے کہ وہ عربوں کے قدیم قبیلے ''طے'' سے تعلق رکھتے تھے۔اس بیان کی روشنی میں اے۔ای۔ عفیفی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ''اسلامی تصوف صرف ایرانیوں ہی کا مرہونِ منت نہیں بلکہ عربوں کی میراث بھی اس میں شامل ہے۔'' عفیفی کی یہ بات دل کو لگتی ہے، خود ابن عربی کے والدِ گرامی اور دو ماموں (ابومسلم الخولانی، یحییٰ بن یغمان) اپنے عہد کے مشہور صوفیا ہوگزرے ہیں، تصوف کا سلسلہ آپ کے خاندان میں موجود تھا، حتیٰ کہ آپ کے چچا ابومحمد عبداللہ بن محمد بن العربی کو اپنی وفات سے تین برس قبل ولایت نصیب ہوگئی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عربوں میں تصوف کی روایت بڑی مستحکم رہی ہے۔(اس ضمن میں مزید معلومات کی خاطر امام ابوالقاسم بن ہوازن قشیری اور ابونصر سراج طوسی کا مطالعہ سود مند ہوسکتا ہے۔)

ابن عربی کی مختلف تحریروں خصوصاً **فتوحات مکیہ** کے ذریعے ان کے حصول ولایت پر خاصی روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اس چیز کا مشاہدہ اپنے دورِ جاہلیت (۵۸۰ھ) میں کیا تھا (جب وہ بمشکل بیس برس کے تھے)۔**فتوحات مکیہ** کی جلد اول اور دوم کے صفحات اس ضمن میں خاصی تفصیلات مہیا کرتے ہیں، مثلاً، تصوف کی دنیا میں وارد ہونے کی شروعات کچھ ایسے ہوئی کی ایک دن اشبیلیہ کے کسی رئیس نے دعوت پر بلایا، وہاں جب انہوں نے جام ہاتھ میں پکڑا تو اچانک غیب سے یہ آواز آئی ''اے محمد کیا تم کو اس لیے پیدا کیا گیا تھا؟'' اس واقعے نے دل ودماغ کی کایا پلٹ کے رکھ دی، ویرانوں میں گھومنا اور ٹوٹی قبروں میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی کرنا معمولات میں شامل ہوگیا، اپنے شیخ کی نگرانی میں نو ماہ کا چلہ بھی کاٹا۔

ان کے خودنوشت بیانات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اپنی غیر معمولی استعداد کے باعث روحانیت کے مشکل ترین مقامات بہت جلد طے کر لیے تھے۔آپ کے والد گرامی وزیر ریاست تھے اور اُن کا شمار ملک کے باوقار

طبقے میں ہوتا تھا، ابن عربی بھی ابتدا میں کاتب (سیکرٹری) کے عہدے پر فائز رہے جو کہ دیوانِ سلطنت کا اہم عہدہ شمار ہوتا تھا، لیکن روحانی تجربات کے بعد آپ ملازمت سے دستبردار ہو گئے اور فقر اپنا لیا۔آپ کے مرشد شیخ یوسف بن یخلف الکومی نے آپ کی سمت نمائی میں اہم کردار ادا کیا، تاہم ابن عربی نے تصوف کی اصل معراج **یعنی** اسرارِ الٰہیہ کا علم براہِ راست حضرت خضرؑ سے حاصل کیا۔**فتوحات** میں خضرؑ سے ہونے والی ملاقاتوں کا احوال درج ہے، (تاریخ تصوف میں علی بن جامع کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے بھی خرقہ ولایت حضرت خضرؑ سے حاصل کیا تھا) **فتوحات** میں حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ اور نبی اکرمؐ کی رہنمائی کا ذکر بھی شامل ہے۔ابن عربی کی فرانسیسی سوانح نگار کلاڈ ایڈس (Claude Addas) نے اپنی کتاب ''Quest for the Red Sulphur'' میں **فتوحات** کی یہ عبارت نقل کی ہے

"My return to the Way was accomplished through a vision under the guidence of Jesus,Moses and Muhammad.Elsewhere he writes,without giving any further details:It was as a consequence of this vision that I returned to God." (8)

ابن عربی نے حصولِ علم کی خاطر دور دراز کے سفر کیے، بے شمار علاقوں میں درس وتدریس کا سلسلہ قائم کیا، شمالی افریقہ کی طرف ان کا رجحان بہت زیادہ تھا کیونکہ یہاں آپ کو ایسے صوفیا کی صحبت میسر آئی جو آپ کی روحانی ترقی میں کلیدی حثیت رکھتے تھے۔اندلس کے ساتھ آپ کا رابطہ بحال رہا کیونکہ آپ کے والدین، دو غیر شادی شدہ بہنیں اور قریبی عزیز واقارب وہاں مستقل رہائش پذیر تھے۔آپ کی زوجہ مریم بنتِ محمد بن عبدون بذاتِ خود متّقی اور پارسا خاتون تھی، روحانیت کے کئی مدارج ابن عربی کی ہمراہی میں طے کیے، اُن کا قیام بھی اندلس ہی میں تھا۔

ابن عربی جب **فاس** میں تھے تو ایک کشف کے ذریعے اُن کو روحانی درجہ دکھایا گیا، یہ واقعہ مسجد الازہر میں رونما ہوا جہاں آپ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، اسی مسجد میں امام عبدالکریم کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا، اور اپنے وقت کے قطب سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ اہم واقعہ ۱۱۹۶ء میں فاس ہی کے مقام پر پیش آیا، اور اسی جگہ آپ کو خاتم الاولیاء کی حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا۔

والد کی وفات نے آپ کو دوبارہ اندلس جانے پر مجبور کر دیا، یہاں جائیداد وغیرہ کے تمام ضروری کام نمٹانے کے بعد اپنا باقی ماندہ خاندان سمیٹ کر پھر **فاس** روانہ ہوگئے، اسی جگہ آپ دونوں بہنوں کی شادی سے بھی سبکدوش ہوئے۔جب والد کی وفات کے سات سال بعد والدہ کا انتقال ہوا تو آپ مختلف علاقوں کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے، یہ ابن عربی کی زندگی کا ثروت مند دور ثابت ہوا، آپ مکہ پہنچے اور یہیں اپنی شہرہ آفاق تصنیف **فتوحات مکیہ** کی بنیاد رکھی۔اس ضخیم کتاب کا زیادہ تر حصہ یہاں مکمل ہوا۔اس کتاب کا پورا نام ''فتوحاتِ مکیہ فی معرفہ الاسرار المالکیہ والملکیہ'' ہے۔

ابن عربی نے ۱۲۰۴ء میں موصل کے سفر میں عبداللہ بن جامی کے ذریعے حضرت خضرؑ سے تیسری ملاقات کی

جس کے باعث آپ روحانی اعتبار طور سے خود مکتفی ہو گئے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد قاہرہ کا رُخ کیا، مگر وہاں کی سرکاری مذہبی جماعتوں نے مصائب پیدا کرنا شروع کر دیے اور آپ کی جان کے درپے ہو گئے، اس نازک وقت میں شیخ ابوالحسن (بگیا) کی بروقت کوشش سے آپ کی جان بچ گئی۔

۱۲۰۷ء میں جب مصر کے لوگوں اچھا سلوک نہیں کیا تو آپ مشرقِ وسطیٰ کے اسفار پر روانہ ہو گئے، ایشیائے کوچک کی سفری مہم کے بعد دمشق کو اپنا آخری ٹھکانہ بنایا اور ۱۷ نومبر ۱۲۴۰ء اسی مقام پر رحلت فرمائی۔ سید حسین نصر کے بقول آپ کو دمشق کی جانب شمال قاسیون کی پہاڑی کے دامن میں بمقام صالحیہ ایک ایسے قطعہ زمین میں دفن کیا گیا جو ان کی تدفین سے پہلے بھی بڑا متبرک تھا، کیونکہ تمام پیغمبروں نے اس جگہ کو تقدیس عطا کی ہے۔ ابن عربی کی جب وہاں تدفین ہوئی تو وہ جگہ پہلے سے بھی عظیم تر زیارت گاہ بن گئی۔ سولہویں صدی میں سلطان سلیم دوم نے ان کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرا دیا جو تا حال سلامت ہے اور صوفیا کے لئے خاص مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ شیخ اکبر کی وفات کے تقریباً نصف صدی بعد ان کی تصانیف مشرقی ممالک میں گردش کرنے لگ گئی تھیں، عبدالوہاب شعرانی جیسے جید عالم نے ابن عربی پر ابتدائی کام کر کے آنے والوں کے لئے راستہ ہموار کیا۔ جرمنی میں تیرھویں صدی عیسوی میں ابن عربی پر سنجیدہ کام شروع ہو گیا تھا، لیکن مغرب کے دیگر علاقوں کو یہ علمی خزانہ بہت بعد میں نظر آنا شروع ہوا، البتہ گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مغرب کے دیدہ ور مستشرقین اور مشرقی علما و حکما ابن عربی کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن کی سحر انگیز شخصیت نیز افکار و نظریات پر تحقیق و تنقید کے بے مثال مطالعات پیش کئے۔ یہاں خاص طور پر، ہنری کاربن (Henry Corbin)، آسین پھلاسی اوس (Asin Palacios)، اے۔ ای عفیفی، (A.E.Afifi)، محمد طاہر، عبدالعزیز سیّد الاہل، کارل بروکلمان، حاجی خلیفہ، ایچ۔ ایس۔ نیبرگ (H.S.Nyberg) آر۔ اے۔ نکلسن، اے۔ جے۔ آربری، ٹوشی ہائیکو (Toshihiko Izutsu)، جعفری کلیمی، سید حسین نصر، کلاڈ اڈیس (Claude Addas)، آر۔ ڈبلیو۔ جے۔ آسٹن، پی۔ کوٹس (P.Coates)، رالف آسٹن (Ralph Austin)، ولیم چیٹک (william chittick)، مچل ہیڈ کیوچ (Michel Chodkiewich)، (Jane Clark) محمد برکت اللہ لکھنوی فرنگی محلی، ماجد فخری، ڈاکٹر محسن جہانگیری، ایس۔ اے۔ کیو۔ حسینی اور محمد سہیل عمر وغیرہم کی مسلسل علمی کاوشوں کا ذکر بے حد ضروری ہے کیونکہ انہی فاضل اصحاب کی بدولت ابن عربی تک عام لوگوں کی رسائی ممکن ہو سکی۔ حال ہی میں ''فصوص الحکم'' کا انگریزی ترجمہ "The Bezels of Wisdom"، آر۔ اے۔ آسٹن کے قلم سے نکلا اور علمی حلقوں میں عام ہو گیا۔

دنیائے اسلام کے اکثر ممالک بشمول ہمارے ہاں، ابن عربی کے افکار و نظریات کو **وحدت الوجود** کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا رجحان اس قدر عام ہے کہ اس یکطرفہ نقد و نظر نے یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کی کہ اس عظیم صوفی اور فلسفی کے پاس کوئی اور قابلِ ذکر فکر موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس مغربی علاقوں خصوصاً جرمنی میں ابن

عربی کے کثیر الابعاد افکار کا موازنہ **ایکات فان ہوک ہائیم** (Eckhart Von Hochheim,1260-1327) اور نکولس کیسانیئس (Nicolaus Cusanus,1401-1464) کے نظریات سے کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں فلسفی جرمنی کی فکری روایت میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ابن عربی کی طرح انہوں نے بھی انسان اور کائنات کے باہمی ربط پر غور کیا، الٰہیاتی مسائل کی تعبیر و توضیح کے لیے فلسفیانہ طرزِ فکر اختیار کیا اور تمام فکری معاملات میں مذہب کو فوقیت دی۔

کیسانیئس، اپنے عہد کا مایہ ناز فلسفی، قانون دان، ماہرِ علمِ فلکیات اور کارڈینل کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا اُسلوبِ فکر فلسفہ، سائنس اور روحانیات کا جامع تھا۔ اس کی تصانیف گہری صوفیانہ بصیرت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں، یہ اپنی تحریروں میں انسان، کائنات اور دیگر اہم مابعد الطبیعیاتی مسائل کو استعارے اور علامت کے اُسلوب میں لکھ کر ابن عربی جیسا نظامِ فکر وضع کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ عجوبہ روزگار فلسفی اور صوفی افکار و نظریات کے تمام مباحث مذہب کے تابع رکھنے کا عادی تھا اور دوسری طرف اپنے عہد کے تمام مروجہ سائنسی نظریات سے کافی آگے نکل چکا تھا۔

ایکات فان، جرمنی کا ماہرِ دینیات، فلسفی اور مسیحی مابعد الطبیعیات میں روایتی عقائد کا باغی تھا۔ اس نے اپنی تصانیف میں یہ نظریہ عام کیا کہ **خدا ہر شخص کے اندر موجود ہے**۔ درج ذیل اقتباس اس کے افکار کو مزید واضح کرتا ہے۔

"Our salvation depends upon our knowing and recognizing the Chief Good which is God Himself. I have a capacity in my soul for taking in God entirely. I am as sure as I live that nothing is so near to me as God. God is nearer to me than I am to myself... Thus must the soul, which would know God, be rooted and grounded in Him so steadfastly, as to suffer no perturbation of fear or hope, or joy or sorrow, or love or hate, or anything which may disturb its peace... the soul should be remote from all earthly things alike so as not to be nearer to one than another. It should keep the same attitude of aloofness in love and hate, in possession and renouncement, that is, it should be simultaneously dead, resigned and lifted up. (Excerpt from sermon: "The Nearness of the Kingdom," translated by Claud Field, ChristianClassicsEtherealLibrary)"

ابن عربی کا ان فلاسفہ کے ساتھ موازنہ از حد دلچسپ امر ہے، ان تینوں کا اسلوب حیران کن حد تک آپس میں گہری مماثلت رکھتا ہے۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہوتی کیونکہ ایم ایچ یوسف اپنی انگریزی تصنیف "Ibn Arabi-Time and Cosmology" میں جدید فزکس کے کئی نظریات ابن عربی کے فلسفے سے اخذ کرتا ہے اور یوں وہ شیخ اکبر کو جدید اصطلاح کے مطابق ایک "Physicist" کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ آئی المونڈ (I.Almond) پسِ ساختیات کے حوالے سے ابن عربی کو پرکھتا ہے، سن ۲۰۰۴ء اس کی شائع ہونے والی کتاب

"Sufiism and Deconstruction: A comparative study of Derrida and Ibn Arabi"

ابن عربی کی تفہیم میں نئے دروا کرتی ہے۔یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا ہے، پی۔کوایٹس(P.Coates) اور آر جے ڈوبی(R.J.Dobie) ابن عربی کو جدید تاریخ فلسفہ میں بلند مقام عطا کرتے ہیں،ان حکمانے ابن عربی کے'' تصورِ برزخ'' میں **علمِ فلسفہ** کے ان درجنوں مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا جو بقول ان کے ارسطو سے لیکر جدید امریکی فلسفی **رچرڈ مکے رورٹی** (Richard Mckay Rorty) تک لاینحل تصور کیے جاتے تھے۔شاہ کازیمی(Shah-kazemi) فلسفہ ابن عربی کا موازنہ جاپانی مفکر ڈوجن زین جی (Dogen Zhungzi) **چینی حکیم زوآنگ زی**(Zhuangzi) اور معروف ہندوستانی فلسفی شنکر اچاریہ(Shankaracharya) کے مشترک فکری پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرتا ہے۔اس موضوع کے تفصیلی مطالعے کے لئے شاہ کازیمی کی لاجواب تصنیف **"Paths to Transcendence:According to Shankara,Ibn Arabi,and Meister Eckhart."** کا مطالعہ ضروری ہے۔چین کے مسلمانوں نے ابن عربی کی علمی میراث کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سکول قائم کیا جس کا نام"The Han Kitab" ہے، یہ ادارہ ابن عربی اور کنفیوشس کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات ایک ساتھ فروغ دے رہا ہے۔فلسفہ ابن عربی کے اطلاقی اور عملی پہلوؤں کو ایک ادارے کی صورت میں عام کرنا یقیناً ایک انوکھی مثال ہے۔یہ تازہ حقائق ابن عربی کی آفاق گیر بصیرت کو نمایاں کرنے کی صرف ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ابن عربی صحیح معنوں میں اسلامی علوم کا بحرِ ناپیدا کنار ہے، یہاں کائناتی راز اسرار کے دبیز پردوں سے باہر نکل کر عوام وخواص سے ہم کلام ہونے لگتے ہیں۔یہاں برسبیلِ تذکرہ اس بات کی وضاحت لازمی ہے کہ شیخ اکبر کا **فلسفہ وحدت الوجود** حجرہ نشینی کا درس نہیں دیتا، بلکہ انسان کی حرکی قوتوں کو **مہمیز عطا کرتا ہے۔** یہ خالصتاً ایک عملی اور انقلابی فلسفہ ہے اور اسے بجا طور پر علم کی معراج کہنا چاہیے۔یہ فلسفہ انفس وآفاق کو علوم کے مجموعی چوکھٹے میں رکھ کر فہم کے اصل دروا کرتا ہے۔**وجود**(being) کی اس کیفیت وماہیت کا اصل ادراک صرف وہی کرسکتا ہے جو قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے پر قادر ہو۔گویا مرزا غالب کے الفاظ میں:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جز میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہء بینا نہ ہوا

شیخ اکبر کے فلسفہ وحدت الوجود کی تشریح وتوضیح کے لئے ماجد فخری نے **فصوص الحکم** کے مطالعے سے جو روشن نتائج اخذ کیے وہ لائق توجہ ہیں:

" According to Ibn Arabi,divinity and humanity are not two distinct natures,but rather two aspects which find their expression at every level of creation.Divinity corresponds to the hidden or inward(batin)aspect to the external or outward (zahir).In philosophical terminology,the first corresponds to substance,the second to accident.The manifestation of

reality reaches its consummation in man"(9)

فلسفہ وحدت الوجود کا یہی وہ باریک نکتہ ہے جس کی راست جانکاری ضروری ہے، یہی وجودی فلسفہ انسان کو اُس کے اصل مقام سے آگاہ کرتا ہے،اس فلسفے کی رو سے انسان صحیح معنوں میں کائناتِ اصغر ہے،انسان کو اگر کائنات کا **ست یا خلاصہ** کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، کیونکہ بظاہر یہ مٹھی بھر خاک کا پُتلا کائنات کی کاملیّت اور خدائی صفات کو اپنے اندر سموئے بیٹھا ہے،اپنی انہی افضل خصوصیات کے باعث قرآنِ حکیم نے اسے خدا کا نائب کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

ابن عربی کے نزدیک کامل ہستی حضرت محمدؐ کی ہے، کیونکہ آپؐ کی ذاتِ مبارک میں خدا اور کائنات کی تمام جلّی وخفی صفات اپنی کامل صورت میں جلوہ گر ہیں،یوں اگر دیکھا جائے تو اصل شئے **وجود** کی معرفت ہے، کائنات کے سبھی جھرنے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔**وجود** کی ایک اور تشریحی جھلک **فتوحاتِ مکیّہ** کے ذریعے دیکھی جاسکتی ہے۔یہ اقتباس انگریزی ترجمہ کی صورت میں درج ہے،سرِ دست **فتوحاتِ مکیّہ** کے اس حصے کا اردو ترجمہ دستیاب نہیں ہوسکا۔

"It is He who is revealed in every face,sought in every sign,gazed upon by every eye,worshiped in every object of worship,and pursued in the unseen and the visible.Not a single one of His creatures can fail to find Him in its primordial and original nature"

فلسفہ وحدت الوجود کا یہ فکری زاویہ ہر صاحبِ نظر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور بصراحت یہ اعلان کرتا ہے کہ اس فلسفیانہ فکر کو محض وجود کی وحدت پر محمول کرنا اور ہر شئے کو وجودِ باری تعالیٰ کا جزیا کُل قرار دینا راست **علمی** رویہ نہیں ہوسکتا۔وحدت الوجود کو سمجھنے کے لیے اُس فکری مغالطے کو الوداع کہنا ہوگا جو عرصہ دراز سے ہماری فکر پر جمود طاری کیے ہوئے ہے۔علامہ اقبال نے'' جاوید نامہ'' کے کئی اشعار میں ابن عربی کی فکر کو شعوری یا لاشعوری طور پر دہرانے کی کوشش کی ہے:

ما ترا جوئیم تو از دیدہء دور
نے غلط ، ما کور و تو اندر حضور

(**ترجمہ**) ''ہم تجھے تلاش کر رہے ہیں اور تُو ہماری نگاہوں سے دور(اوجھل) ہے،نہیں،خود ہم اندھے ہیں جبکہ تُو ہمارے سامنے موجود ہے۔''

سعدی کا یہ معروف شعر بھی مسئلہ حاضرہ سے ہم رنگ ہونے کے ناطے درج کیا جاتا ہے:

برگِ درختان سبز پیشِ خداوندِ ہوش
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

(ترجمہ) ''سبز درختوں کا ہر ایک پتہ ایک صاحبِ ہوش ودانش کے لیے خالق کی معرفت کی ایک کتاب ہے۔''

بو علی قلندر (شرفؔ) کا شعر نئے ڈھنگ سے اسی مضمون کو بیان کر رہا ہے:

گر چشمِ دل کشادہ شود اے شرفؔ ترا
ہر ذرہ جہاں شود آئینہ دارِ دوست

(ترجمہ) ''اے شرفؔ، اگر تیرے دل کی آنکھ کھلی ہو تو، تُو دیکھے گا کہ کائنات کا ہر ذرّہ اُس محبوب کا آئینہ ہے۔

ابن عربی کا صوفیانہ فلسفہ تکریمِ انسانیت کا درس دیتا ہے۔وحدت الوجود کے اس نظریے میں اصل مرکزیت صرف اور صرف انسان کو حاصل ہے، ماجد فخری کے بقول:

" Man is thus for Ibn Arabi the embodiment of Universal Reason and the being in whom all the attributes or perfections of God are reflected.In addition, it belongs to man alone to know God fully."(10)

مگر یہ سلسلہ یہاں آ کر رکتا نہیں، بلکہ دعوتِ فکر دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے:

"The angles know Him as a transcendent or spiritual reality only,whereas man knows Him in His duel character as essential reality (Haqq) on the one hand,and the manifestation of this reality in the phenomenal world (khalq) on the other." (11)

ابن عربی کی تفہیم کے لیے ہمیں تمام غلط اور دقیانوسی تناظرات بدلنے ہوں گے۔ان کے بارے میں یہ مغالطہ عام ہے کہ وہ خالق ومخلوق کے جھگڑوں سے یکسر آزاد، رام ورحیم کے فرق سے ناآشنا اور شریعت کی پاسداری سے خود کو ماورا تصور کرتے ہیں۔ان گمراہ کُن تصورات سے بچنے کا ایک سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ تصوف کی اسلامی اور عجمی روایت کا باہمی فرق سامنے رکھا جائے۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ **شیخ اکبر** سے جہاں لامحدود لوگ عقیدت رکھتے ہیں وہاں اُن کے مخالفین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں، اور یہی وہ طبقہ ہے جو من گھڑت باتیں شیخ اکبر سے منسوب کر کے نت نئی غلط فہمیوں کو جنم دے رہا ہے۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا کہنا ہے:

''قرامطہ نے فصوص الحکم، فتوحاتِ مکیّہ، مثنوی مولانا روم، احیاء العلوم اور دوسری مشہور کتابوں میں اپنی طرف سے عبارتیں اور اشعار داخل کر دیئے بلکہ بہت سی کتابیں خود لکھ کر بعض بزرگوں کے نام سے منسوب کر دیں۔مثلاً ایک دیوان حضرت علیؓ سے منسوب کر دیا۔بہت سی رباعیات مختلف صوفیوں سے منسوب کر دیں۔'' [11]

اے۔ای۔عفیفی جس کی زندگی کا بیشتر حصہ ابن عربی پر تحقیق و تنقید میں صرف ہوا، اُس کے مطابق ''فتوحاتِ مکیہ'' اور ''فصوص الحکم'' میں ایسا الحاقی مواد موجود جو بعد کے لوگوں نے جان بوجھ کر شامل کیا تا کہ شیخ کی اصل تعلیمات سے عوام وخواص کو دور رکھا جائے۔یوں اس عظیم صوفی کے خلاف دشمنی کا نہ ختم ہونے والا محاذ شروع ہو گیا۔اسی معاندانہ رویے کی ایک یہ مثال دیکھیے کہ جب امام شعرانیؒ ''فتوحاتِ مکیہ'' کا خلاصہ تیار کر رہے تھے تو

انھوں نے محسوس کیا کہ ''فتوحات'' کے بعض مقامات اصل اسلامی روح کے منافی ہیں۔اُنھوں نے قدرے تامل کے بعد وہ مقامات حذف کر دیے، تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد امام شعرانی کو شیخ شمس الدین مدنی کے توسط سے ''فتوحاتِ مکیہ'' کا ایک ایسا مستند نسخہ مل گیا جو بذاتِ خود ابن عربی کا تصدیق شدہ تھا، اُنھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کی **فتوحات** کے جس حصے پر وہ شک کر رہے تھے وہ اصل نسخے میں موجود ہی نہیں تھا۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہنا مناسب رہے گا کہ امام شعرانی کے عہد اور پھر بعد میں بھی مصر میں ابن عربی کی زیادہ تر تصانیف اسی انداز سے مسخ کی جاتی رہیں ہیں۔اب یہ اپنی جگہ تحقیق طلب مسئلہ ہے کہ آخر مصر اور چند دیگر عرب ممالک میں ابن عربی کے خلاف اتنی شدید دشمنی کے اصل اسباب ومحرّکات کیا ہو سکتے ہیں! یہ دیکھنا بھی لازم بنتا ہے کہ شیخ اکبر نے تصوف کے علاوہ دوسرے علوم مثلاً علمِ حدیث، تفسیر، سیرت، فلسفہ، ادب، صوفیانہ شاعری، فقہ اور فطری سائنس جیسے موضوعات پر جو گراں قدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں اُن میں الحاق واضافے کی کیا صورتِ حال ہے ؟

ابنِ عربی اسلامی فکر کا عظیم سرمایہ ہیں، اُن کی علمی وراثت کی حفاظت اور تصنیفی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

(حواشی)

(۱) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، محمد شفیع بلوچ، دیباچہ، محمد سہیل عمر، مکتبہ جمال، لاہور، طبع ۲۰۰۶، صفحہ ۱۲،۱۱

(۲) تین مسلمان فیلسوف، سید حسین نصر، (مترجم) محمد منور، علاقائی ثقافتی ادارہ (آر۔سی۔ڈی)، تہران، (لاہور) طبع اول ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۸

(۳) تین مسلمان فیلسوف، ص ۱۱۴

(۴) ایضاً، ص ۱۱۵،۱۱۴

(۵) History of Aslamic philosophy by Majid Fakhry,Columbia University Press New York,1983,P No 251

(۶) A History of Muslim Philosophy(vol 1)by M.M.Shrarif,Low Price Publications, Delhi (1995),P No,400

(۷) A History of Muslim Philosophy(vol 1),by M.M.Shrarif, P No,400

(۸) Quest for the Red Sulpher(french)by Claude Addas,Eng trans by Peter Kinsley,Sohail Academy Lahore(2000),P No,42

(۹) History of Islamic Philosophy, p No 253

(۱۰) History of Islamic Philosophy, p No 253-254

(۱۱) اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، یوسف سلیم چشتی، المحمود اکیڈمی، لاہور، طبع ۱۹۹۷، ص ۴۳

ہرٹا مولر (رومانیہ)

ترجمہ: **مبشر احمد میر** (گجرات)

رومال پر تحریر

(۲۰۰۹ء کی نوبل انعام برائے ادب حاصل کرنے والی رومانیہ کی جرمن اقلیت سے تعلق رکھنے والی ادیبہ ہرٹا مولر کے نوبل انعام کی تقریب سے کیے گئے خطاب کا اردو ترجمہ جدید ادب کے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔)

''ہر لفظ کو کسی موذی چکر میں گھومنا پڑتا ہے۔''

''تمھارے پاس رومال ہے؟'' امی ہر صبح گھر کے دروازے پر مجھے رخصت کرتے ہوئے دریافت کرتیں؛ میری جیب میں رومال نہ ہوتا چنانچہ رومال لینے مجھے دوبارہ واپس اندر جانا پڑتا۔ میرے پاس رومال نہ ہوتا کیوں کہ میں روزانہ امی کے سوال کی منتظر ہوتی۔ رومال اس امر کی علامت تھا کہ صبح کے وقت امی میرا خیال رکھ رہی ہیں؛ دن کا بقیہ حصہ مجھے خود اپنا خیال رکھنا ہوتا۔ ''کیا تمھارے پاس رومال ہے؟'' محبت کے جذبات کا بالواسطہ اظہار بھی تھا۔ کاشت کار گھرانوں میں ان جذبات کا براہ راست اظہار معیوب گردانا جاتا تھا اس لیے کھلے بندوں ان کے اظہار کا چلن بھی نہیں تھا۔ چنانچہ امی کی محبت نے ایک سوال کا روپ دھار لیا کیوں کہ حکمیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے دورانِ کار استعمال ہونے والے الفاظ کے مشاقانہ استعمال کی صورت میں ہی اس کا اظہار ممکن تھا۔ تاہم لہجے کا رُوکھا پن بھی ان کی شفقت کو ظاہر کر دیتا۔ میں ہر صبح گھر کے دروازے تک پہلے رومال کے بغیر اور دوسری مرتبہ رومال لے کر جاتی۔ اس کے بعد ہی میں باہر گلی میں نکلتی گویا رومال اِس امر کی علامت تھا کہ امی بھی میرے ہمراہ ہیں۔

بیس برس بعد میں شہر کی ایک فیکٹری میں بطور مترجم کام کر رہی تھی۔ کام کا آغاز ساڑھے چھ بجے ہوتا چنانچہ مجھے صبح پانچ بجے جاگنا پڑتا۔ ہر صبح فیکٹری کے میدان میں لاؤڈ سپیکر پر قومی ترانہ سنایا جاتا جب کہ کھانے کے وقفے کے دوران مزدوروں کے نغمے بج رہے ہوتے اس دوران مزدور تیل میں لتھڑے ہاتھوں میں تام چینی کی

خالی پلیٹیں تھامے خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کا کھانا پرانے اخبار میں لپٹا ہوتا جسے کھانے سے پہلے وہ پنیر پر چپکے ہوئے اخباری کاغذ کو الگ کرتے۔ دو برس اِسی معمول میں گزر گئے جن کا ہر دن باقی دنوں جیسا تھا۔

تیسرے برس اس معمول کا اختتام ہو گیا۔ ایک ہی ہفتے میں سیکریٹ سروس کی اقتداری قوت کا حامل، شعلے برساتی نیلی آنکھوں اور چوڑے ہڈ کاٹھ والا بھاری بھرکم اجنبی تین مرتبہ صبح سویرے میرے دفتر میں آیا۔

پہلی مرتبہ وہ کھڑا رہا؛ مجھے برا بھلا کہا اور واپس چلا گیا۔

دوسری مرتبہ اُس نے اپنی جیکٹ اتار کر دیوار سے لگی دراز کی ناب پر لٹکائی اور آرام سے بیٹھ گیا۔ اُس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے دوسروں کو بھانپنے کی میری صلاحیتوں کو سراہا۔ اُس کی سرسراتی آواز اور منافقانہ ستائش سے میں الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اُس روز میں نے گھر سے ٹیولپ کے کچھ پھول لا کر گُل دان میں سجائے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی ستائش کی تردید کرتے ہوئے اُسے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''میں ٹیولپ کے بارے میں تو جانتی ہوں لیکن انسانوں کو نہیں سمجھ سکتی۔'' جس کے جواب میں اُس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا کہ جتنا میں ٹیولپ کے بارے میں جانتی ہوں اِس سے کہیں زیادہ وہ میرے بارے میں جانتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ جیکٹ بازو پر لٹکا کر رخصت ہو گیا۔

تیسری مرتبہ اُس نے بیٹھتے ہوئے اپنا بریف کیس میری نشست پر رکھ دیا۔ میں خود میں اِس بریف کیس کو فرش پر رکھنے کی جرأت نہیں پاتی تھی؛ چنانچہ میں کھڑی رہی۔ اُس نے مجھے احمق کہتے ہوئے کام چور اور ایسی فاحشہ قرار دیا جو آوارہ کتیا کی طرح بدکردار ہو۔ اُس نے ٹیولپ کے پھولوں والے گُل دان کو میز کے کنارے کی جانب دھکیلتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم میز پر رکھا۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے دھاڑا، ''لکھو!'' اور میں نے وہیں کھڑے کھڑے اُس کے احکامات کی تعمیل میں لکھنا شروع کر دیا۔ اپنا نام، تاریخ پیدائش اور پتا...... وہ بولتا جا رہا تھا اور میں لکھ رہی تھی، ''کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی بھلے وہ میرا گہرا دوست یا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کہ میں......'' اور پھر اُس نے وہ اذیت ناک لفظ **معاونت** ادا کرتے ہوئے کہا، ''یہ کہ میں معاونت کر رہی ہوں۔'' یہ سن کر میں لکھتے لکھتے رُک گئی؛ میں نے قلم میز پر رکھ دیا؛ کھڑکی کے پاس جا کر باہر گڑھوں والی ناہموار اور گرد آلود شاہراہ عظمت Starda Gloriei کو دیکھا؛ شاہراہِ عظمت کے دورویہ ڈھلان چھتوں والے مکانات کو دیکھا۔ شاہراہ عظمت پر مالبری کے ایک ٹنڈ منڈ درخت پر فیکٹری کی کٹے ہوئے کان والی بلی بیٹھی تھی۔ بلی کے اُوپر صبح کا ٹھٹھرا ہوا سورج سنہرے ڈرم کی مانند چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے شاہراہِ عظمت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''N-am caracterul میں یہ کردار ادا نہیں کر سکتی'' کردار کا لفظ سنتے ہی سیکرٹریٹ کا آدمی جھنجھلا اُٹھا۔ اُس نے وہ کاغذ جس پر میں لکھ رہی تھی جھپٹ کر پرزے پرزے کر دیا اور یہ پرزے فرش پر پھینک دیے۔ پھر غالباً اُسے

احساس ہوا کہ اُس اپنے آفیسر کو یہ ثبوت فراہم کرنا ہے کہ اُس نے مجھے اپنا ایجنٹ بنانے کی کوشش کی تھی؛ چنانچہ اُس نے جھک کر کاغذ کے کے پرزوں کو اُٹھایا اور اپنے بریف کیس میں ٹھونس لیا۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی ناکامی کا غصہ ٹیولپ والے گل دان پر نکالتے ہوئے اُسے پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ گل دان کے ٹوٹنے سے کٹکٹانے کی آواز پیدا ہوئی جیسے ہوا غصے میں دانت پیس رہی ہو۔ اپنے بریف کیس کو بغل میں دباتے ہوئے وہ سفاک لہجے میں غرایا، ''تم پچھتاؤ گی۔ ہم تمھیں دریا میں غرق کر دیں گے۔'' میں نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''اگر میں اِس پر دستخط کر دوں تو مجھے خود اپنی ذات کی نفی کرنا ہوگی اور دستخط کرنے سے یہ انکار خود اپنے بل پر کرنا ہوگا چنانچہ بہتر یہی ہے کہ یہ انکار کر دوں۔'' اس وقت تک وہ دفتر کا دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا اور شاہراہ عظمت پر فیکٹری کی کٹے ہوئے کان والی بلی مالبری کے درخت سے چھلانگ لگا کر عمارت پر جا چکی تھی اور درخت کی ایک ٹہنی ترپال کی مانند جھول رہی تھی۔

دوسرے دن کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ ہر صبح ساڑھے چھ بجے مجھے ڈائرکٹر کے دفتر میں حاضری دینا ہوتی تھی۔ اس روز سرکاری مزدور یونین کا صدر اور کمیونسٹ پارٹی کا سکرٹری دونوں دفتر میں موجود تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں فیکٹری کی ملازمت چھوڑ دوں۔ جس طرح کسی زمانے میں میری امی مجھ سے دریافت کرتی تھیں، ''تمھارے پاس رومال ہے؟'' اب اسی طرح ہر صبح مجھ سے دریافت کیا جاتا، ''تمھیں کوئی اور ملازمت مل گئی ہے؟'' روزانہ میرا یہی جواب ہوتا، ''میں کوئی ملازمت تلاش نہیں کر رہی۔ میں اسی فیکٹری میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنی ریٹائرمنٹ تک یہیں رہوں۔''

ایک روز صبح کے وقت کام پر پہنچی تو میری ضخیم لغات میرے دفتر کے باہر ہال کے فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے دفتر کا دروازہ کھولا تو اپنی نشست پر ایک انجینئر کو بیٹھا پایا۔ وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگا، ''کسی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دستک دے کر اجازت لی جاتی ہے۔ یہ میرا دفتر ہے جس سے تمھارا کوئی تعلق نہیں۔'' اب میرا کوئی دفتر نہیں تھا لیکن میں واپس گھر نہیں جا سکتی تھی کیوں کہ بلا اجازت رخصت کے نتیجے میں انھیں مجھے ملازمت سے برطرف کرنے کا جواز مل جاتا۔ کسی بھی صورت مجھے وہاں ہونے میں ناکام نہیں ہونا تھا چنانچہ اب مجھے اِس امر کو یقینی بنانا تھا کہ میں کام پر موجود ہوں۔

ابتدا میں میری ایک سہیلی جسے میں نے گھر جاتے ہوئے شکستہ حال شاہراہِ عظمت سے گزرتے ہوئے سب باتیں بتا دی تھیں نے میرے لیے اپنے میز کا ایک حصہ خالی کر دیا لیکن ایک صبح وہ اپنے دفتر کے دروازے پر مجھے روکتے ہوئے کہنے لگی، ''میں تمھیں اندر نہیں بلا سکتی۔ تمھارے بارے میں سبھی کہہ رہے ہیں کہ تم مخبر ہو۔'' اس طرح میرے رفقائے کار میں میرے خلاف افواہ پھیلا کر مجھے ہراساں کرنے کا سلسلہ مزید بڑھا دیا گیا۔ آپ بیرونی حملے کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن یہ ایسی بدترین صورتِ حال تھی جس میں کسی کے پاس بدنامی کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ اِن دنوں میں ہر روز خود کو بشمول موت ہر ناگہانی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرتی لیکن اِس

الزام تراشی سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ پاتی۔ میرا سارا عزم، میرا سارا حوصلہ اِسے قابلِ برداشت بنانے میں ناکام رہا۔ تہمتیں آپ میں ایسی غلاضت بھر دیتی ہیں کہ آپ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ جس کے نتیجے میں آپ کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس تہمت کے نتیجے میں میں اپنے رفقائے کار کی نگاہوں میں ''وہ'' تھی ''جو'' بننے سے میں نے انکار کیا تھا۔ اگر میں واقعی اُن کی مخبری کر رہی ہوتی تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھ پر اعتماد کر رہے ہوتے۔ مختصراً وہ اپنے خلاف کچھ نہ کرنے کے جرم میں مجھے سزا دے رہے تھے۔

اب جب کہ میرا دفتر مجھ سے چھن چکا تھا؛ میری سہیلی اپنے دفتر میں مجھے جگہ نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یہ امر یقینی بنانا تھا کہ میں کام پر آتی رہوں۔ اُس وقت میں اس حال میں سیڑھیوں میں کھڑی ہوئی تھی کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بے بسی کے اِس عالم میں میں سیڑھیاں اُترا اور چڑھ رہی تھی کہ یکا یک میں امی کی ننھی بیٹی بن گئی کیوں کہ ''میرے پاس ایک رومال تھا۔'' میں نے اسے احتیاط سے دوسری اور تیسری منزل کے درمیان ایک قدمچے پر پھیلایا اور اس پر بیٹھ گئی۔ اب میں سیڑھیوں پر مقیم تھی اور رومال میرا دفتر تھا جہاں اپنے گھٹنوں پر ضخیم لغات رکھ کر ہائیڈرالک مشینوں کی تفصیلات کا ترجمہ کرنے لگی۔ میری سہیلی کھانے کے وقفے کے دوران مجھ سے ملنے سیڑھیوں پر آئی۔ ہم نے اسی طرح اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا جیسے اُس کے دفتر اور اس سے پہلے میرے دفتر میں کھایا کرتے تھے۔ میدان میں لاؤڈ سپیکر پر ہر روز کی طرح مزدوروں کے عوامی مسرتوں سے متعلق نغمے الاپے جا رہے تھے۔ کھانے کے دوران میری سہیلی میری حالتِ زار پر آنسو بہاتی رہی لیکن میں بالکل نہیں روئی کیوں کہ مجھے اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا تھا۔ یہ سلسلہ ایک لمبا عرصہ...... نہ ختم ہونے والے چند ہفتے چلا...... تا آں کہ مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

جن دنوں میں سیڑھیوں پر مقیم تھی؛ میں نے لغت میں لفظ Stair سیڑھی کے معنی دیکھے۔ پہلا قدم Starting Step ابتدائی قدم یا Curtail Step سفر کم کرنے والا قدم ہے؛ اسے Bull Nose بھینسے کی ناک بھی کہتے ہیں۔ پہلے قدم پر چڑھتے ہوئے سیڑھی جس سمت مڑتی ہے اسے Hand کہتے ہیں۔ قدمچے کے سامنے والی جانب نکلے ہوئے کنارہ Nosing ناک ہے۔ اس سے قبل میں گریس سے چکنی کی ہوئی ہائیڈرالک مشینوں کے مختلف حصوں کے Dove Tail فاختہ کی دم، Goose Neck بطخ کی گردن، Acorn Nuts شاہ بلوط کی گٹھلی اور Eye Bolts آنکھ کی چٹخنی جیسے دل آویز ناموں کے بارے میں جانتی تھی۔ اب لغت میں سیڑھی کے مختلف حصوں کے استعارات پر مبنی شاعرانہ نام دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو گئی کہ تکنیکی زبان بھی کتنی حسین ہوتی ہے۔ Hand اور Nosing کے استعاروں سے گمان گزرتا ہے کہ سیڑھی کا بھی ایک بدن ہوتا ہے۔ آخر انسان کیوں روزمرہ زندگی میں واسطہ پڑنے والی ہر چیز خواہ وہ لکڑی کی ہو یا پتھر کی؛ سیمنٹ کی ہو یا لوہے کی پر ہی نہیں بل کہ دنیا کہ انتہائی غیر متعلق چیزوں پر اپنا آپ مسلط کرنا چاہتا ہے؟ وہ کیوں بے جان مادے کو اپنے اعضا کا نام دے کر اُس کی اِس طرح تجسیم کرتا ہے گویا وہ اس کے وجود کا حصہ ہو؟ آیا اُکتاہٹ پیدا کرنے والے تکنیکی کام کا دل چسپ

بنانے کے لیے مخفی گدازیت ضروری ہے؟ آیا ہر شعبہ زندگی کے کاموں پر امی کے رومال کی بابت کیے جانے والے سوال کا اصول لاگو ہوتا ہے؟

میرے بچپن میں ہمارے گھر میں رومالوں کی ایک دراز ہوا کرتی تھی؛ جس میں دو متوازی قطاروں میں رومالوں کی تین تین ڈھیریاں ہوتیں۔

بائیں جانب میرے ابو اور دادا کے مردانہ رومال
دائیں جانب میری امی اور دادی کے زنانہ رومال
درمیان میں میرے بچگانہ رومال

یہ دراز رومالوں کے روپ میں ہمارے خاندان کی عکاسی کرتی تھی۔ مردانہ رومال سب سے بڑے ہوتے جن کے حاشیے پر خاکستری، سرمئی یا ارغوانی رنگ کی گہری پٹیاں ہوتیں۔ خواتین کے رومال ان سے چھوٹے ہوتے؛ جن کے کنارے آسمانی، سرخ یا سبز رنگ کے ہوتے۔ بچگانہ رومال سب سے چھوٹے ہوتے؛ بغیر حاشیے کے ان سفید رومالوں پر پھولوں یا جانوروں کی تصویریں چھپی ہوتیں۔ عام دنوں میں استعمال ہونے والے تینوں اقسام کے یہ رومال سامنے والی قطار میں ہوتے جب کہ اتوار کے مخصوص رومال عقبی قطار میں رکھے جاتے۔ اتوار کو اِس امر کا خیال رکھا جاتا کہ آپ کے رومال کا رنگ آپ کے لباس کے رنگ سے مطابقت رکھتا ہو؛ خواہ یہ مطابقت دوسروں کو دکھائی نہ دے رہی ہو۔

ہمارے نزدیک ہم سمیت گھر کی کوئی چیز رومال جتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ اِس کا استعمال ہمہ جہت تھا: نزلہ، نکسیر، ہاتھ، کہنی یا گھٹنے پر چوٹ لگنے کی صورت میں، آنسو بہنے یا آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں رومال ہی ہمارے کام آتا۔ سر درد کی صورت میں رومال کو ہی ٹھنڈے پانی میں بھگو کر ماتھے پر رکھا جاتا۔ دھوپ کی تمازت سے بچنے اور بارش سے بچنے کے سر پر باندھا جاتا۔ یاداشت کو تحریک دے کر کسی اہم کام کو یاد رکھنا ضروری ہوتو اپنے رومال کو گرہ لگالی جاتی۔ وزنی تھیلا اٹھانے کے لیے رومال کو ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا جاتا۔ گاڑی کے سٹیشن سے روانہ ہونے پر رومال ہلا کر اپنے عزیزوں کو الوداع کہا جاتا۔ میرے آبائی وطن Banat کی مقامی بولی میں آنسو کے لیے استعمال ہونے والے لفظ کی آواز رومانین زبان میں گاڑی کے لیے استعمال ہونے والے لفظ سے بہت ملتی ہے اس لیے ریل گاڑی کی ریلوے لائن پر چلنے سے پیدا ہونے والی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز مجھے ہمیشہ روتی ہوئی محسوس ہوتی۔ گاؤں کے کسی گھر میں کوئی فوت ہوتا تو فوراً اُس کی ٹھوڑی کو رومال سے باندھا جاتا تا کہ لاش اکڑتے ہوئے اُس کا منہ بند رہے۔ شہر میں کوئی سڑک کے کنارے ڈھیر ہو جاتا تو ہمیشہ کوئی راہ گیر اس کا چہرہ رومال سے ڈھانپ دیتا اس طرح رومال مرنے والے کی اولین جائے امن بن جاتا۔

گرمیوں کے دنوں پچھلے پہر والدین اپنے بچوں کو قبرستان میں لگائے گئے پھولوں کو پانی لگانے کے لیے بھیجتے۔ ہم دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں جلدی جلدی ایک کے بعد ایک قبر پر لگائے گئے پودوں کو پانی دیتے۔

اِس کے بعد ہم چرچ کی سیڑھیوں پر جمع ہو کر قبرستان کی کچھ قبروں سے اُٹھتی ہوئی سفید دھند کو مختلف شکلوں میں ڈھلتا دیکھتے۔ یہ دھند کچھ اُوپر جا کر تاریکی میں مدغم ہو جاتی۔ ہماری دانست میں دھند سے بننے والی جانوروں کی شکلیں، گلاس، چھوٹی بوتلیں اور پیالیاں، دستانے اور جرابیں ان کے علاوہ یہاں وہاں تاریک رات کے حاشیے میں سفید رومال سب مرنے والوں کی روحیں ہوتیں۔

کافی عرصہ بعد جب میں آسکر پاسٹر Oskar Pastor کو جبراً سویت یونین کے لیبر کیمپ بھیجے جانے کا احوال لکھنے کے سلسلے میں اُس سے ملی تو اُس نے بتایا کہ ایک عمر رسیدہ روسی ماں اُسے نفیس سوتی کپڑے کا بنا ہوا رومال دیتے ہوئے کہنے لگی، ''ممکن ہے تم دونوں خوش قسمت ہو...... ہوسکتا ہے جلد ہی تم اپنے گھر پہنچ جاؤ؛ اِسی طرح میرا بیٹا بھی۔'' اُس خاتون کے مطابق ان کا بیٹا آسکر پاسٹر کی ہی عمر کا تھا؛ وہ بھی اپنے گھر سے اتنا ہی دور لیکن مخالف سمت کے ایک تعزیری کیمپ میں تھا۔ بھوک سے نڈھال آسکر پاسٹر نے کچھ کوئلوں کے بدلے تھوڑا سا کھانا مانگنے کے لیے اُس خاتون کے دروازے پر دستک دی تھی۔ خاتون نے اُسے اندر بلا لیا؛ گرم سوپ دیا اور جب اُس کی بہتی ناک کو سوپ کے پیالے میں ٹپکتے دیکھا تو اُسے ایک غیر استعمال شدہ خوبصورت حاشیے والا نفیس سوتی رومال دیا جس پر ریشمی تاگے سے پتیوں والی ٹہنیاں کاڑھی ہوئی تھیں۔ اِس رومال نے بھوکے فقیر کو شرمندہ کرنے کے ساتھ دکھی بھی کر دیا۔ نفیس سوتی کپڑے کی تشفی جب کہ ریشمی ٹہنیوں کی چیخ کے ناطے یہ رومال دوہری صفات کا حامل تھا۔ اِسی طرح روسی خاتون کے لیے آسکر پاسٹر اجنبی سرزمین سے تعلق رکھنے والا فقیر ہونے کے ساتھ ہی دنیا کی بھیڑ میں کھویا ہوا بچہ بھی تھا۔ جس کی شخصیت کے حقارت سے دیکھے جانے والے دونوں پہلو ایک ایسی خاتون کے شفقت آمیز سلوک کے نتیجے میں تسکین پا کر اُس کی محبت کے اسیر ہو گئے جو خود بھی ایک جانب تو ایک اجنبی روسی خاتون ہونے اور دوسری جانب اپنے بچے کی تکالیف پر پریشان ماں کے، ''تمھارے پاس رومال ہے؟'' دریافت کرنے کے ناطے دو شخصیات کا مجموعہ تھی۔

جب سے میں نے یہ روداد سنی میں نے بچپن میں خود سے کیے جانے والے سوال، ''تمھارے پاس رومال ہے؟'' کو ہر موقع پر منطبق کر کے دیکھا۔ کیا یہ سوال ساری دنیا میں جماؤ اور پگھلاؤ کے مابین برفانی چمک میں پھیلا ہوا ہے؟ کیا یہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور ڈھلانوں کو پھلانگتا ہوا تمام جغرافیائی سرحدیں عبور کر جاتا ہے؟ کیا یہ ایک عظیم الشان سلطنت میں جگہ جگہ قائم تعزیری اور مشقتی کیمپوں میں پہنچ سکتا ہے؟ کیا سویت یونین کی مزدور آمریت کے ہتھوڑے اور درانتی کی مدد سے سٹالین کے قائم کردہ تجدید تعلیم کے کیمپوں میں بھی ''تمھارے پاس رومال ہے؟'' سے چھٹکارہ ممکن ہے؟

اگر چہ میں کئی دہائیوں سے رومانین زبان بول رہی تھی لیکن آسٹر پاسٹر سے گفتگو کے دوران مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ رومانین میں رومال کو Batista کہتے ہیں۔ یہ اِس مفروضے کی تائید میں ایک اور مثال ہے کہ رومانین زبان کی بنا حواس پر ہے جو براہ راست اشیا میں اُتر کر الفاظ اخذ کرتے ہیں۔ جس میں مادہ چکر کھا کر نام کا

روپ نہیں دھارتا بل کہ خود کو Batista رومال کی مانند بنا بنایا پیش کرتا ہے جیسے تمام رومال ہمیشہ اور جگہ Batista نامی نفیس سوتی کپڑے سے تیار ہوتے ہوں۔

آسکر پاسٹر نے اِس رومال کو ایک تبرک کی مانند کیمپ میں گزارے گئے پانچ برسوں کے دوران اپنے صندوق میں سنبھال کر رکھا۔ جس کے بعد وہ اجنبی ماں کی جانب سے اجنبی بیٹے کو دی گئی اس نشانی کو اپنے گھر لے آیا کیوں کہ یہ سفید رومال بیم ورجا کا مجموعہ تھا۔ اگر ایک مرتبہ آپ بیم ورجا کے چکر سے نکل جائیں تو آپ زندہ نہیں رہتے۔

سفید رومال کے بارے میں ہونے والی گفتگو کے بعد میں آدھی رات سفید کارڈ بورڈ پر آسکر پاسٹر کے لیے لکھے گئے اشعار کے الفاظ چسپاں کرنے میں مصروف رہی۔

شہد کی مکھی کہتی ہے، نقاط رقصاں ہیں
تم ایک شگوفہ نما لمبوترے دودھ کے گلاس میں اُتر رہے ہو
سفید، سرمئی سبز جستی ٹب میں لینن
قریباً سبھی اشیا
ملنے پر گھل مل جاتی ہیں
اِدھر دیکھو
میں گاڑی پر سوار ہوں اور
صابن دانی میں چیری ہے
کبھی اجنبیوں سے گفتگو نہ کرو
اور نہ ہی سوئچ بورڈ پر بات کرو

اسی ہفتے کے دوران میں اُسے یہ کارڈ بورڈ دینے گئی تو اُس نے کہا، ’’تمھیں اِس پر ’آسکر پاسٹر کے لیے‘ بھی چسپاں کرنا چاہیے۔‘‘ میں نے جواب دیا، ’’جو چیز میں تمھیں دے رہی ہوں؛ تمھاری ہے۔‘‘ وہ بولا، ’’پھر بھی تمھیں ’آسکر کے لیے‘ چسپاں کرنا چاہیے کیوں کہ ممکن ہے کارڈ کو اس کا علم نہ ہو۔‘‘ چنانچہ میں وہ کارڈ بورڈ واپس لے آئی اس پر ’’آسکر کے لیے‘‘ چسپاں کیا۔ اگلے ہفتے میں نے یہ کارڈ آسکر کو دیا؛ جیسے بچپن میں پہلی مرتبہ رومال بنا اور دوسری مرتبہ رومال لے کر گھر کے دروازے سے باہر جا رہی ہوں۔

☆☆☆

ایک اور کہانی کا اختتام رومال پر ہوتا ہے۔

میرے دادا، دادی کا ماذ Matz نامی ایک بیٹا تھا۔ دادا نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ماذ کو ٹی می سورا Timisora بھیجا تا کہ تجارتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد غلے اور کریانے کے خاندانی کاروبار کو سنبھال سکے۔ سکول کے نسل پرست کٹر نازی اساتذہ نے ممکن ہے ماذ کو تھوڑی بہت تجارتی تعلیم بھی دی ہو لیکن انھوں نے اپنی تمام

کوششیں اسے نازی بنانے میں صرف کرتے ہوئے اس کی اچھی طرح برین واشنگ کی۔ جس کے نتیجے میں سکول سے فارغ التحصیل ہونے تک ماذ بالکل بدل چکا تھا۔ اب وہ ایک پُر جوش نازی تھا جو ہر وقت سامی النسل یہودیوں کے خلاف بولتا رہتا۔ وہ اپنے موقف کے حق میں احمقانہ دلائل پیش کرتا۔ میرے دادا کا تمام تر کاروبار ان کے یہودی تاجر دوستوں سے ملنے والے قرض کا مرہونِ منت تھا؛ اس لیے انھوں نے بارہا ماذ کو برا بھلا کہا لیکن اُس پر اِس ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے اُس کی مرمت بھی کر کے دیکھ لیا لیکن ماذ کی عقل کا خانہ تو نازی اساتذہ نے صاف کر دیا تھا۔ وہ رومانوی فوج میں دفتری اہل کار تھا لیکن ہر وقت گاؤں میں نازی نظریات کی تبلیغ میں مصروف رہتا۔ اُس کے اِسی جوش و جذبے نے اُسے نظریاتی تبلیغ سے آگے بڑھ کر میدانِ عمل میں اُترنے پر اُکسایا۔ چنانچہ اُس نے نازی پارٹی شعبہ حرب Wafen SS میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے محاذِ جنگ پر بھیجے جانے کی استدعا کی۔ محاذ پر ہونے والے جرائم اور سختیوں کو بھگتنے کے بعد اُس نے محاذ سے چند ایام کے لیے عارضی فرار کا اُس زمانے میں مستعمل جادوئی نسخہ استعمال کیا جسے ’’رخصت برائے شادی‘‘ کہا جاتا تھا۔

میری دادی اماں کی دراز میں اُن کے بیٹے ماذ کی دو تصویریں تھیں۔ پہلی اُس کی شادی کے موقع پر کھینچی گئی تھی جب کہ دوسری موت کے بعد اُس کے بچے کھچے اعضا کی تھی۔ شادی کی تصویر میں سفید جوڑے میں ملبوس، سر پر برف کے گالوں کی پتیوں کے گچھے جیسا سفید موم کا تاج سجائے دولہا سے ہاتھ بھر بلند، دبلی پتلی، سنجیدہ، میڈونا جیسی شکل و صورت والی دلہن کے ساتھ اپنی نازی وردی میں اکڑ کر کھڑا ماذ دولہا کی بجائے دُلہن کا گارڈ نظر آتا ہے۔ ماذ کے دوبارہ محاذ پر جانے کے کچھ عرصہ بعد دوسری تصویر موصول ہوئی۔ بارودی سرنگ کی زد میں آ کر چیتھڑوں میں بدل جانے والے غریب سپاہی کی اِس تصویر میں سیاہ زمین کے وسط میں سفید کپڑے پر ہلاک ہونے والے کے بچے کھچے اعضا سرمئی ڈھیر کی صورت میں پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ سیاہ پس منظر میں سفید کپڑا کسی بچے کے چھوٹے سے رومال جیسا دکھائی دیتا جس پر عجیب و غریب نمونہ بنایا گیا ہو۔ ایک پہلو سے یہ تصویر میدانِ جنگ میں مارے جانے والے نازی سپاہی کی تھی جب کہ دوسرے پہلو سے دادی اماں کی یادوں میں جیتے جاگتے بیٹے کی آخری نشانی تھی۔ روزانہ خداوند سے دعا کرنے والی دادی اماں دو پہلوؤں کی حامل اِس تصویر کو ہمیشہ اپنی دعاؤں کی کتاب میں سنبھال کر رکھتیں۔ میرے خیال میں اپنے پیارے بیٹے کے نازی بننے کا اعتراف کرتے ہوئے وہ خداوند سے التجا کرتی ہوں گی کہ وہ اُن کے بیٹے سے شفقت کا سلوک کرتے ہوئے انتہا پسند نازی کو معاف فرما دے۔ غالباً اس طرح خداوند کے حضور اُن کی دعا بھی دو پہلوؤں کی حامل ہوتی ہوگی۔

اپنے بیٹے ماذ کا ذکر کرتے ہوئے میرے دادا کا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ انھوں نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران فوج میں خدمات سرانجام دیتے ہوئے میدانِ جنگ کا براہِ راست مشاہدہ کیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ، ’’نقارے پر چوٹ پڑتے ہی معقولیت جنگی نعروں کے سیلاب میں بہہ جاتی ہے۔‘‘ دادا کا یہ قول مستقبل کی آمریت پر بھی منطبق ہوتا ہے جسے میں نے خود بھگتا ہے۔ آئے روز آپ چھوٹے بڑے مفاد پرستوں کو نعروں کے سیلاب میں بہہ کر معقولیت سے تہی دامن ہوتا دیکھتے ہیں لیکن میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں اِس سیلاب میں نہیں بہوں گی۔

ہمارے گھر میں محاذِ جنگ پر کام آنے والے سپاہی ماذ کا ایک اکارڈین پڑا ہوا تھا؛ چنانچہ بچپن میں نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اکارڈین بجانا سیکھنا پڑا۔ اکارڈین کے فیتے میرے جسم کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ جنھیں کندھوں سے پھسلنے سے بچانے کے لیے اکارڈین سکھانے والے استاد انھیں اکٹھا کر کے ایک رومال کی مدد سے میری پشت پر باندھ دیتے تھے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نقارہ، اکارڈین اور رومال جیسی اشیاء ایک دوسری سے مختلف، اَن مل اور متضاد اشیاء میں رابطہ پیدا کرنے کے ناطے بیش قیمت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں یا یہ کہ ان کا پہلو بدل بدل کے بار بار نمودار ہونا اِس امر کو آشکار کرتا ہے کہ یہ سب ایک حیران کن محور کے گرد جسے جرمن زبان میں شیطانی گرداب کہتے ہیں چکر کاٹ رہی ہیں؟ ہم اسے تسلیم کر سکتے ہیں لیکن زبان سے ادا نہیں کرتے۔ تاہم جو زبان سے ادا نہیں کیا جا سکتا اُسے تحریر کیا جا سکتا ہے کیوں کہ تحریر کے عمل میں ہونٹوں کا استعمال کیے بغیر قلم کا براہِ راست ذہن سے رشتہ ہوتا ہے۔ میں نے آمریت کے ہوتے ہوئے بہت کچھ لکھا کیوں کہ میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے اُن کے اشاروں پر نہیں ناچنا۔ میری تحریرات کا موضوع اذیت کا تسلسل ہوتا۔ تحریر کے اِس عمل کا آغاز اُن ناقابلِ بیان حالات میں ہوا جب بظاہر وہ مجھے ہر پہلو سے دبانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور میں بے یار و مددگار سیڑھیوں پر پناہ گزیں تھی۔ تاہم اپنی ذات اور شخصیت کو برقرار رکھتے ہوئے الفاظ سے رشتہ قائم رکھنے کی خواہش نے مجھے موت کے خوف کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس وقت جو مجھ پر گزر رہی تھی میں اسے کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی البتہ خاموشی سے اپنے ذہن میں دہرا سکتی تھی۔ الفاظ کو دہرانے کا یہ عمل ہی میری حالت کو سنبھال سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے واقعات کا تعاقب کر کے انھیں حیران کن گردش میں سفر کرنے والے الفاظ میں پکڑا جس کے نتیجے میں وہ اس صورت میں ظاہر ہوئے جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی؛ اس طرح میں وہ کہہ پائی جسے میں زبان سے کبھی بھی نہ ادا کر سکتی۔ اِس عمل کے دوران الفاظ کے تاثرات بیرونی حقائق کے متوازی سفر کرتے ہوئے ان حقائق کو نظر انداز کر کے اہم نقاط کو سمیٹتے جب کہ غیر اہم کو پھیلاتے گئے۔ یہ سلسلہ دیوانگی کے عالم میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی لمحہ موجود تک بسر کیے گئے حالات پر الفاظ کا یہ موذی چکر ایک لعنتی منطق مسلط کرتا جاتا ہے؛ جس کے تاثرات جابرانہ اور بے چین کن ہوتے ہوئے طلب بڑھانے کے باوجود گھسے پٹے ہوتے ہیں۔ اس میں آمریت کے موضوع کی موجودگی بھی ضروری ہے کیوں کہ اگر ایک مرتبہ ہم سے کچھ کرنے کی صلاحیت کا حق چھین لیا جائے تو کوئی معاملہ باقی نہ رہے۔ اگرچہ اِس میں ضمناً موضوع بھی پایا جاتا ہے لیکن اصل چیز الفاظ ہیں جو مجھ پر مسلط ہو جاتے ہیں اور موضوع کو جدھر چاہیں موڑ لیتے ہیں۔ اس دوران ظاہری حواس معطل ہو جاتے ہیں اور الفاظ کی بیان کردہ ہر بات حقیقت ہوتی ہے۔

جن دنوں میں سیڑھیوں پر قیام پذیر تھی۔ اُن دنوں میں اِسی طرح تنہا تھی جس طرح اپنے بچپن میں دریا کے کنارے وادی میں گایوں کو چراتے ہوئے ہوا کرتی تھی اور ویرانے میں اُگے پھول پتیوں سے تعلق قائم کرنے کے لیے انھیں چکھ کر دیکھا کرتی تھی کیوں کہ وہ زندہ رہنا جانتے تھے جب کہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں ایک

خاردار پودے جس کے ڈنٹھل میں دودھ ہوتا ہے کو اس کے نام Milk Thistle کے نام سے پکارتی لیکن وہ پودے Milk Thistle کہنے پر متوجہ نہ ہوتے چنانچہ میں نے Milk اور Thistle سے ہٹ کر اُن کے Thorn Rib کانٹے کی پسلی اور Needle Neck سوئی کی گردن جیسے نام تراشنے شروع کر دیے۔ اِن تراشے گئے ناموں نے ان پودوں اور میرے مابین ایک فاصلہ منکشف کیا جو ایک گہری کھائی کو جاتا تھا۔ یہ پودوں سے ہم کلام ہونے کے بجائے خود کلامی کی گہری کھائی میں گرنے کی ذلت تھی لیکن یہ ذلت میرے لیے مفید بھی تھی کیوں کہ میں گایوں کی نگرانی کر رہی ہوتی جب کہ الفاظ میری نگرانی کرتے۔ میں نے محسوس کیا:

تمھارے منہ پر ہر لفظ
کچھ جانتا ہے، موذی چکر کے بارے میں
لیکن اسے ادا نھیں کرتا

چوں کہ اشیا اپنے مادے سے دھوکا دیتی اور محسوسات اپنے اشارات سے بہکاتے ہیں اس لیے الفاظ کی آواز کو اس امر کا ادراک ہوتا ہے کہ اس کے پاس رِجھانے کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں۔ الفاظ کی آواز بشمول اس آواز سے پیدا ہونے والی حقیقت مادے کے دھوکے اور محسوسات کے اشارات کے مقامِ اتصال پر موجود ہوتی ہے۔ تحریر میں یہ تسلیم کرنے کا معاملہ نہیں بل کہ دھوکے کی دیانت داری ہے۔

جن دنوں فیکٹری کی سیڑھیوں کے قدمچے پر بچھایا ہوا رومال میرا دفتر تھا۔ میں نے لغت میں خوبصورت لفظ Treppenzins یا نزولی شرح سود جس سے سیڑھیاں چڑھنے کی مانند بڑھنے والی شرح سود مراد ہے اور جسے جرمن زبان میں Stair Intrest کہتے ہیں بھی دیکھا۔ یہ بڑھنے والا سود ایک فریق ادا کرتا جب کہ دوسرا فریق وصول کرتا ہے۔ تحریر کے عمل کے دوران میں جتنا متن میں اُترتی گئی مجھ پر یہ دونوں پہلو آشکار ہوتے گئے۔ تحریر مجھ سے جتنا لیتی جاتی ہے اتنا ہی وہ بسر کیے گئے تجربے کی غیر موجود کڑیوں کو مجھ پر آشکار کرتی جاتی ہے۔ صرف الفاظ ہی انہیں دریافت کر پاتے ہیں کیوں کہ وہ پہلے سے اِن کے بارے میں آگاہ نہیں ہوتے اور جہاں وہ زندہ تجربے کو تحیر سے دیکھتے ہیں وہیں اِس کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح آخر کار وہ اتنے دل چسپ ہو جاتے ہیں کہ بسر کیا گیا حقیقی تجربہ پارہ پارہ ہونے سے بچنے کے لیے ان سے پیوست ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں محسوس کرتی ہوں کہ اشیاء اپنے مادے کو نہیں جانتیں؛ تاثرات اپنے احساسات سے واقف نہیں ہوتے اور الفاظ ان ہونٹوں سے آشنا نہیں ہوتے جو انہیں ادا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اپنے وجود کے اثبات کے لیے ہمیں مادے، تاثرات اور الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نتیجتاً ہمیں جتنے زیادہ الفاظ استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے اُتنے ہی ہم آزاد ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے ہونٹ سی دیے جائیں تو ہم تاثرات بل کہ اشیاء تک کا سہارا لیتے ہیں؛ جن کا سمجھنا دشوار ہونے کے باعث شبہات پیدا کرنے میں وقت لیتا ہے۔ اس طرح شبہات پیدا کرنے میں وقت لینے والے یہ عوامل ہماری تذلیل کو وقار میں بدلنے کے عمل میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں۔

میرے رومانیہ چھوڑنے سے کچھ عرصہ قبل ایک دن صبح سویرے ایک دیہاتی سپاہی میری امی کو مقامی

پولیس سٹیشن لے جانے آیا۔ امی اُس وقت دروازے پر موجود تھیں۔ اُس وقت اُن کے ذہن میں سوال اُبھرا، ''تمھارے پاس رومال ہے؟'' جو اُن کے پاس نہیں تھا۔ سپاہی کے جلدی مچانے کے باوجود وہ رومال لینے واپس گھر کے اندر گئیں۔ پولیس سٹیشن پہنچنے پر وہ سپاہی غصے سے پھٹ پڑا لیکن امی کا رومانین زبان کا علم اتنا محدود تھا کہ انھیں اُس کی کوئی بات سمجھ نہ آئی۔ غصے کے عالم میں وہ انہیں اپنے دفتر میں بند کرتے ہوئے باہر سے چٹخنی لگا کر چلا گیا۔ امی تمام دن اُسی کمرے میں بند رہیں۔ ابتدائی گھنٹوں کے دوران وہ دفتر کی میز پر بیٹھی روتی رہیں۔ پھر انھوں نے دفتر میں ٹہلتے ہوئے اپنے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رومال کی مدد سے دفتر کا گرد آلود فرنیچر صاف کرنا شروع کر دیا۔ اِس سے فارغ ہوئیں تو کونے میں پڑی پانی کی بالٹی اور دیوار کی ہک پر لٹکے تولیے کی مدد سے فرش پر پونچھا لگانا شروع کر دیا۔ میں اپنی امی سے یہ روداد سُن کر ششدر رہ گئی اور اُن سے سوال کیا، ''آپ کس طرح اُس کے دفتر کی صفائی پر آمادہ ہوئیں؟'' انھوں نے کسی احساسِ شرمندگی کے بغیر جواب دیا، ''مجھے وقت گزارنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا اور اُس کے دفتر میں صفائی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شکر ہے کہ میں اپنے ہمراہ ایک بڑا مردانہ رومال لے گئی تھی۔''

تب مجھے سمجھ آیا کہ اِس اضافی لیکن رضا کارانہ تذلیل کے ذریعے اپنی پابندی کے دوران انھوں نے اپنے لیے تکریم حاصل کی۔ میں نے ایک کارڈ بورڈ پر اس کے لیے الفاظ کھوج کر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اپنے من میں سوچا کھلتے گلاب کے متعلق
غربال کی مانند بے کار روح کے متعلق
لیکن پکڑنے والے نگران نے پوچھا:
کس کا ہاتھ اُوپر ہوگا؟
میں نے کہا: اپنی کھال بچانا
وہ چلایا: کھال
کچھ نہیں مگر ایک حقیر رومال کا چیتھڑا
بغیر کسی شعور کے

میری تمنا ہے کہ اُن تمام لوگوں کو ایک جملہ کہہ سکوں جنھیں آمریت تا حال ہر روز وقار سے محروم کرتی ہے۔......ایک ایسا جملہ......یا شاید ایک سوال جس میں رومال کا لفظ بھی شامل ہو، ''تمھارے پاس رومال ہے؟''

کیا رومال کے بارے میں کیا جانے والا یہ سوال کبھی بھی رومال کے متعلق نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ ہمیشہ فرد کے احساسِ تنہائی کے بارے میں ہوتا تھا؟

☆☆☆

خادم علی ہاشمی (ملتان)

khadim.hashmi@gmail.com

اردو میں فنی اور سائنسی تراجم

حضرتِ انسان حیوانِ ناطق ہونے کے سبب ہمیشہ ہی سے اظہارِ خیال اور رابطے کے وسیلوں کا متلاشی رہا ہے۔ اسی کاوش نے جہاں ایک جانب بولی، زبان اور ادب نے جنم لیا اور اقوامِ عالم وجود میں آئیں تو دوسری جانب مختلف اقوام کے مابین رابطے اور عالمی زبان کی ترویج کی کوششیں بھی جاری رہیں، جن کی ایک مثال ''**اسپرانٹو**'' اور دوسری کرۂ ارضی سے باہر موجود کسی ذی شعور مخلوق کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی سعی ہے، جو گزشتہ کئی دہائیوں سے مسلسل کی جا رہی ہے۔

اگر ہم ماضی قریب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو زبان و بیان کے حوالے سے کئی انکشافات ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے اگر ہم اپنے خطے کی زبانوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں ''ماہیے'' اور ''ہیر'' کے لیے پنجابی، رزمیہ اظہارِ خیال کے لیے پشتو اور ''کافی'' کے لیے سندھی و سرائیکی سے بہتر زبان نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص ''کافی'' کا ترجمہ پنجابی، اردو یا پشتو میں کرنے بیٹھے تو اس کی مشکل کسی اظہار کی مرہونِ منت نہ ہوگی۔ ایک دو نسل قبل برّصغیر میں اظہارِ خیال کی زبان فارسی تھی۔ مغلوں کی سرکاری زبان، رنجیت سنگھ کے دربار کی سرکاری کارروائی اور انگریزوں کے ابتدائی دور میں فارسی کا راج تھا۔ اس دور میں اعلیٰ خیالات کا اظہار فارسی زبان ہی میں ممکن تھا۔ چنانچہ غالبؔ، گرامیؔ اور اقبالؔ کو اسی روایت کے پیشِ نظر فارسی کو اظہارِ خیال بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ مسلمانانِ عالَم اس دور سے کچھ پہلے تک معتبر تحریریں عربی زبان ہی میں پیش کرتے، جب کہ یورپی اقوام کے لیے پہلے لاطینی اور بعد میں فرانسیسی زبان کا جاننا عالی مرتبے کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ان ادوار میں عربی، فارسی، لاطینی اور فرانسیسی سے ترجمہ کرنا عالِم کی شان سے گرا ہوا کام سمجھا جاتا تھا اور مذکورہ زبانوں تک براہِ راست رسائی علم کی پہچان تھی۔ ترجمہ کرنے کی بجائے متعلقہ زبان کو سیکھ کر اس میں موجود علوم سے استفادہ کرنا معمول کی بات تھی۔ چنانچہ برِّصغیر پاک و ہند میں ساٹھ ستر برس پہلے تک کسی نے بھی فارسی غزل یا رباعی کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا اور اردو شاعری فارسی شاعری کے شانہ بشانہ پروان چڑھتی چلی گئی۔ لہٰذا سرسید سے پہلے غالباً اردو میں essay کا رواج نہ تھا۔ کہانی، غزل، نظم، قصیدہ اور رثائی اصناف کی زبان کی حیثیت سے اردو نے جو ترقی کی اس کی مثال فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں شاید ہی ملے۔ آج جذبات کے اظہار کے لیے اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے

شانہ بشانہ کھڑی ہے۔

یہ دنیا محض حسن وعشق اور گل وبلبل کے قصوں ہی سے عبارت نہیں ہے۔اس کی رنگینی میں کسان کا پسینہ، مزدور کی محنت، کاری گر کی صناعی، جرّاح کی مہارت، مہندس (انجینیر) کا کمال بھی شامل ہے۔صنعت و حرفت، سائنس وٹیکنولوجی، طب وجراحت کی ترقی کے ساتھ حضرتِ انسان نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ پہاڑوں کے دل چیر کر، دریاؤں کے رخ موڑ کر، زمین کی تہہ کے نیچے پوشیدہ خزانوں کو نمایاں کر کے، فضا کی بلندیوں کا احاطہ کرتے ہوئے، سمندر کی گہرائیوں کو کھنگال کر کرّۂ ارضی پر زندگی کے معمولات میں بے پناہ تبدیلیاں لائی ہیں۔ وہ انسان جو ایک صدی پیشتر ریل گاڑی کی اس لیے مخالفت کر رہا تھا کہ اس کے چلنے سے ''مرغیاں انڈے دینا بند کر دیں گی اور عورتوں کا اسقاط ہو جائے گا''، آج خلائی شٹل کا مسافر ہے۔کل تک پیغام رسانی کے لیے گھوڑے اور ڈھول کی آواز کافی سمجھی جاتی تھی، آج مائکروویو اور انٹرنیٹ کا ایک عالم گیر نظام قائم ہے اور آنِ واحد میں دور دراز مقامات سے رابطہ قائم ہوسکتا ہے۔ ہماری زندگی ہی میں ریڈیو، ٹیلی وژن، راکٹ، مصنوعی سیارے اور کمپیوٹر کی ترویج ہوئی۔1948ء میں ٹرانسسٹر کی ایجاد اور 1939ء میں ایٹمی انشقاق کی دریافت کے بعد ٹیکنولوجی کی ترقی جس رفتار سے ہوئی اس سے پہلے خواب وخیال میں بھی نہ تھی۔اب جب کہ مصنوعی ریشے نے ربڑ، پٹ سن اور کپاس پیدا کرنے والی قوموں کی اجارہ داری ختم کر دی ہے، ہمارے لباس اور رہن سہن میں بے پناہ تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ سب سائنسی دریافتوں اور ان کے اطلاقات کے باعث ہے۔سائنسی ترقی کی کہانی ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ غالباً سب سے اہم ایجادوں میں پہیہ، آگ اور کمپیوٹر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دوسرے علوم کی طرح ازل سے سائنسی علوم بھی انسانی ورثے کے طور پر ایک قوم سے دوسری میں منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔قدیم تہذیبوں سے یونانیوں نے اکتسابِ علم کیا، اُن سے مسلم اقوام نے علوم کی مشعل سنبھالی جن سے یورپی اقوام نے علوم کی اجارہ داری حاصل کی۔

جس طرح غالب اور حکمران اقوام کی تہذیب وتمدن مغلوب اقوام کے لیے فیشن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح زندہ علوم بھی غالب اقوام کی اجارہ داری میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ زرّیں میں سائنسی ترقی میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے اُن کی مثال بعد میں یورپ اور حال ہی میں امریکہ اور روس میں ملتی ہے۔

یہ طویل تمہید ترجمے کی بات کو واضح کرنے کے لیے کی گئی ہے۔سائنسی علوم کے حصول کے لیے مسلمانوں کو یونانی، عبرانی، سریانی، سنسکرت اور چینی زبانوں سے عربی میں تراجم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ زمانۂ وسطیٰ میں جملہ علوم کے خزانے نہ صرف عربی زبان میں منتقل ہوئے، بلکہ مزید دریافتیں اور تحقیقات عربی زبان ہی میں پیش کی جاتی رہیں۔

یورپی اقوام نے عربی زبان میں موجود علوم کو لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اقوامِ مغرب کے سیاسی عروج کے ساتھ ہی یورپی زبانیں سائنسی علوم کی مزاج دان بن گئیں۔بیسویں صدی کے اوائل تک برطانیہ اور امریکہ کے سائنس دان اپنی کاوشوں کو معتبر بنانے کے لیے جرمن زبان ہی میں پیش

کرتے۔بالکل اسی طرح جیسے غالبؔ، گرامیؔ اور اقبالؔ نے فارسی زبان کا سہارا لیا۔یورپ اور امریکہ کی اکثر یونیورسٹیوں میں اعلیٰ ڈگری کے حصول کے لیے جرمن، فرانسیسی، یا کسی اور غیر ملکی زبان میں مہارت کا حصول لازمی قرار دیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا تک سائنسی ترقی کی رفتار سست رہی۔ اکثر معلومات شائع ہوکر ماہرین تک پہنچ جاتی تھیں۔مگر بیسویں صدی کے آغاز ہی سے علوم میں ترقی کی رفتار اچانک برق رفتاری اختیار کرتی گئی۔ جہاں پہلے علوم کی ''مقدار'' تین سو سالوں میں دوگنا ہوتی تھی، پہلے پچاس پھر تیس اور بعد میں سات آٹھ سالوں میں دوگنا ہونے لگی۔ پھر ہر سائنس دان کو جرمنی یا فرانس جانے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ ذرائع ابلاغ نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ مختلف علوم کے جرائد ورسائل دنیا بھر سے جاری ہونے لگے اور اب مشینی ترجمے کا دور آ گیا ہے۔ جنگِ عظیم اول کے بعد سے یورپ کی علوم پر اجارہ داری ٹوٹتی نظر آتی ہے اور امریکہ، آسٹریلیا، روس، چین اور جاپان میں بھی سائنسی علوم نے کروٹ لی ہے۔اس ترقی کے دور میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ ہر ملک کی زبان سیکھے۔اس کے برعکس ہر قوم کو سائنسی معلومات کی ضرورت ہے۔ اکثر اقوام نے انگریزی زبان کو اپنا لیا اور اب انگریزی زبان دنیا کے بیشتر ملکوں میں سائنسی علوم کی زبان کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک اکثر سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ ممکن تھا، مگر اس صدی کے اختتام تک اس قدر زیادہ تعداد میں دریافتیں ہوئیں اور نئی اصطلاحات اتنی تیزی کے ساتھ سامنے آنا شروع ہوئیں کہ ہر اصطلاح کا ترجمہ کرنا ناممکن ہوتا چلا گیا۔طبعیات کے مضمون سے چند مثالوں سے اس بات کی توضیح کروں گا:

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں رانجن (Rontgen) نے نامعلوم اشعاع دریافت کیں، جنہیں الجبرے کی روایت کے مطابق **X-rays** کا نام دیا۔ اسی طرح ریڈیم (Radium) سے از خود خارج ہونے والی اشعاع کے مطالعہ سے تاب کاری (**radioactivity**) کا عمل دریافت ہوا، ضیا برقی اثر (photoelectric effect) وغیرہ کی دریافت کے بعد پلانک نے کوانٹمی نظریہ (**Quantum Theory**) اور آئین سٹائین نے نظریۂ اضافیت (**Theory of Relativity**) پیش کیا۔ان دریافتوں اور ان نظریات کو پیش کرنے کے لیے جرمن زبان کا سہارا لیا گیا۔ جرمن زبان کی بعض اصطلاحات کو جوں کا توں انگریزی اور دوسری زبانوں نے مستعار لیا۔مثال کے طور پر ایٹمی ذرّات (الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون) کے مانند روشنی کی اکائی کو فوٹون (**Photon**) کہا گیا۔اسی طرح جرمن زبان میں روشنی کی توضیح کے لیے روشنی کے ''پیکٹ'' یا ''بنڈل'' کی شکل میں خارج ہونے کے عمل کو کوانٹم تھیوری میں Quantum of Light کہا گیا۔انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ''کوانٹم'' کا لفظ رائج ہوگیا۔

یہ عمل انسانی تاریخ میں پہلی بار نہیں ہوا۔اس سے پہلے جب یورپ نے عربی سے سائنسی علوم کا خزانہ حاصل کیا تو کئی عربی اصطلاحات کو جوں کا توں یا معمولی تصرف کے ساتھ اپنایا۔ چنانچہ آنکھ کے ڈیلے کو **cornea** کہا گیا۔عربی میں قرنیہ ابھار کو کہتے ہیں۔ یورپی زبانوں میں **cotton** عربی کے قطن سے لیا گیا ہے۔اسی طرح

ایک خاص شکل کے شیشے کو اس کی شکل کی مناسبت سے عدسہ کہا گیا، جو عربی میں مسور کے دانے کو کہا جاتا ہے۔ لاطینی میں مسور کو lintle کہا جاتا ہے اس لیے عدسے کا ترجمہ lens کیا گیا۔

فلکیات کی اکثر اصطلاحات بعینہٖ عربی سے لی گئیں یا ان کا ترجمہ کیا گیا۔ مثلاً **Rigel** (رجل)، **Famalhout** (فم الہوت)، **Lady in Chair** (ذات الکرسی)، وغیرہ۔ تاہم ازمنۂ وسطیٰ کے مقابلے میں بیسویں صدی میں ترجمے کا کام زیادہ کٹھن ہو گیا اس لیے کہ نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات اس قدر تیزی کے ساتھ سامنے آنا شروع ہوئیں کہ ہر اصطلاح کا ترجمہ کرنا ایک طویل اور نہ ختم ہونے والا عمل بن گیا۔ پھر ذرائع ابلاغ و مواصلات کی ترقی کے باعث قوموں، ملکوں اور زبانوں میں فاصلے کم سے کم تر ہوتے چلے گئے۔ اس لیے بہت سی اصطلاحات عالمگیر ہو گئی ہیں۔

سائنس دان بھی عام لوگوں کی مانند سہل پسند واقع ہوئے ہیں لہٰذا ایسی اصطلاحات وضع کرتے رہتے ہیں جن میں ایک جملہ پنہاں ہو۔ مثال کے طور پر **Zero Energy Thermo-nuclear Assembly** کے لیے **ZETA**؛

Radio Detection and Ranging کے لیے **RADAR** بنا لیا، چنانچہ **RADAR** اور **LASER** وغیرہ اصطلاحیں انگریزی میں تو پورے جملے کے مخفف (ACRONYM) ہیں مگر پوری دنیا میں بطور اصطلاح رائج ہیں، جس طرح ہم پاکستان میں **Water and Power Development Authority** کا مخفف **WAPDA** استعمال کرتے ہیں۔

ترجمے کی صورت میں کئی سوال سامنے آتے ہیں۔

☆ کیا ہم ہر اصطلاح کا ترجمہ کریں؟

☆ کیا اب ترجمہ ضروری ہے؟

☆ کیا اصطلاحات کے ترجمے کے بغیر اُن کا مفہوم واضح ہو سکتا ہے؟

ان سوالوں کا جواب ہر شخص اپنی فہم اور تجربے کی بنا پر دے گا۔ اردو میں لکھتے ہوئے ایک اور مسئلہ ریاضیاتی عبارت کا ہے۔ کیا ہم ریاضی کی علامتیں جوں کی توں استعمال کریں یا ان کا ترجمہ کریں؟ انگریزی علامات اردو رسم الخط کے حوالے سے استعمال کرنے میں کوئی دشواری تو نہ ہوگی؟ مساوات لکھنے کا انداز کیا ہو؟ انہیں اردو کے انداز میں دائیں سے بائیں لکھیں یا یورپی زبانوں کی طرح بائیں سے دائیں جانب؟ ان سوالوں کا جواب عباسی خلیفہ مامون الرشید کے قائم کردہ نویں صدی عیسوی کے **بیت الحکمۃ** کے عظیم مترجم حنین بن اسحٰق نے دیا۔ برصغیر ہندو پاک میں انیسویں اور بیسویں صدی میں ماہرین نے اردو میں تراجم کے لیے حنین بن اسحٰق کے مرتب کردہ اصولوں کو وسعت دی۔

اصطلاحات وضع کرنے کے اصول:

ترجمے کا کام عربوں کے لیے اور بعد میں یورپی ماہرین کے لیے بھی مشکل اور حوصلہ شکن رہا۔ چنانچہ

نویں صدی عیسوی میں حنین بن اسحٰق نے ترجمے کے سلسلے میں ذیل کے اصول مرتب کیے: (۱)

"(الف) یونانی اصطلاحات کے بیشتر مترادفات کے طور پر عربی کی اصطلاحیں وضع کی جائیں۔

(ب) بعض یونانی اصطلاحوں میں ایسی لفظی تبدیلی کر لی جائے جس سے وہ عربی اصطلاحیں معلوم ہوں، یعنی انہیں معرب بنا لیا جائے۔

(ج) بعض یونانی اصطلاحوں کو بجنسہٖ عربی میں استعمال کیا جائے۔"

جیسا اوپر دی گئی مثالوں سے واضح ہوگا، یورپی زبانوں میں بھی اصطلاح سازی تقریباً انہی خطوط پر ہوئی۔ اب ہم اردو میں اصطلاحات سازی کے اصولوں کی جانب آتے ہیں۔

اردو میں وضع اصطلاحات کا عمل تقریباً ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، جامعۂ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، جامعہ پنجاب نے آزادی سے پہلے کام کیا۔ آزادی کے بعد جامعہ کراچی، اردو سائنس بورڈ لاہور، سائنٹفک سوسائٹی کراچی، مقتدرہ قومی زبان اور دوسرے ادارے اس مہم میں شامل ہو گئے اور اپنے اپنے طور پر یہ کام کرتے رہے ہیں۔ میجر آفتاب حسن کی سربراہی میں سائنٹفک سوسائٹی پاکستان نے علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کی روایت کو جاری رکھتے ہوئے درجِ ذیل اصول وضع کیے: (۲)

(۱) بین الاقوامی اصطلاحات کا یعنی ان اصطلاحات کا جو دنیا کی تمام زبانوں میں بجنسہٖ استعمال ہو رہی ہیں، ترجمہ نہ کیا جائے۔

مثلاً کیمیا میں عناصر کی علامتوں کو حسب حال رہنے دیا جائے، یعنی آکسیجن کے لیے O، نائٹروجن کے لیے N اور یورینیم کے لیے U وغیرہ وغیرہ۔

حیوانیات میں **Order** (فصیلہ) **Genus** (جنس) اور **Species** (نوع) کے لاطینی ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جائے گا، مثلاً "معمولی مکھی" کا اصطلاحی لاطینی نام **Musca domestica** ہے۔ اردو میں بھی، اس کو "مسکا ڈومیسٹیکا" ہی کہیں گے۔ اسی طرح گلاب کے پھول کو "روزا انڈیکا" اور نیم کے درخت کو "ابزاڈاکٹکا انڈیکا" کہا جائے گا۔

(۲) اشیاء اور ادویات کے ناموں کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً پنسلین، کلورومائی سٹین، اسٹی رول وغیرہ۔ اسی طرح کیمیا میں جن عناصر کے نام پہلے سے موجود ہیں وہ قائم رہیں۔ جدید عناصر کے ناموں کا ترجمہ نہ کیا جائے اور مرکبات کے انگریزی نام بھی برقرار رکھے جائیں۔

(۳) جن مرکبات کے نام پہلے سے موجود ہیں وہ بھی برقرار رہیں گے۔ مثلاً **Iron** کے لیے اردو میں لوہا قائم رہے گا لیکن **"Ferrous Sulphate"** کو اردو میں "فیرس سلفیٹ" اور عام زبان میں سبز توتیا کہیں گے۔ **Sodium** کو اردو میں سوڈیم کہیں گے اور **Sodium Chloride** کو اصطلاحاً سوڈیم کلورائڈ لیکن عام

زبان میں معمولی نمک کہیں گے۔

(۴) [illegible] مثلاً

$+, -, \times, =, \pm, \geq, \neq, \approx, >, <, \infty, \Xi, \partial, \Delta, \Sigma, \int, \pi$

وغیرہ۔ یہ بین الاقوامی چیزیں ہیں یہ اسی طرح رہیں گی۔ بقیہ تمام اصطلاحات کا ترجمہ کیا جائے گا جس میں اس کا خیال رکھا جائے گا کہ:

(الف) زبان اورفن کے لحاظ سے موزوں ہو، مختصر ہو اور حتی الوسع اپنے معنی کے کل یا جزو کی اس میں نمائندگی ہو۔

(ب) اصطلاح سازی میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور ان تمام زبانوں سے مدد لی جائے جو ہماری زبان کے جزو ہیں۔

(ج) حسبِ ضرورت ان بیرونی الفاظ کو بھی استعمال کیا جائے جو اردو زبان کے مزاج کے مطابق ہیں۔

(د) جو اصطلاحیں قدیم سے رائج ہیں، مفید اور موزوں ہوں تو برقرار رہیں۔

(ہ) اسماء سے افعال بلا تکلف بنائے جائیں۔

(و) ضرورت ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی کا جوڑ اور سابقے اور لاحقے لگائے جائیں۔

(ز) اردو اصطلاح سازی میں ایک اصول بن گیا ہے کہ "meter" کے لیے ''**پیما**''، "Scope" کے لیے ''**نما**''، "Graph" کے لیے ''**نگار**''، "Logy" کے لیے ''**یات**''، "Oid" کے لیے ''**سا**''، "Ferous" کے لیے ''**بردار**''، "Genous" کے لیے ''**زا**'' وغیرہ استعمال ہوگا، اس کی پابندی کی جائے۔''

اگر ہم اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرتے تو انگریزی میں موجود علوم تک صرف اُن لوگوں کی رسائی ممکن ہوگی جو اس زبان سے واقف ہیں۔ ایک معلم کی حیثیت سے میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ہمارے طلبہ محض اجنبی زبان کی اصطلاحات کی وجہ سے بعض مضامین میں تفہیم میں ناکام رہتے ہیں۔ اس طرح سائنس کی تعلیم عام نہ ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک اجنبی زبان میں کسی علم کا حصول اُس علم کی ترقی میں کس حد تک مدد دے سکتا ہے؟

جہاں تک تفہیم اور تعلیم کی بات ہے، ہمارے ملک میں سائنس اور دیگر علوم کی تدریس انگریزی کے ذریعے سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ ہم سوچتے اپنی مادری زبان میں ہیں، انگریزی میں پڑھنے کے لیے ہم فوراً اپنی مادری یا قومی زبان میں ترجمہ کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کوشش بھی نہیں کی جاتی اور انگریزی زبان کے جملے ذہن نشین کر لیے جاتے ہیں۔ اس صورت میں بغیر سمجھے ہوئے پڑھا جاتا ہے۔ ایسی تدریس رٹا

لگانے تک محدود ہوتی ہے۔ اس طرح ڈگری تو مل جاتی ہے مگر اکتسابِ علم نہیں ہوتا۔

ماہرینِ تعلیم کے مطابق کسی ماحول میں مروجہ زبان کے ذریعے سے تعلیم ممکن ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم سائنس کی تدریس اردو، سندھی، پنجابی، سرائیکی یا پشتو میں کرتے ہیں تو ترجمے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے کہ ہماری قومی زبانیں جذبات کے اظہار کے لیے اور ثقافتی مقاصد کے لیے تو بہت ترقی یافتہ ہیں، مگر چونکہ ہمارے ماحول میں صنعت اور سائنس میں تخلیق و ترقی کے راستے ابھی تک نہیں کھلے، اس لیے فنی اور سائنسی اظہارِ خیال کے لیے ہمیں غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ان اصطلاحات کو ہم کس طرح استعمال کریں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ یہاں پر اُن کوششوں کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم دیتا ہے جو برِصغیر میں اس ضمن میں کی گئی ہیں۔

۱۔ حیدرآباد دکن میں اکثر درسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اس ترجمے کے سلسلے میں اردو میں اصطلاحات سازی بھی کی گئی۔ سائنس، میڈیکل اور انجینئری کی اعلیٰ تعلیم اردو ہی میں دی جاتی رہی۔ آزادی کے بعد اس کام میں تعطل پیدا ہو گیا۔

۲۔ پاکستان بننے سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ایما پر ایس ای کالج بہاول پور کے پروفیسر اور دانشور، ڈاکٹر شجاع ناموس نے اردو، ہندی اور گورمکھی زبانوں میں اصطلاحات کی فرہنگ تیار کی۔[۳]

۳۔ پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر شیخ منہاج الدین نے لاہور سے ''**قاموس اصطلاحات**'' کے نام سے ایک وقیع لغات مرتب کی، جس میں سائنس، فلسفہ، عمرانیات اور ٹیکنیکل اصطلاحات کے اردو مترادفات ہیں۔

۴۔ پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ ہائے تصنیف و تالیف و ترجمہ، زرعی یونیورسٹی لائل پور (اب فیصل آباد) اور محکمہ زراعت کے توسیعی پروگرام کے تحت اردو میں متعدد موضوعات پر اصطلاحات سازی کی گئی اور لٹریچر تیار کیا گیا۔

۵۔ مقتدرہ قومی زبان نے مختلف موضوعات پر اصطلاحات سازی اور اردو میں کتب شائع کیں، اس ادارے کی ''**قومی انگریزی اردو ڈکشنری**''، مولوی عبدالحق کی ڈکشنری کے بعد ایک بہت بڑی پیش رفت ہے۔ اس کے علاوہ مائکروسافٹ کے تعاون سے اردو میں ونڈوز، اور مشینی ترجمے پر بھی کام شروع ہے۔

۶۔ اردو سائنس بورڈ (سابق مرکزی اردو بورڈ) نے قابلِ قدر کام کیا۔ علاوہ دوسرے موضوعات کے، بی ایس سی کی سطح تک کی سائنسی و فنی کتابیں شائع کیں۔

۷۔ آزادی سے پہلے پنجاب میں آٹھویں جماعت تک سائنس اور ریاضی کی تدریس اردو زبان (ہندوؤں کے لیے ہندی) میں ہوتی۔ اُس وقت اردو کی اصطلاحات استعمال کی جاتیں، ریاضیاتی مساوات اردو تر قیمات کے ساتھ دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتیں آزادی کے بعد ثانوی سطح پر اردو میں سائنس کی تدریس شروع کی گئی تو خواجہ دل محمد کی ریاضی کی کتابیں اور دیگر مصنفین کی سائنس کی کتابیں اسی انداز میں مرتب

ہوئیں۔

سائنس کی درسی کتب میں سہل انگاری کے سبب نہ صرف انگریزی اصطلاحات، بلکہ دوسرے الفاظ بھی اردو رسم الخط میں درج کیے جانے لگے چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

ان ایکوالٹیاں (نامساوات)	inequalities
میگنٹ (مقناطیس)	magnet
فیلڈ (میدان)	field
رداس (نصف قطر)	radius

اسی پر بس نہ ہوئی بعد میں تو مینڈک کے لیے ''فراگ'' frog اور اس کی جمع frogs ''فراگ ز''۔ خلیے کی بجائے ''سیل'' cell اور اس کی جمع ''سیل ز''، وغیرہ۔ انتہا یہ ہوئی کہ چوتھی جماعت کی سائنس کی کتاب، جسے میٹرک پاس پرائمری ٹیچر پڑھاتا ہے، میں ''انورٹی بریٹ'' invertebbrate کی اصطلاح درج تھی۔

یہاں ان اصطلاحات کی مخالفت نہیں ہورہی بلکہ ان کے بے جا استعمال کی بات ہورہی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ابتدائی جماعتوں میں بچے پر اصطلاحات کا بوجھ ڈالا جائے۔ بہت سے ایسے موضوعات ہیں جنہیں اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر سادہ الفاظ میں واضح کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب لکھنے والے کو زبان اور موضوع دونوں پر عبور حاصل ہو۔ حالت یہ ہے کہ بعض ''دانشور'' محض اصطلاحات کے رٹ لینے ہی کو سائنس کی تدریس سمجھتے ہیں۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے، میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ملک میں دو مکاتب فکر تھے۔ دونوں اردو کی ترویج میں مخلص تھے۔ ایک میجر آفتاب حسن کی سربراہی میں کراچی یونیورسٹی میں کام کررہا تھا، دوسرا اشفاق احمد خان کی قیادت میں اردو سائنس بورڈ لاہور میں کام کررہا تھا۔ ہر دو اصحاب صاحب الرّائے تھے اور انہوں نے قابلِ قدر کام کیا۔ میجر صاحب کی زیرنگرانی ہونے والے کام میں ریاضیاتی ترقیمات اور بین الاقوامی اصطلاحات کے علاوہ کوئی انگریزی حرف استعمال نہ ہوتا۔ ریاضیاتی مساوات بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتیں۔ جب کہ لاہور کے گروپ نے انگریزی اصطلاحات جوں کی توں استعمال کرنا شروع کردیں اور ریاضی کی مساوات بھی انگریزی رسم الخط میں بائیں سے دائیں لکھیں۔ نمونے کے طور پر ضمیمے میں ایک ایک صفحے کا عکس ہر دو قسم کی کتابوں سے پیش کیا جارہا ہے۔

ان دونوں صفحات کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کراچی کی کتاب ''**طبیعی کیمیا**'' میں اردو اصطلاحات کے علاوہ ریاضیاتی ترقیمات بھی اردو ہی میں دی گئی ہیں، اور ریاضیاتی مساوات دائیں سے بائیں جانب لکھی گئی ہیں۔ البتہ ان مساوات کے انگریزی مترادفات فٹ نوٹ میں دیے گئے ہیں۔ کتاب کا نام بھی ''**اردو**'' ہی میں دیا گیا ہے۔ اگر یہ کتاب مرکزی اردو بورڈ سے شائع ہوتی تو اس کا عنوان ''**فزیکل کیمسٹری**'' ہوتا۔

مرکزی اردو بورڈ کی کتاب ''**مکینکس**'' میں جملہ مساوات انگریزی رسم الخط میں اور بائیں سے دائیں جانب درج کی گئی ہیں۔ پورا صفحہ کسی انگریزی کتاب کا حصہ معلوم دیتا ہے، یہی صورت حال صفحے پر دی گئی شکل کی بھی ہے۔ اگر یہ کتاب کراچی سے شائع ہوتی تو اس کا عنوان ''**میکانیات**'' ہوتا!

عظمت علی خان نے کراچی سے پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے رسالے ''**کاروانِ سائنس**'' میں ان دو انتہاؤں کے بین بین راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ اس رسالے میں انہوں نے ہر دو مکاتب فکر کی نگارشات شائع کیں۔ تاہم اردو میں تدریس کا عمل ایک بار پھر رک گیا اور ''**روشن خیال پاکستان**'' میں انگریزی کا پرچار اس قدر شدومد سے کیا جانے لگا کہ ساری قوم تعلیم کو چھوڑ کر انگریزی کے نعرے کے پیچھے لگ گئی ہے۔ جیسے دنیا میں فقط منہ ٹیڑھا کرکے غلط سلط انگریزی بولنا ہی انسانیت کی معراج ہے! راولپنڈی کے ایک مشنری سکول کی صدر معلّمہ نے ایک بار راقم الحروف سے کہا ''آپ لوگ ذریعۂ تعلیم کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟ اگر آپ فیصلہ کر لیں تو ہم پنجابی میں بھی تعلیم دینے کے لیے تیار ہیں!''

اگر اب ہم اردو، اسلامیات وغیرہ کی تدریس میں انگریزی زبان میں تحقیقی مقالے لکھنے پر اصرار کریں تو بیچارے طلبہ کی مشکل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کتابیات:

(۱) خادم علی ہاشمی ''**حکمائے اسلام**'' زیرِ طبع، ۲۰۱۰ء

(۲) آفتاب حسن، ''**جریدہ نمبر ۴**''، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، سنِ اشاعت ندارد۔

(۳) شجاع ناموسؔ، 1949ء، در **ڈاکٹر شجاع ناموسؔ، شخصیت و فن**، مرتبہ خادم علی ہاشمی، بہاول پور: اردو اکیڈمی، ۲۰۱۰ء

(۴) سیموئیل گلاسٹون، ''**طبیعی کیمیا**'' اردو ترجمہ مرتبہ آفتاب حسن، جلد اول، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۷۰ء۔

(۵) ترمذی، سید معصوم علی، ''**مکینکس**'' مرکزی اردو بورڈ (اب اردو سائنس بورڈ) لاہور، ۱۹۷۳ء

ضمیمہ جات

ضمیمہ الف: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی کی شائع کردہ ''**طبیعی کیمیا**'' کے ایک صفحے کا عکس (۴)

گیسی حالت ۳۸۹

(۴۔۲)*

(۴۔۳)†

(۲۔۲) اور (۳۔۲) سے ق کو ساقط کرنے ہونے اور سہل بنانے کے لیے لاحقے اور جسمی اشتقاق کو چھوڑتے ہوئے ذیل کی مساوات حاصل ہوتی ہے

(۴۔۴)**

جہاں ق کی ، جو سالمے کا تقسیمی تفاعل کہلاتا ہے ، تعریف یوں ہوتی ہے کہ

(۴۔۵)††

اس کو سالمے کی توانائی کی تمام حالتوں پر جمع کیا گیا۔

کل توانائی کے لیے سالمی حراری گنجائش، مساوات (۴۔۴) کا مستقل حجم پر، تپش کے لحاظ سے، تفرق کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے

(۴۔۶)‡

(۴۔۶)‡‡

جہاں ق' ، $\frac{د ق}{د (۱/ت)}$ کو اور ق'' ، $\frac{د^۲ ق}{د (۱/ت)^۲}$ کو ظاہر کرتا ہے۔

تقسیمی تفاعل کی تحسیب میں مستعمل توانائی قدر کی کیتیں، زیادہ صحیح الفاظ میں، سالمے کی ہر کوانٹم حالت میں کل توانائیاں ہیں۔ اگر توانائی کی مختلف اقسام کے درمیان کوئی باہمی تعامل نہیں ہو رہا ہے تو اس طرح ہر حالت میں کل توانائی انتقالی اور داخلی (یعنی گردشی، ارتعاشی اور برقیاتی) توانائی کا مجموعہ ہے۔ تب مکمل تقسیمی تفاعل ق، آزادی کے

---

* $E = 0 p_0 N_0 + \epsilon_1 p_1 N_0 e^{-\epsilon_1/RT} + \epsilon_2 p_2 N_0 e^{-\epsilon_2/RT} + \dots$

† $= N_0 \sum_{i=0}^{\infty} \epsilon_i p_i e^{-\epsilon_i/RT}$

** $E = \frac{N \sum \epsilon_i p_i e^{-\epsilon_i/RT}}{\sum p_i e^{-\epsilon_i/RT}} = RT^2 \frac{d \ln Q}{dT}$

†† $Q = \sum p_i e^{-\epsilon_i/RT}$

‡ $C_V = \left(\frac{\partial E}{\partial T}\right)_V = \frac{\partial}{\partial T}\left[RT^2\left(\frac{d \ln Q}{dT}\right)\right]_V$

‡‡ $= \frac{R}{T^2}\left[\frac{Q''}{Q} - \left(\frac{Q'}{Q}\right)^2\right]_V$

ضمیمہ ب: مرکزی اردو بورڈ (اب اردو سائنس بورڈ) کی شائع کردہ ''**مکینکس**'' کے ایک صفحے کا عکس (۵)

(Fig. 7·8)

$$\Omega = \frac{\Delta\phi}{\Delta t}$$

$$= \frac{\Delta J}{R} \times \frac{1}{\Delta t} = \frac{1}{R} \cdot \frac{\Delta J}{\Delta t}$$

$$= \frac{1}{J \sin\theta} \times \frac{\Delta J}{\Delta t}$$

ہم جانتے ہیں کہ

$$\frac{\Delta J}{\Delta t} = r \times F$$

یا

$$\frac{\Delta J}{\Delta t} = Fr \sin\theta = Mg\, r \sin\theta$$

شیخ محبوب ثاقبؔ (اودگیر)

مخدوم کی اہم نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

مخدوم محی الدین انسانیت کے علم بردار اور زندگی سے محبت کرنے والے اس شاعر کا نام ہے جس نے اپنی تمام شعری کائنات کو محبت اور محنت کے نام معنون کیا ہے۔ جس کی ہمہ جہت شخصیت اور رومان پرور انقلاب انگیز شاعری پر ہزار زاویے سے روشنی ڈالی جاچکی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مگر تشنگی پھر بھی باقی ہے۔ گزشتہ سال مخدوم کی صد سالہ تقاریب کا اہتمام بڑے جوش و جذبے اور عقیدت و احترام سے کیا گیا۔ مخدوم ۸ فروری ۱۹۰۸ء کو اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے اور ۲۵ اگسٹ ۱۹۶۹ء کو دہلی میں اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کی اس ۶۱ برس کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شاعر مخدوم نے کل ۳۶ سال اس جہاں میں گزارے۔ کیوں کہ ان کی پہلی شعری تخلیق نظم 'طور' ہے جو ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آئی۔ مخدوم کے مجموعے کلام 'بساط رقص' کے دوسرے اڈیشن میں کل ۸۶ نظمیں '۲۱ غزلیں اور ایک قطعہ شامل ہیں۔ ان ۸۶ نظموں میں، ۵۸ روایتی یا پابند نظمیں ہیں اور ۲۸ آزاد نظمیں، مخدوم کی کوئی بھی نظم معریٰ نظم کی ہیئت میں نہیں ہے۔ مخدوم کی روایتی نظموں کے مقابلے میں آزاد نظمیں ان کے فن وفکر کی بلندی پر نظر آتی ہیں۔ اس لئے کم ترین نے اپنے انتخاب میں ان کی تین اہم آزاد نظموں کو شامل کیا ہے۔ (۱) اندھیرا (۲) چارہ گر (۳) چاند تاروں کا بن، مخدوم کی یہ وہ نظمیں ہیں جن میں بلا کا ترنم اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ ان میں اوایت اور جدت کا امتزاج ہے۔ مخدوم نظم میں ہیئت کے نئے تجربے کے حامی تو تھے لیکن روایت کا دامن یکسر ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کی آزاد نظموں میں ماضی کے گھسے پٹے پیمانوں کی جگہ جدت کے نئے پیمانے نظر آتے ہیں۔ مخدوم اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''ہر نیا تجربہ کرتے وقت اس بات کی احتیاط برتنی چاہئے کہ ماضی کے گھسے پٹے پیمانوں کی جگہ کون سے نئے پیمانے پیش کریں تاکہ ہمارے سننے اور پڑھنے والے عوام ''نئی چیز'' کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

مخدوم روایت اور جدت کی شیرینی سے بہ خوبی واقف ہیں اور اس کی حمایت میں لکھتے ہیں:

''میں بلا وزن کی نظمیں نہیں لکھ سکتا کیوں کہ میرے شعروں کی تخلیق موسیقی سے ہوتی ہے اور دل کی دھڑکن ہی میرے میٹر کا وزن بن جاتی ہے۔'' [انٹرویو امیر عارفی، پندرہ روزہ ''وسیلہ'' کڑپہ، اکتوبر ۲۰۰۸ء]

مخدوم کی پہلی آزاد نظم 'اندھیرا' ہے۔ یہ نظم مخدوم نے اس وقت لکھی تھی جب روس پر جرمنی نے حملہ کیا تھا۔ انسانیت کا قافلہ نئے موڑ پر آچکا تھا۔ عوامی جنگ کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ سجاد ظہیر کے سوال کے جواب میں خود مخدوم نے کہا تھا یہ نظم ۱۹۴۰ء کے آس پاس لکھی گئی۔ خاص بات یہ ہے کہ کلاس روم میں طلبا کو درس دیتے ہوئے اچانک لکھی گئی۔ [ماہ نامہ حیات فروری ۲۰۰۸ء، صفحہ ۳۳]

نظم 'اندھیرا' میں مخدوم نے مختلف علامتوں کے ذریعے فسطائیت اور بربریت کا پردہ فاش کیا ہے۔ نظم کا عنوان 'اندھیرا' خود ایک استعارہ ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا استعارہ ہے۔ مخدوم نے سرمایہ دارانہ نظام کو اندھیرا سے تعبیر کیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں انھوں نے فسطائیت کے ہاتھوں پھیلی ویرانی، تباہی و بربادی اور سرمایہ دارانہ نظام کے جور و ستم، وحشت و بربریت کے ہاتھوں ہوئے انسانیت سوز حادثات کی خوف ناک تصویر کھینچی ہے:

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اجلے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے، یہی ان کا کفن

ساری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اس اندھیرے میں ساری دنیا کے محنت کش مجبور عوام سمٹتے جا رہے ہیں۔ اندھیری رات کا آسماں گداگروں کا کٹورا ہے، اس میں چمکتے ہوئے تارے بھیک میں مانگے ہوئے سکے ہیں۔ اگلے بند میں مخدوم نے عوم میں بیداری کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے لفظوں سے جنگ اور ظلم و استبداد کی بھیانک تصویر پیش کی ہے:

اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمین گاہ
'وہ تہذیب کے زخم'
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہات کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک

سرد ہوا

اس حصے میں مخدوم نے منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ظلم و جبر کی انتہاء ہوچکی ہے۔چاروں طرف جاں کنی کا عالم ہے۔انسانی تہذیب زخمی ہوچکی ہے۔اس کے زخموں سے لہو ٹپک رہا ہے۔اس کے بعد جنگ کے لوازمات ہیں۔خندقیں،باڑھ کے تار،باڑ کے تاروں میں الجھے ہوئے جسم،اور الجھے ہوئے انسانوں کے جسموں پر بیٹھے ہوئے گدھ۔۔۔یہ تمام باتیں جنگ کے ہولناک منظر کو پیش کرتی ہیں۔مخدوم نے یہاں بھی علامتیں استعمال کی ہیں۔باڑھ کے تار سرحدوں کی علامت ہے،جہاں ملک تقسیم ہوتے ہیں۔گدھ مردار کھانے والا پرندہ ہے جو مردار کھانے والوں کی علامت ہے۔تڑختے سر۔۔۔ادھوری لاشوں اور انسانی اعضاء کے بکھرنے کی علامت ہے۔اس بھیانک تصویر کے بعد مخدوم قاری کو محسوسات کے دائرے میں داقل کرتے ہیں ۔

لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک

سرد ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہاں سرد ہوا سے مراد انسانوں کی سرد مہری ہے۔اس سرد ہوا کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔جو ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک گزر جاتی ہے۔۔۔۔یہ سردی نوحہ وفریاد کررہی ہے۔انسانیت پر لگے داغوں کا واویلا مچارہی ہے۔رات کے اندھیرے میں کسی ماں،کسی بچے کے رونے کی صدا آرہی ہے۔کیوں کہ ماؤں سے بچے ،اور بچوں سے ان کی مائیں چھنی جارہی ہیں۔اس خوف ناک منظر کو دیکھ کر معصوم تارے بھی ماتم کناں ہیں۔انسان کے ظلم وبربریت پر قدرت بھی ماتم کررہی ہے۔

نظم کے آخر میں مصرعے کو دہرا کر مخدوم نے اس وحشت اور بربریت کے الم ناک منظر کے تاثر کو اور بھی گہرا کیا ہے۔۔۔۔۔

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ نہیں

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ نہیں

لیکن آخری مصرعے سے پہلے ایک نئی صبح کی بشارت بھی دیتے ہیں۔مخدوم اس اندھیرے کو دائمی نہیں سمجھتے۔وہ یقین دہانی کرتے ہیں کہ اس اندھیری رات کا سورج ضرور نکلے گا۔وہ خوبصورت تصویر کشی کے ذریعے یہ حوصلہ افزاء اطلاع دیتے ہیں کہ:

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم

صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

یہاں خورشید درخشاں سے مراد سرخ سویرا ہے۔مطلب آزادی کی نئی صبح ہے۔اس نظم میں مخدوم نے جنگ کے خلاف ابدی احتجاج کی صدا بلند کی ہے۔یہاں مخدوم کسی خاص نسل وقوم سے مخاطب نہیں بلکہ ایک عالمگیر

انسانیت کے علم بردار بن جاتے ہیں۔بقول سجاد ظہیر:

''یہ ایک بڑی انقلابی نظم تھی،اس کے استعارے،وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ،وہ تہذیب کے زخم،اور چاند تاروں کے ماتم کی صدا،آزردہ ستاروں کا ہجوم،اور پھر آخری مصرعہ ۔ رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ نہیں یہ نظم نہیں ایک تراشیدہ فنی نگینہ ہے۔نئی کیف آور،چونکا دینے والی،ایک مکمل تعمیر،جتنی خوبصورت اتنی ہی پر معنی ،جتنی جدید اتنی ہی ہماری بہترین روایات میں پیوست،انقلابی شعور وحرکت اور عالمی افق کے سرخ سویرا کے رنگ لئے ہوئے اس کے ساتھ ہم آہنگ۔۔۔۔۔

مخدوم کی دوسری اہم نظم ''چارہ گر'' ہے۔جوان کے دوسرے شعری مجموعے 'گل تر' کی بہترین نظم ہے۔یہ نظم ۱۹۵۶ء میں لکھی گئی۔اس کا موضوع عشق ہے۔نظم کا عنوان ''چارہ گر'' اپنے اندر بے پناہ معنوی ابعاد رکھتا ہے۔یہ استعاراتی نظم ہے۔لفظ 'چارہ گر' ایک استعاراتی ترکیب ہے۔یہ ان لوگوں کا استعارہ ہے۔جو اصلاح معاشرہ کے ڈھونگی ٹھیکیدار ہیں۔یہ ان لوگوں کا بھی استعارہ ہے اندھی مذہبیت کو معاشرے کو سدھارنے کا آلہ سمجھتے ہیں۔نظم کا عنوان نظم میں دو جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اپنے سیاق وسباق میں طنزیہ پہلو رکھتا ہے۔شاعر کی نظر میں چارہ گر وہ ہے جو شاعر کے نظریہ یا دستور حیات کے خلاف سماج کو سدھارنے کا ایسا دستور رکھتا ہے جو شاعر کی نگاہ میں ایک دقیانوسی دستور حیات ہے۔

نظم کی ابتداء میں چھوٹے چھوٹے مقفیٰ اور غیر مقفیٰ مصرعوں کے ذریعے شاعر ایک اطلاع کے ذریعے قاری کی توجہ کو فوراً اپنی گرفت میں لیتا ہے۔نظم کے اس حصے میں دو پیار کرنے والوں کے عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہوجانے کی اطلاع ہے۔یہ واقعہ ایک ایسے ماحول یا ایسی جگہ تشکیل پاتا ہے جو میکدے سے ذرا دوری پر ہے۔مخدوم نے اس حادثے کی لیے جو جگہ منتخب کی ہے،وہ مندر،مسجد سے تو دور ہے ہی لیکن میکدہ جیسے ٹھکانے سے بھی دور ہے۔میکدہ جہاں سب مذہب وملت یا ذات پات کا فرق مٹ جاتا ہے۔اس سے بھی ذرا دور یہ واقعہ پیش آتا ہے۔نظم کے ابتدائی مصرعوں پر ہی ذرا غور کریں تو مخدوم کا نظریہء حیات واضح ہوجاتا ہے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے

میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن

پیار کی آگ میں جل گئے

درج بالا چار مصرعوں سے مخدوم نہ صرف محبت کی خواب گیں کیفیت کی سیر کراتے ہیں بلکہ وہ محبت کے خطرناک اور ہولناک انجام سے بھی واقف کراتے ہیں کہ ان دونوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبت کا انجام فنا ہے

یعنی سب کچھ ان کی رضامندی سے ہوا کیوں محبت ان کی سرشت تھی۔ان کی تقدیر تھی۔محبت کے علاوہ وہ کچھ حاصل

بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔اس لیے محبت کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیے ۔مخدوم نظم کے دوسرے حصے میں اس کیفیت کو اور آگے بڑھاتے ہیں ۔

پیار حرفِ وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا

ان تین مختصر مصرعوں میں قافیہ کے اہتمام نے بلا کی غنائیت پیدا کر دی ہے۔ان قوافی کے استعمال کی وجہ سے نظم کے عشقیہ ماحول میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔نظم کے تیسرے حصے میں عشق کے نقطہء کمال 'وصل' کی وہ والہانہ کیفیت بیان کی گئی جس میں جدائی ، دوری، یا ہجر و فراق، یاس و حرماں ہر احساس مٹ جاتا ہے۔جسکی وجہ سے عشقیہ ماحول میں شدت کا اضافہ ہوتا ہے ۔

دو بدن ـــــــــــــــــــــــــــ
اوس میں بھیگتے ، چاندنی میں نہاتے
جیسے دو تازہ رَو ، تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صَرفِ ماتم ہوئی ـــــــــــــ
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
اک پل کے لئے رک گئی ـــــــ

چوتھے حصے میں شاعر کہتا ہے کہ محبت کا لمحہ ، محبت کے جذبے کی طرح تعینات اور حد بندیوں سے مستثنیٰ ہے۔اس کو اچھے برے، یا نور و ظلمات میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک نا قابل تقسیم اکائی ہے۔ یہاں مندر، مسجد، اور میکدوں میں رہنے والوں نے بھی صرف دیکھنے کا کام کیا ہے۔ان محبت کرنے والوں کی لئے کچھ نہیں کیا ۔

ہم نے دیکھا انھیں
دن اور رات میں
نور اور ظلمات میں
مسجدوں کے میناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدوں کی دراڑوں نے دیکھا انھیں

نظم کے آخر حصے میں شاعر محبت کی ابدیت اور ہمہ گیری کو اجاگر کرنے کے بعد ''چارہ گر'' کا گریباں پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے ایک بڑا نازک اور گھمبیر سوال کرتا ہے ۔

از ازل تا ابد

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخہء کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

بظاہر نظم یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن قاری کے ذہن میں پھر شروع ہو جاتی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہاں چارہ گر آخر ہے کون؟ چارہ گر وقت بھی ہو سکتا ہے۔ سیاسی یا سماجی رہبر بھی اور پیر و مرشد بھی۔مخدوم چارہ گر سے پوچھتے ہیں جہاں تو ہر مسئلے کا حل رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے یہ بتا کہ پیار و محبت اور عشق جیسے مسئلے کا حل بھی تیرے پاس ہے۔جواب میں خاموشی ہے۔آخر کار خاموشی کو خود توڑتے ہوئے افسوس کے ساتھ کہتا ہے 'اس کا علاج کسی بھی معاشرے کے نظام حیات میں نہیں ہے۔افسوس کے دو بدن ہمیشہ پیار کی آگ میں جلتے رہے ہیں اور جلتے رہیں گے۔آ کر میں سوالیہ نشان لگا کر مخدوم نے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ خود انجام کا پتہ لگا لے۔یہاں قاری سوچتا ہے کہ اگر چہ کسی کے پاس محبت کا نسخہء کیمیا نہیں ہے لیکن کسی کے پاس تو ہونا چاہیے۔دراصل مخدوم نے یہاں 'چارہ گر' کو ''بے چارہ'' کر دیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ صرف 'اشترا کی نظام حیات' ہی میں نسخہء کیمیائے محبت ہے۔نظم کے ختم پر قاری کے ذہن پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ڈاکٹر عائشہ نے کیا خوب کہا:

''اس نظم کا ایک شعر دوسرے سے منطقی ربط رکھتا ہے بلکہ ناخن اور گوشت کی طرح ملا ہوا ہے۔ یہ پیوستگی اتنی فنی اور منطقی انداز میں ہے جس سے احساسِ جمال کے ساتھ ساتھ ابلاغ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔''

[مخدوم پانچواں مینار، صفحہ ۱۰۰]

غرض مخدوم کی نظم محبت کی ناکامی کا اظہار اور ایک سیاسی و سماجی احساسِ فکر کی ترجمان ہے۔

مخدوم کی تیسری اہم نظم ''چاند تاروں کا بن'' اس نظم میں مخدوم کی تخلیقی کاوشیں بام عروج پر نظر آتی ہیں ۔نظم کے عنوان میں مخدوم نے ایک ذیلی سرخی لگائی ہے۔''آزادی سے پہلے، بعد اور آگے'' نظم کو اسی ترتیب میں پڑھیں گے ۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن

لیکن یہ قربانیاں کیا رنگ لائیں؟ آزادی ملی تو داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کی صورت میں ۔

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گیے
خاردار ِ الم بن گیے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا

آزادی کے بعد کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔جس میں خون کی ندیاں بہائی گئی اور مکر وفریب کے پتلے کچھ اماماں ِ قوم نے اپنی سانپ جیسی زہریلی پھنکار سے صبح کی روشنی کا خون پی لیا،لیکن کیا ہم اس انجام کو قبول کر لیں؟ مخدوم شکست ماننے والوں میں سے نہیں ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ رات کا اندھیرا ہی نہیں،اس کے پیچھے کچھ کچھ اجالا بھی ہے۔جس کی روشی میں آگے بڑھا جا سکتا ہے۔اس نظم تیسرے حصے میں وہ کہتے ہیں ۔

ہم دمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دل دار کی
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو!

نظم کا اختتام لفظ ’چلو‘ پر ہوتا ہے۔یعنی شاعر حرکت وعمل کی ترغیب دیتا ہے۔اس حصہء نظم میں ترنم ،صوت وآہنگ کمال پر نظر آتے ہیں ۔ساخت اور فنی تقاضوں اور لوازماتِ شعری کے اعتبار سے بھی یہ نظم زیادہ پختہ ہے۔مخدوم بڑے فن کار بھی ہیں اور حسن کار بھی۔غرض مخدوم کی ان تینوں نظموں کے مطالعہ کے بعد ایک حقیقت ضرور سامنے آتی ہیکہ مخدوم کی نظموں میں کہیں نہ کہیں رجائیت کا پہلو ضرور ملتا ہے۔مثلاً نظم اندھیرا کے آخری مصرعہ سے پہلے والے مصرعے دیکھیے ۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

نظم چارہ گر کے آخری مصرعوں میں بھی ایک لطیف رجائی پہلو نظر آتا ہے۔اور نظم چاند تاروں کا بن کے آخری مصرعوں میں بھی رجائیت صاف صاف جھلکتی ہے۔جس کی بنیاد پر مخدوم کو ترقی پسند شاعری رجائیت کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان (پشاور)

جرمنی کا ایک اردو رسالہ

میرے سامنے میرے ایک دوست حیدر قریشی کا ادبی رسالہ نمبر 15 ’’جدید ادب‘‘ رکھا ہے۔حیدر قریشی جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں رہتے ہیں‘ اردو کے بے مثال ادیب‘ شاعر‘ ماہیا نگار‘ مدبر‘ نقاد پتہ نہیں کیا کچھ ہیں‘ وہ میرے استاد پروفیسر ناصر کے بھانجے اور داماد ہیں‘ بس یوں سمجھیں ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔دفتر سے آتے ہیں تو اپنے کمرے کے کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھتے ہیں‘ چھ سات گھنٹے عام طور پر ادبی کام کرتے ہیں اور دفتر کی دوسرے دن چھٹی ہو تو ساری ساری رات جاگ کر کتابیں‘ رسالے‘ مضمون کمپیوٹر پر لکھتے اور بذریعہ کمپیوٹر ہی اپنی ویب سائٹ پر چڑھا کر ساری دنیا میں پھیلا دیتے ہیں۔

کام کے لحاظ سے وہ آدمی نہیں جن ہیں‘ جو لوگ کہتے ہیں کہ مصروف ہیں وقت نہیں ملتا، میں ان کو حیدر قریشی کی مثال دیتا ہوں جو جرمنی کی مصروف زندگی سے وقت چرا کر بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔خاکے‘ سفرنامے‘ کالم‘ مضمون‘ یادداشتیں‘ خودنوشت نجانے کیا لکھ چکے ہیں۔ان کا جو رسالہ آتا ہے پہلے سے بہتر اور ضخیم ہوتا ہے۔وہ کتابیں‘ رسالے بھارت سے چھپواتے ہیں اور وہیں سے اپنے دوستوں کے ذریعے اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں۔میں بیماری سے قبل اپنے آپ کو بڑا فعال ومتحرک وتیز آدمی سمجھتا تھا مگر حیدر قریشی کی علمی وادبی کارکردگی کو دیکھا تو ہار مان گیا۔

حیدر قریشی بلاشبہ یورپ وامریکہ میں اردو زبان وادب کے سب سے بڑے لکھاری سمجھے جا سکتے ہیں۔میں ان کو عالمی بابائے ادب (۱) کہتا ہوں‘ فرینکفرٹ میں ان کو اپنی آنکھوں سے ساری ساری رات کام کرتے دیکھا تو بقول غالب باور آیا ہے پانی کا ہوا ہو جانا۔جب سے میرے دل کا زور ٹوٹا ہے اور اندر باہر سے گھائل ہوا ہوں تب سے حیدر قریشی کے کارناموں پر رشک آنا بڑھ گیا ہے اور میں سمجھنے لگا کہ ان کے دل کا زور شیروں ہاتھیوں جتنا ہے۔اب جدید ادب کا شمارہ نمبر 15 آیا تو میں نے اپنی عالم بیزاری کے ہاتھوں تنگ آ کر حسب معمول ایک طرف رکھ دیا‘ میں عموماً رسالہ وکتاب کہیں سے بھی ملے فون پر رسید دیتا اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جب حیدر قریشی صاحب کا فون ملا تو آواز اس طرح ہشاش بشاش اور حوصلے جوانوں کی طرح بلند۔انہوں نے کہا رسالہ پڑھا ہے میں نے ہاں ہوں کر دی‘ انہوں نے اپنی گزشتہ سال دو سال کی بیماری قلب اور اپنی اہلیہ

مبارکہ کی زندگی وموت سے کشمکش کی جورودادسنائی تو میں نے سوچا ہر آدمی دکھ درد میں مبتلا ہے' کس کس کی داستان سنی جائے۔انہوں نے کہا میرے رسالے کے صفحات 225 تا238 پڑھ لیں آپ اپنی بیماری بھول جائیں گے۔

میں نے فون بند کر کے بادل ناخواستہ کتاب کا وہ حصہ پڑھا تو اپنی بیماری بھول گیا' بعد ایک مدت کے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر میرے گھر والے خوش اور حیران ہوئے' میں نے سب سے وہ مضمون پڑھوایا' اس دوران میں اپنی بیماری بھول گیا۔حیدر قریشی کے گھرانے پر بجلی کی طرح گرنے والی بیماریوں کا حال پڑھا تو یقین نہ آیا' حیدر قریشی کو گزشتہ برس خواب میں کسی نے آ کر بتایا کہ وہ 3 دسمبر 2009ء کو مر جائیں گے' حیدر وہمی آدمی نہیں مگر موت پھر موت ہے' حیدر نے میری طرح وصیت لکھی اور بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر ہو گیا۔خوش قسمتی سے وہ مہذب و مالدار ملک جرمنی میں تھا' جہاں اس کا اور گھر والوں کا ایسا علاج ہوا کہ حیدر پھر اٹھ کے چل پڑا' ان کی اہلیہ 13 برس سے بیمار ہے اور علاج کروا رہی ہے۔ان کے گردے تقریباً فیل ہیں مگر شاباش ہے جرمنی کی فلاحی مملکت پر کہ انہوں نے مریض کو اپنی گاڑی بھیج کر روزانہ لانے لے جانے کا ذمہ بھی لے رکھا ہے' زیادہ ضرورت پڑے تو ہیلی کاپٹر بلا کر کسی اور بڑے ہسپتال پہنچا دیتے ہیں۔حیدر کے دل کے تین آپریشن ہوئے' ان کو جسمانی تکلیف یقیناً پہنچی مگر مالی مادی کسی قسم کا بوجھ ان پر نہیں پڑا۔لاکھوں کروڑوں روپے کا علاج مفت ہو گیا اور دیکھ بھال' ستھرائی صفائی ایسی کہ باتیں سن کر ہی افسانوی لگیں۔میں امریکہ کے ہسپتالوں میں کئی ہفتے گزار چکا ہوں مگر جرمنی کے ہسپتالوں کا حال پڑھا تو وہ امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑتے نظر آئے۔

حیدر کے رسالے میں غزلیں' نظمیں' خصوصی مطالعے (ڈاکٹر وزیر آغا)' افسانے' گوشہ ایوب خاور' ماہیے' خطوط تاثرات وہ سب کچھ موجود ہے جو ادبی رسالوں کی شان اور جان ہوتا ہے۔

جو لوگ رسالے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے حیدر قریشی نے ان کے لئے کمپیوٹر کے ذریعے سوغات حاصل کرنے کی نوید دی ہے۔جدید ادب رسالہ www.jadeedadab.com یا دوسرے پتے hqg786@arcor.de اور haider_qureshi2000@yahoo.com سے نکال کر حیدر قریشی کی تخلیقات و رسائل پڑھ سکتے ہیں۔

(مطبوعہ روزنامہ **آج** پشاور۔٢۵/جولائی ٢٠١٠ء)

لے: ڈاکٹر صاحب آپ کی محبت اور حوصلہ افزائی ہمیشہ میرے لیے تقویت کا موجب بنی ہے۔آپ کے بعض القاب اور جملے میری حیثیت سے زیادہ ہو کر بھی مجھے اچھے لگے ہیں لیکن یہ ''بابائے ادب'' کا لقب میری حیثیت سے زیادہ ہی نہیں بہت زیادہ ہے۔ادبی لحاظ سے تو بالکل ہی نہیں اور عمر کے لحاظ سے بھی ابھی ایسا بزرگ نہیں ہوا کہ اس لقب کا متحمل ہو سکوں۔سو آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔**(حیدر قریشی)**

جدید اردو ادب کے عظیم دانشور اور ادیب

ڈاکٹر وزیر آغا انتقال کر گئے

اناللہ و انا الیہ راجعون

اردو کے عظیم دانشور اور شاعر و ادیب ڈاکٹر وزیر آغا ۸/ستمبر ۲۰۱۰ء کو رات ایک بجے کے قریب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ **اناللہ و انا الیہ راجعون**

وزیر آغا کی عمر ۸۸ برس تھی۔ان کی وفات سے محض الفاظ کی رسمی حد تک نہیں بلکہ حقیقت میں اردو دنیا ایک بہت بڑے تخلیق کار اور ایک بہت بڑے دانشور سے محروم ہو گئی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔۱۹۴۳ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج سے معاشیات میں ایم اے کیا۔۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔۱۹۶۰ء میں مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی جریدہ ''ادبی دنیا'' کے جائنٹ ایڈیٹر بنے اور مولانا کی وفات تک ادبی دنیا کے ساتھ منسلک رہے۔ان کی وفات کے بعد ۱۹۶۵ء میں تاریخ ساز ادبی جریدہ اوراق کا اجرا کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کثیر الجہت شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ مفکر دانشور بھی تھے۔اردو ادب میں میڈیا کر دانشوروں کی تو ہمیشہ بہتات رہی ہے لیکن علم و معرفت کے لحاظ سے ڈاکٹر وزیر آغا کے پائے کا مفکر دانشور اب دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔اردو انشائیہ کے بانی کی حیثیت سے انہوں نے ایک بڑا ادبی کام کیا۔اردو انشائیہ کے خدو خال کو نمایاں کرنے میں بہت زیادہ محنت سے کام لیا اور اس نئی صنف کی شدید ترین بلکہ اخلاقی لحاظ سے بدترین مخالفت کے باوجود اسے اردو میں رائج کر دکھایا۔شاعری میں غزل اور نظم دونوں اصناف میں ان کا انتہائی گراں قدر حصہ ہے۔جدید نظم کے سلسلہ میں تو ان کا کام اتنا اہم ہے کہ ان کے مقام کا تعین کرنے کے لیے جدید نظم کے پورے سلسلے کا از سر نو مطالعہ کرنا پڑے گا۔ان کی دو طویل نظمیں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' اردو کی شاہکار جدید نظمیں ہیں۔

وزیر آغا نے ''مسرت کی تلاش'' سے اپنا علمی و تنقیدی سفر شروع کیا۔طنز و مزاح اور حقیقی مسرت کے فرق کی جستجو میں وہ تخلیقی اسرار اور خود کو جاننے کی لذت سے آشنا ہوئے۔کائنات کے اسرار و رموز کی جستجو انہیں بیک وقت سائنس، فلسفہ اور الٰہیات کی دنیاؤں میں لیے لیے پھری۔انہوں نے مغربی علوم کا بھرپور مطالعہ کیا لیکن مشرقی علوم کے روبرو لا کر پھر اس مطالعہ سے اپنے نتائج خود اخذ کیے۔امتزاجی تنقید کے اصول کو علمی سطح پر بھی اور عملی سطح پر

رائج کیا۔مجموعی طور پر وزیر آغا نے ساٹھ سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ان میں بعض ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ان کی مرتب کردہ یا تالیف و تدوین کردہ کتب کی الگ سے فہرست ہے۔ان کی تخلیقی کتابیں تو تمام کی تمام اپنی جگہ مطالعہ کا تقاضا کرتی ہیں جبکہ علمی و تنقیدی کتابوں میں سے ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تخلیقی عمل''، ''دستک اس دروازے پر'' منفرد اور امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کی بعض کتب اور تخلیقات کے انگریزی، ڈینش، یونانی، سویڈش، جرمن، ہسپانوی، مالٹیز، جاپانی، ہندی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، سرائیکی اور دوسری زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔وزیر آغا کے فن کی مختلف جہات پر تیرہ کے لگ بھگ رسائل کے مرتب کردہ خصوصی نمبرز یا کتابیں چھپ چکی ہیں۔انڈو پاک کی یونیورسٹیوں میں ان پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے ۱۰ سے زائد مقالات لکھے جا چکے ہیں۔اردو کی علمی و ادبی دنیا کے وہ تمام لوگ جو میڈیائی شہرت کے پیچھے بھاگنے سے زیادہ ادب کو معرفتِ ذات و کائنات کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں، ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر سوگوار اور غم زدہ ہیں۔

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارا بھی ہی جانے والا (**وزیر آغا**)

(یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے ۸ ستمبر کو صبح پونے نو بجے ریلیز کی گئی)

حیدر قریشی (جرمنی سے)

بعد ازاں ان ویب سائٹس پر بھی یہ خبر شائع کی گئی۔

http://www.siasat.pk/forum/showthread.php?43296

(08-Sep-2010 07:53 AM)

http://sherosukhan.tripod.com/id990.html

عمر کی آخری منزل پہ جو پہنچے تو کھلا
اک عجب مست روی وقت کے پیچاک میں ہے
وزیر آغا

08-Sep-2010 09:52 AM

http://www.siasat.pk/forum/showthread.php?43296-

آغا جی نے اپنے والد مرحوم کی وفات پر یہ نظم لکھی تھی۔آج ان کی وفات کے موقعہ پر ان کی یہ نظم جیسے خود کلامی کی صورت میں پھر سے لکھی گئی لگتی ہے۔ **نوٹ از حیدر قریشی**

سفر کا دوسرا مرحلہ: وزیر آغا

''چلی کب ہوا، کب مٹا نقشِ پا
کب گری ریت کی وہ ردا
جس میں چھپتے ہوئے تو نے مجھ سے کہا:
آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا
مڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟
کوئی چہرہ، کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا، کچھ نہیں اب
اے گلّے کے تنہا محافظ!
ترا اب محافظ خدا!''

وزیر آغا جدید اردو ادب کے عظیم دانشور تھے

نئی دہلی۔۱۳ر ستمبر۔اردو اکادمی، دہلی میں برصغیر کے ممتاز ادیب، دانشور، نقاد اور جدید نظم کے اہم ستون ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کی۔جلسہ میں موجود شرکا نے ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا اور ان تاثرات کا اظہار کیا کہ وزیر آغا نے تنِ تنہا ایسے علمی و ادبی کام کیے ہیں جو اس دور کے ادارے بھی نہیں کر پاتے وہ ایک رجحان ساز ادیب و شاعر تھے۔پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مرحوم وزیر آغا نے تخلیقی اسرار اور خود کو جاننے کی لذت سے آشنا ہونے کے لیے اور کائنات کے اسرار و رموز کی جستجو میں سائنس، فلسفہ اور الٰہیات کی دنیاؤں میں غوطہ زنی کی اور گوہرِ آب دار تلاش کیے۔جدید نظم کے سلسلے میں ان کا کام اتنا اہم ہے کہ ان کا مقام متعین کرنے کے لیے جدید نظم کے پورے منظر نامے کا ازسرِ نو مطالعہ کرنا پڑے گا۔اردو انشائیہ کے خدوخال نمایاں کرنے میں بہت زیادہ محنت سے کام کیا۔اختر الواسع نے کہا کہ اردو کی علمی و ادبی دنیا کے تمام لوگ ان کے سانحۂ ارتحال پر غم زدہ ہیں۔

سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی جس میں مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔جلسہ کے آخر میں مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور ان کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل کی تلقین کی گئی۔(**مرغوب حیدر عابدی**) سکریٹری اردو اکادمی، دہلی

BBC.co.uk

نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر وزیر آغا، خود ان کے فن پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں

کباب کا ایک لذیذ ٹکڑا زبان پر رکھتے ہی یا صرف بالغوں کے لئے شائع ہونے والے کسی رسالے میں نیم برہنہ تصویر دیکھتے ہی جو لذت محسوس ہوتی ہے وہ اُس مسرت سے کسطرح مختلف ہے جو مثلاً ایک معصوم بچے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر یا دریا کنارے ایک درخت کے پتوں سے بادِ صبا کی اٹھکیلیاں دیکھ کر محسوس ہوتی ہے۔لذت اور مسرت کے موازنے کی یہ بحث سن پچاس کے عشرے میں اُردو خواں طبقے کے لئے ایک بالکل انوکھی بات تھی۔اور اس بحث کو شروع کرنے والا شخص کوئی بوڑھا فلسفی نہیں بلکہ سرگودھے کا ایک نوجوان وزیر آغا تھا جو اکنامکس میں ماسٹرز ڈگری حاصل کرنے کے بعد اب فارغ اوقات میں اُردو شاعری کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا۔وزیر آغا کا سات ستمبر کی شب لاہور میں اٹھاسی برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔انھیں اگلے دن ضلع سرگودھا میں انکے آبائی گاؤں وزیر کوٹ میں سپردِ خاک کر دیا گیا ہے۔

''چلی کب ہوا، کب مٹا نقشِ پا کب گری ریت کی وہ ردا جس میں چھپتے ہوئے تو نے مجھ سے کہا: آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا مڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟ کوئی چہرہ، کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا، کچھ نہیں اب اے گلّے کے تنہا محافظ ترا اب محافظ خدا (ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک نظم)

اُردو کے بزرگ قلم کار مولانا صلاح الدین احمد جو اپنے ادبی پرچے کے ذریعے ہندوستان بھر کے نوجوان ادیبوں کی تربیت کر رہے تھے اور کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور جیسے نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ ن م راشد، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی جیسے شعرا کو بھی منظرِ عام پر لا چکے تھے، اُن کی نگاہِ جوہر شناس جب وزیر آغا پر پڑی تو فوراً انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔اقتصادیات، نفسیات اور فلسفے کے جو مضامین کبھی اُردو میں زیرِ بحث نہیں آئے تھے، انکے لئے اپنے پرچے کے صفحات کھول دیئے۔وزیر آغا نے مسرت کی نوعیت، مسرت کی اقسام اور حصولِ مسرت کے ذرائع پر جو کچھ لکھا مولانا نے اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ اسے ایک کتابی شکل میں شائع بھی کرایا اور یوں نوجوان وزیر آغا کی کتاب مسرت کی تلاش منظرِ عام پر آئی۔

بھارت میں ان کے فن پر بہار یونیورسٹی مظفر پور سے پروفیسر عبدالواسع کے زیرِ نگرانی تحقیقی مقالے ''وزیر آغا کا فن''

پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔لیکن جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ تو نوجوان قلم کار کی جولانیٔ طبع کا صرف ایک پہلو تھا۔اُن کا اصل جوہر اُردو شاعری کے اُن تجزیاتی مضامین میں کھلا جو 'ایک مثال' کے عنوان سے ماہنامہ ادبی دنیا میں سلسلہ وار شائع ہوئے۔

1960 میں مولانا صلاح الدین احمد نے انھیں اپنے جریدے کی مجلسِ ادارت میں شامل کرلیا اور وہ تین برس تک ایک ساتھی مدیر کے طور پر کام کرتے رہے۔سن پچاس کے عشرے میں انھوں نے مسرت کے موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے دنیا بھر کے مزاحیہ ادب کا مطالعہ بھی کیا اور انھی دنوں اُن کا تحقیقی کارنامہ اردو ادب میں طنز و مزاح سامنے آیا جسے 1956 میں پنجاب یونیورسٹی نے ایک اوریجنل تحقیقی کام قرار دیتے ہوئے وزیر آغا کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش کی۔

اُردو کے بزرگ قلم کار مولانا صلاح الدین احمد جو اپنے ادبی پرچے کے ذریعے ہندوستان بھر کے نوجوان ادیبوں کی تربیت کر رہے تھے اور کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور جیسے نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ ن م راشد، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی جیسے شعرا کو بھی منظرِ عام پر لا چکے تھے، اُن کی نگاہِ جوہر شناس جب وزیر آغا پر پڑی تو فوراً انھیں اپنے سایہء عاطفت میں لے لیا اُردو ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام دو حیثیتوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ایک تو انھوں نے اردو ادب میں انشائیے کی صِنف کو فروغ دینے کیلئے ایک تحریک کی سطح پر کام کیا اور دوسرے انھوں نے اُردو تنقید کو جدید نفسیاتی مباحث سے روشناس کرایا۔

انشائیے کی ترویج میں اُن کے ادبی رسالے اوراق نے انتہائی اہم خدمات سرانجام دیں۔وزیر آغا نہ صرف خود انشائیہ لکھتے تھے بلکہ نوجوان ادیبوں کو اسکی ترغیب بھی دیتے تھے اور اُن کے معیاری انشائیے اپنے رسالے میں باقاعدگی سے شائع کرتے تھے۔بہت سے ادیبوں کو یہ شکوہ رہا کہ وزیر آغا نے انکی تحریر کو بطور انشائیہ قبول نہیں کیا بلکہ مزاحیہ مضمون کا عنوان دیکر شائع کیا۔اس سلسلے میں وزیر آغا کا موقف انتہائی واضح تھا۔وہ ہر ہلکی پھلکی یا مزاحیہ تحریر کو انشائیہ قرار دینے پر تیار نہ تھے کیونکہ اُن کے بقول انشائیے میں ایک خاص طرح کی "ذہانت کی چمک" ہونا ضروری تھا۔اردو تنقید میں ژونگ کے اجتماعی لاشعور اور دیومالا کی نئی تشریح و توضیح کا چلن وزیر آغا کی ہی بدولت ممکن ہوا۔اُن کی تصنیفات کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے جن میں سے پندرہ کتابیں ایسی ہیں جن کا تعلق محض شعر و شاعری سے ہے۔اُن کی کچھ کتابوں میں نظمِ جدید کی کروٹیں (1963)، اردو شاعری کا مزاج (1965)، تخلیقی عمل (1970)، انشائیے کے خدوخال (1990) اور غالب کا ذوقِ تماشہ (1997) انتہائی اہم ہیں۔

اپنے مداحوں کے لئے وزیر آغا نے اپنے حالاتِ زندگی بھی ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیئے ہیں سوانح عمری کا نام ہے "شام کی منڈیر سے" جس طرح مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے وقت کے بہت سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی اور انھیں قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں لا کھڑا کیا، اسی طرح اُن کے شاگردِ رشید وزیر آغا نے بھی اپنے رسالے اوراق کے ذریعے بہت سے نوجوانوں کے ذوقِ تحریر کی آبیاری کی۔وہ کافی عرصے تک گورنمنٹ کالج سرگودھا میں اعزازی مدرّس کے طور پر بھی کام کرتے رہے

ہیں۔

بھارت میں ان کے فن پر بہار یونیورسٹی مظفر پور سے پروفیسر عبدالواسع کے زیرِ نگرانی تحقیقی مقالے ''وزیر آغا کا فن'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔دوسرا مقالہ بھاگلپور یونیورسٹی میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے زیرِ نگرانی وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر لکھا گیا اور تیسرا رانچی یونیورسٹی میں وہاب اشرفی کے زیرِ نگرانی وزیر آغا کی تنقید کے موضوع پر لکھا گیا جن پر پی ایچ ڈی ایوارڈ ہو چکی ہے۔اس کے علاوہ جے پور یونیورسٹی میں وزیر آغا کی تنقید نگاری پر ایم فل اور پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے۔پاکستان میں بھی وزیر آغا کے فن پر 14 کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا ہمیں
اب تو آرام کریں سوچتی انکھیں میری
رات کا آخری تارا ہے بھی جانے والا

http://www.bbc.co.uk/urdu/pakistan/2010/09/100910_wazir_agha_obit.shtml?s

۱۰ر ستمبر ۲۰۱۰ء، بروز جمعہ، بوقت: 16:04 GMT 21:04 PST

''اور اب شام کی آمد آمد ہے، میں بدستور اپنے گاؤں میں رہ رہا ہوں، بہت کم سفر کرتا ہوں لیکن ہمہ وقت حالتِ سفر میں ہوں۔جب سورج ڈھلتا ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے دور کھیتوں میں نکل جاتا ہوں۔جب میں گاؤں سے نکل رہا ہوتا ہوں تو عین اُس وقت پرندے، ڈھور ڈنگر اور کسان رات گزارنے کے لیے گاؤں کی طرف آ رہے ہوتے ہیں۔راستے میں ان سب سے ملاقات ہوتی ہے۔ان کے لیے رات سکون اور آرام اور نیند کا دوسرا نام ہے۔میرے لیے رات سفر کا ایک استعارہ ہے۔میں دیکھتا ہوں کہ شام بظاہر دن کی روشنی کا آخری نقطہ ہے مگر یہ رات کی روشنی کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔اور میں ایک طویل مسافت کے بعد اب کہیں اس نقطے پر پہنچا ہوں۔آج سے تقریباً چونسٹھ برس پہلے جب میں دن کے نقطۂ آغاز پر کھڑا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے اردگرد کا ہوش تک نہیں تھا۔مگر آج کہ رات کے نقطۂ آغاز پر پہنچا ہوں تو دیکھ سکتا ہوں اور یوں اس گہرے اسرار کو جو معانی کا منبع ہے، نہ صرف ''سن'' سکتا ہوں بلکہ اسے ''مس'' بھی کر سکتا ہوں۔میں جب اسے دیکھتا ہوں تو اس کے اندر ویسا ہی دھماکہ ہوتا ہے جیسا ''ناموجود'' کے اندر ہوا تھا اور پھر سارا آسمان مسکراتے ہوئے ستاروں سے اَٹ جاتا ہے اور میں ان ستاروں کو اپنے پھیلے ہوئے دامن میں اس طور سمیٹنے لگتا ہوں جیسے گاؤں کی لڑکیاں کپاس چنتی ہیں۔''

(**ڈاکٹر وزیر آغا** کی خودنوشت **سوانح شام کی منڈیر** سے کا اختتامی پیراگراف۔

مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۶ء)

منشا یاد (اسلام آباد)

ایک بڑے ادبی تارے کا غروب

پہلے زمانوں میں جن لوگوں کو حکیم، دانا اور نابغہءِ روزگار کہا جاتا تھا وہ کثیر الجہات یعنی بیک وقت علم و دانش کے کئی شعبوں بلکہ ہر شعبے میں مہارت رکھتے تھے۔علم و ادب، تحقیق و تنقید، تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ و منطق، طب ،سائنس، ریاضی، نجوم و فلکیات، اساطیر، ادیانِ عالم اور سیاست وغیرہ۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ محدود ہوتا گیا اور ہمارے آپ کے زمانے تک آتے آتے سپیشلائزیشن کا دور شروع ہو گیا اور علوم کے زیادہ تر شعبے الگ ہو گئے۔دوسرے لفظوں میں علم و دانش کے حوالے سے انسان یک رخا ہوتا چلا گیا۔لیکن کہیں کہیں اور کوئی کوئی ملٹی ڈائمنشنل آدمی اب بھی مل جاتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار ایسے ہی کثیر الاوصاف انٹلکچوئل یا دانشور لوگوں میں ہوتا تھا جو بیک وقت ادب، شاعری، تحقیق، تنقید، فلسفہ، سائنس، تاریخ، اساطیر اور انشائیہ نگاری کے میدانوں میں غیر معمولی قابلیت اور مہارت کے حامل تھے۔ان کا جدید و قدیم علوم کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور انہیں فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ سے بھرپور آگاہی تھی۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی فکر میں بلندی اور تنقیدی وژن میں بے تعصبی اور کشادگی تھی اور انہوں نے اپنی تحریروں میں تنقید و تحقیق کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ جدید اردو فکشن کے بہترین نقاد بلکہ اس وقت اردو ادب کی سب سے بڑی اور توانا شخصیت تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی معرکتہ الآرا کتاب ''اردو شاعری کا مزاج''جس کے ایک درجن سے زیادہ ایڈیشن چھپ کر اہلِ علم و فضل سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں، ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔اس میں انہوں نے پہلی بار برِ صغیر کے تہذیبی اور تمدنی پس منظر میں اردو شاعری کا جائزہ لیا تھا۔یہ کتاب اس موضوع پر اب بھی بنیادی حوالے کا کام دیتی ہے۔اور اس کے زمینی اور تہذیبی تعلق کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔چوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا شاعر اور دانشور کے علاوہ ایک زمین دار کسان بھی تھے اور زمین اور درختوں سے ان کی وابستگی اور محبت نہایت گہری اور سچی تھی، اس لیے ان کی شاعری اور نثری تحریروں میں اس کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔اردو شاعری کا مزاج کے بعد ان کی بہت سی کتابیں تنقیدی اور تخلیقی عمل اور اس سے متعلقہ موضوعات پر طبع ہوئیں اور اہلِ نظر سے خراج تحسین حاصل کرتی رہیں۔ان کی تنقید کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تخلیقی رنگ لئے ہوتی ہے اور وہ سنجیدہ اور گنجلک ادبی مسائل کو بھی اپنے اسلوبِ بیان سے دلچسپ اور خوشگوار بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک بلند پایہ اور جدید نقاد ہی نہیں، ایک ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے انہوں نے اردو ادب میں جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنی تخلیقات اور اداریوں میں جن اہم

ادبی مباحث پر اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں وہ ''وزیر آغا کے اداریئے'' کے نام سے ڈاکٹر اقبال آفاقی کی مرتبہ ایک الگ کتاب کی صورت شائع ہو چکے ہیں۔ان میں ہر اداریہ کوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف اور بہت خیال انگیز ہے۔اور اگر چہ ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار برِ صغیر کے چند گنے چنے نقادوں میں ہوتا ہے۔لیکن ایسا نقاد پوری اردو دنیا میں شائد ہی کوئی دوسرا ہو جو تخلیقی طور پر بھی اتنا ہی زرخیز اور شاداب ذہن رکھتا ہو۔انہوں نے بلاشبہ اردو میں خود بہترین انشائیے لکھ کر انشائیہ نگاری کی روایت کو مالا مال اور مستحکم کیا اور جدید نظم میں گراں قدر اضافے کئے۔اپنی تحریروں اور رسالہ اوراق کے ذریعے جدید ادب اور خصوصاً نئی نظم اور جدید افسانے کی ترویج و ترقی میں بھی ان کا بہت حصہ ہے۔ان کی ایک نثری کتاب ''دستک اس دروازے پر'' تخلیقی اور فکری اعتبار سے ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔اگر وہ چاہتے تو اسے تھوڑی سی کوشش کے ساتھ اردو کے بہترین فکری ناول کی شکل دے سکتے تھے مگر ان کا مقصد ناول نگار کہلانا نہیں تھا وہ عام قارئین کو حیات و کائنات اور فکر و فلسفہ کے پیچیدہ اور ادق سوالات کی آسان طریقے سے تفہیم کرانا چاہتے تھے۔اس کے باوجود آپ اسے پڑھتے ہوئے ایک تخلیقی انبساط سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا، وہ ایک کشادہ دل، شریف النفس اور خوش مزاج آدمی تھے اور نہایت قابلِ اعتماد دوست۔ہم ایسے لکھنے والے ان کی صحبت میں بیٹھ کر فکری اور ادبی طور پر تر و تازہ ہو جاتے اور اپنے اندر تخلیقی توانائی محسوس کرنے لگتے۔میں شاید اپنے ہم عصر اور ہم شہر افسانہ نگاروں میں واحد شخص تھا جو فنون اور اوراق دونوں طرف قبول کیا جاتا تھا جس کی سب سے بڑی وجہ دونوں بزرگوں کی کشادہ دلی تھی۔احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھی معلوم تھا کہ میرا ڈاکٹر وزیر آغا سے دوستی اور محبت کا تعلق ہے۔لیکن انہوں نے کبھی اعتراض نہ کیا۔ایک بار صرف اتنا لکھا کہ بھئی آپ جہاں چاہیں چھپتے رہیں مگر اپنے فنون کو تو نہ بھولیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی معلوم تھا کہ میں نہ صرف فنون میں شائع ہوتا ہوں بلکہ نظریاتی حوالے سے جناب احمد ندیم قاسمی اور ان کے حلقہءِ احباب کے بہت قریب ہوں لیکن انہوں نے بھی اس سلسلے میں کبھی کوئی اعتراض یا شکایت نہیں کی۔بلکہ ایک بار میں نے ایک اخباری انٹرویو میں دونوں گروہوں کے باہمی اختلافات کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور ان کی باہمی صلح کی خواہش کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب نے خط لکھ کر میری باتوں کو سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال سے ادبی، علمی اور قومی سطح کا نقصان ہوا ہی ہے لیکن مجھ ایسے بہت سے لوگ ایک اچھے دوست اور دانا شخص کی صحبت اور محبت سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ان کی عمر اٹھاسی برس سے کچھ زیادہ تھی اور انہوں نے بہت بھرپور زندگی گزاری۔اور اگر چہ اس فانی دنیا میں ''جے لکھ برساں جیوے کوئی اوڑک اک دن مرنا''، لیکن ڈاکٹر وزیر آغا جیسے نابغۂ روزگار لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔انہی کے ایک شعر پر بات ختم کرتا ہوں:

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری   رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا

(۲۰ ستمبر ۲۰۱۰ء کو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام منعقدہ ریفرنس میں پڑھا گیا)

زاہدہ حنا (کراچی)

نرم گرم

آغا صاحب: روشنی سفر میں ہے

وہ اٹھاسی برس کی عمر اور آخری سانس تک اردو ادب اور دانش کے افق پر کسی چھتنار پیڑ کی طرح نگاہیں جمائے کھڑے رہے۔ ہماری ادبی روایات کے مطابق انہوں نے بھی اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، تنقید کی طرف بعد میں آئے۔ تقسیم کا زمانہ ان کی روح پر زخم لگاتا ہوا گزرا۔ اپنی خودنوشت میں انہوں نے لکھا ہے کہ ’’شام کے قریب میں نہر کنارے سفر کر رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ مغرب میں صرف ہلکی روشنی باقی تھی۔ مجھے ڈر بھی لگا مگر میں چلتا رہا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ ساتھ نہر کے پانی پر کوئی چیز بہتی جا رہی ہے۔ غور کیا تو وہ کسی عورت کی لاش تھی۔ نہ جانے کتنی دیر سے ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ بربریت کا ایسا نمونہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انسانی جسم کی اس طور بے حرمتی بھی ہو سکتی ہے۔ اس بات کا مجھے سان گمان تک نہ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خود دو حصوں میں بٹ گیا ہوں‘‘

وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جو صدیوں سے کھیت کھلیان سے جڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی ادب کے دھارے ان کے والد اور بعض قریبی بزرگوں کو سیراب کر رہے تھے وہ سیرابی ان کی ذات میں منتقل ہوئی۔ تعلیم انہوں نے اقتصادیات میں لی ہاتھوں کا رشتہ کھرپی اور آنکھوں کا زمین کی نرم مٹی سے استوار رہا۔ اور دھرتی سے ان کا رشتہ یوں استوار ہوا کہ کبھی نہ ٹوٹا اور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے اپنی اڑان کی قوس سے انہیں اپنے سحر میں گرفتار کرتے رہے۔ یاد نہیں ان کے بارے میں کس نے یہ کھرا سچ لکھا کہ ان کی نثری تحریریں تنقید، تحقیق اور تخلیق کا ایک دل آویز امتزاج ہیں۔ انہوں نے اپنے اچھوتے موضوع سے انصاف برتنے کے کے لئے تاریخ، عمرانیات، فلسفہ اور ادب کے بیکراں سمندروں کو کھنگالا ہے۔ ان کی تاریک تہوں تک غوطہ زنی کی ہے اور اپنے ذہنِ رسا کی جودت کے طفیل وہاں سے ایسے ایسے نایاب گوہروں کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں جن سے پڑھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔

یہ ہمارے ایک بے بدل دانشور اور ادیب وزیر آغا کی کتھا کہانی ہے جسے لکھنے کے لئے پر ہنر اور درد آشنا انگلیوں کی

ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسی فضا میں پروان چڑھے جسے صارفیت کی تیز آندھی نے ابھی دھندلایا نہیں تھا۔ تن آور پیڑ اس آندھی کی زد میں آ کر زمین بوس نہیں ہوئے تھے۔ ادب کا رشتہ ایک ایسا سچا اور سنہرا رشتہ تھا جس سے بندھا ہوا اور وزیر کوٹ میں رہنے والا اورنگ آباد تک چلا جاتا تھا اور جوگندر پال، قراۃ العین حیدر، کرشن چندر اور راجہ مہدی علی خان کی محفلوں میں یوں رچ بس جاتا تھا جیسے اس نے وہیں جنم لیا ہے اور ان ہی میں سے ہے۔ یہ ہمارے ادب کا وہ زمانہ تھا جب ’تعلقاتِ عامہ‘ کی دیمک اس کی جان کا روگ نہیں بنی تھی اور سچا حرف لکھنے والے ہی ادب کی اقلیم میں بار پاتے تھے، نہ کاٹا اور لے دوڑے کی وبا عام ہوئی تھی۔ ستر بے وزن غزلوں کے شاعر اپنا مجموعہ چھپوا کر میر اور غالب کی ہمسری کے دعویدار ہونے کی جرات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ غالب کا نام آیا تو یاد آیا کہ آغا صاحب نے غالب کی مدح یوں کی تھی کہ ’’غالب تو ایک ایسا واقعہ ہے جو آندھیوں اور موسموں کی تبدیلیوں کے باوجود رونما ہو کر رہتا ہے۔ غالب وہ آؤٹ سائیڈر ہے جو شہاب ثاقب کی طرح تہذیب کے افق پر گاہے گاہے نمودار ہوتا ہے اور پھر اسے بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اسے اپنی آمد کے لئے پہلے سے کسی تہذیب کو درآمد کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی اور نہ وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ایک خاص وضع کی معاشرتی فضا موجود ہو تو وہ درشنی دے۔ اردو شاعری میں غالب ایک دھماکے کے ساتھ نمودار ہوا یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے آج سے تقریباّ دو ہزار چھ سو برس قبل ہندوستانی معاشرے میں گوتم بدھ نمودار ہو گیا تھا۔‘‘

انہوں نے اردو ادب کی خدمت کرنے والے مولانا صلاح الدین کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کی دوستی اس عہد کے ادیبوں سے تھی جو بڑائی کا اندازہ کار کی لمبائی اور لشکارے سے نہیں تخلیقی وفور سے لگاتے تھے۔

وہ اپنی ابتدائی زندگی سے مولانا صلاح الدین احمد سے وابستہ رہے۔ ان کے جریدے ’’ادبی دنیا‘‘ سے پیوستہ رہے۔ اور جب مولانا نے اپنی آنکھیں بند کیں تو اپنے ادبی جریدے ’’اوراق‘‘ کی پیشانی پر ہمیشہ شائع کیا کہ ’’مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں‘‘۔ پہلے عارف عبدالمتین اور پھر سجاد نقوی ان کے شریکِ کار رہے۔ وہ غالب کے عاشق تھے لیکن ان کی طرح بیوی کو کبھی بیڑی نہیں سمجھا۔ صفیہ سے عشق کیا، بیاہ کر لائے اور آخری سانس تک ان کے نام کی مالا جپتے رہے۔

منکسر المزاج ایسے کہ ساری دنیا میں ان کی شاعری کے تراجم ہوتے رہے لیکن انہوں نے کبھی اس کی تشہیر اس طرح نہیں کی جس طرح ان سے بہت کم کاٹھ رکھنے والے کرتے ہیں اسٹاک ہوم میں سویڈش رائٹرز یونین کا ایک خصوصی اجلاس ان کا مقالہ سننے اور اس پر بحث کے لئے منعقد ہوا جس میں یونین کے بہت سے اراکین جمع تھے اور کچھ پاکستانی ادیب بھی بلائے گئے تھے اس تقریب کی مہمانی پیٹر کرمین نے کی۔ پیٹر کرمین سویڈن کے عالمی شہرت یافتہ ادیب ہیں اور ان سے نیاز مندی کا مجھے بھی شرف حاصل ہو چکا ہے جب وہ پاکسان آئے تھے آغا صاحب کو دھرتی اور مظاہرِ فطرت سے عشق تھا۔ انہوں نے ہیروشیما اور ناگاسا کی پر گزرنے والے سانحے کو اپنی پور

یور میں محسوس کیا تھا پھر جب چرنوبل کے ایٹمی بجلی گھر کی لائی ہوئی تباہی اور تابکاری نے صرف اس علاقے کو ہی نہیں سکینڈے نیویا کو بھی متاثر کیا تو آغا صاحب اس سانحے سے بھی ملول ہوئے اور دس برس بعد ایک نظم چرنوبل۔۔۔۔دس برس بعد لکھی۔سویڈن میں ان کی نظم شائع ہوئی اور بہت سراہی گئی۔شاید اس لئے کچھ زیادہ کہ سویڈن تک چرنوبل کی تابکاری کے اثرات پہنچے تھے۔سویڈن رائٹرز یونین کے پیٹر کرمین نے آغا صاحب کے ساتھ ہونے والی تقریب میں اس نظم کا بطورِ خاص ذکر کیا تھا۔اس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں

چرنوبل۔۔۔دس برس بعد!
بوڑھے بنجر لوگ تو سب لوٹ آئے ہیں
بلکہ گھوڑے بھی ساتھ آئے ہیں
بچے لیکن ساتھ نہیں
بچوں کے لانے پر شاید پابندی ہے
واپس آ کر
بوڑھے بنجر ان لوگوں نے
سب سے پہلے
بند کمروں کے دروازوں کو کھول دیا ہے
تیز ہوا کو
پھولوں کی خوشبو ڈھونے کا
حکم دیا ہے
پھر ان سب نے
پانی کے چھینٹوں سے
سوئی دھرتی کو بیدار کیا ہے
بھینی بھینی باس
زمیں کی درزوں سے باہر لپکی ہے
چاروں جانب پھیل گئی ہے!
ندیوں، جھرنوں اور پیڑوں کو
پربت کے بالوں میں اٹے
بادل کے لرزاں ٹکڑوں کو

چڑیوں کوؤں اور قازوں کو
اتنے برسوں بعد کسی نے
آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے
سارا منظر جھوم اٹھا ہے!
سارا منظر جھوم اٹھا ہے!
لیکن اڑتی تتلی
پھر بھی افسردہ ہے
افسردہ ہے!!

آغا صاحب کئی بار کراچی تشریف لائے ان کے نیاز بھی حاصل ہوئے۔کراچی میں صبا اکرام ان کے عشاق میں ایک ہیں جنہوں نے ان کی میزبانی کئی بار کی اور ذکر تو وہ ان کا ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ان کی کئی کتابیں میں نے صبا اکرام کی وساطت سے پڑھیں۔لاہور میں ان کے ایسے ہی معتقد حسین مجروح بھی ہیں ان کی رخصت کو لاہور، سرگودھا، کراچی اور اردو کے ان تمام حلقوں میں شدت سے محسوس کیا گیا جہاں ادب کے سنجیدہ لکھاری اور قاری موجود ہیں۔

وہ پیوندِ زمین ہوئے لیکن ہمارے لئے اپنے یہ جملے چھوڑ گئے کہ ''چراغ سے چراغ جلتا ہے اور زندگی ایک سفرِ مسلسل کا نام بھی ہے اس لئے یہ کہنا شاید زیادہ موزوں ہو کہ یہاں ہر شخص ایک مشعل اٹھائے اپنے حصے کی مسافت طے کرتا اور پھر اسے کسی تازہ دم راہ رو کو سونپ کر خود خاک ہو جاتا ہے۔اور زندگی روشنیوں کے اس پیادہ پا کارواں کی معیت میں اپنی یلغار جاری رکھتی ہے۔کچھ یہی حال زبان ادب کے مشعل برداروں کا ہے کہ وہ ایک بے پناہ لگن کے ساتھ محبت، روشنی اور مسرت کے اس نشان کو اپنے پیش روؤں سے حاصل کرتے اور اپنی حصے کی مسافت طے کر کے دوسروں کو تھما دیتے ہیں۔یوں علم و ادب کے اس عظیم الشان اولمپک کی روشنی چند جانباز مشعل برداروں کی بدولت منزلِ مقصود کی طرف روانہ رہتی ہے''ادب کی یہ روشنی ان کے بعد بھی سفر میں ہے اور رہے گی۔

(مطبوعہ روزنامہ **ایکسپریس** سلام آباد ۲۶ر ستمبر ۲۰۱۰ء)

جا بھی چکے تھے اور رُکے بھی کھڑے تھے ہم
خود سے گزر گئے تھے مگر اپنے پاس تھے
وزیر آغا

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

آہ! ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا ایک طویل علالت کے بعد لاہور میں 88 سال عمر پا کر دنیا سے رخصت ہو گئے انہیں ان کے آبائی گاؤں وزیر کوٹ میں دفن کر دیا گیا ڈاکٹر وزیر آغا ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے ادب میں نام پیدا کیا ان گنت پرستار پیدا کئے تین درجن کے قریب تصانیف شائع کروائیں۔ زمانہ طالبعلمی میں میں نے ایک کتاب فلاسفی آف مائینڈ پڑھی تھی پھر اردو میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتب ''تخلیقی عمل'' پڑھی ان دونوں کے موضوع ملتے ہیں اردو میں ایسی دوسری کوئی کتاب نہیں ہے۔ آغا جی نے اردو ادب کے محاذ پر پاک و ہند میں بڑا نام پیدا کیا۔ وہ جدیدیت تحریک کے علمبردار تھے۔ اردو ادب میں انہوں نے تحقیق میں، شاعری میں انشائیہ نگاری میں نام پیدا کیا ان کا کام ہمیشہ زندہ رہے گا ان کی کتاب ''شام دوستاں آباد'' یادگار کتاب ہے، انشائیہ کو انہوں نے زندہ جاوید کر دیا۔ آج جو انشائیہ لکھا جا رہا ہے وہ وزیر آغا کی دین ہے۔ اب یونیورسٹیوں کا کام ہے کہ وہ ان کی تصانیف پر تحقیقی کام کریں۔

وزیر آغا نے ایک وسیع حلقہ احباب پیدا کیا وہ دوستیاں بنانا جانتے تھے اور پھر نبھانا بھی جانتے تھے۔ نبھانے کا کام وہ اپنے ذمے لے لیتے جو ایک مشکل کام ہے۔ میرے ساتھ ان کی دوستی گزشتہ چالیس سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہے اور اس میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ان کی عادت تھی جب انہیں پنڈی آنا ہوتا تب مجھے دو تین دن پہلے اطلاع کر دیتے۔ دو دفعہ ایسا نہ ہو سکا تو اچانک میرے کالج میں پہنچ گئے وہاں سے ہم گھر آئے ایک دفعہ میں دو بجے گھر آیا تو دیکھا کہ آغا جی دو تین دوستوں کے ساتھ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہیں اور ڈرائنگ روم قہقہوں سے گونج رہا ہے۔ رشید نثار اور پروفیسر جمیل آذر ان کے ہمراہ تھے۔ ان کی عادت تھی کہ سیدھے پہلے جمیل آذر کے ہاں پہنچتے، وہاں ہم کچھ دوست اکٹھے کھانا کھاتے آغا جی سے ملاقات کرتے اور کچھ دیر اسی جگہ پر بیٹھے رہتے۔ دوسرا پڑاؤ میرے ہاں ہوتا جہاں ہم کچھ دیر بیٹھتے اور کچھ ادبی اور غیر ادبی گفتگو ہوتی۔ انہوں نے کئی دفعہ مجھے اپنے گھر سرگودھا میں، وزیر کوٹ میں مدعو کیا۔ سرگودھا میں میرے ساتھ شامیں منائیں سرگودھا کے دوستوں کو مجھ سے ملوایا اک تقریب ٹاؤن ہال سرگودھا میں میرے ساتھ کی۔ پرویز بزمی نے اپنے گاؤں کھانے کی دعوت دی ایک مرتبہ وزیر کوٹ گیا آغا جی کی کمر میں چوٹ لگی تھی۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں قالین پر لیٹے تھے اور اس حالت میں بھی خوش و خرم تھے۔ میرے پوچھنے پر کہا ''اکبر صاحب چوٹ تو کہیں اندر لگتی ہے جسم تو اس کا خارجی اظہار کرتا ہے'' آغا جی میں مزاح کا عنصر بھی بہت تھا۔ ایک مرتبہ وزیر کوٹ گیا تو واپسی پر اپنی ٹوپی وہاں بھول آیا بعد میں آغا جی کا خط ملا جس میں لکھا تھا ''اکبر صاحب آپ کی ٹوپی میں نے عجائب گھر میں بھیج دی

ہے تاکہ آئندہ نسلیں اس سے سبق سیکھیں۔ ایک دفعہ جمیل آذر کے ہاں بیٹھے تھے ان دنوں ڈاکٹر انور سدید حج پر گئے ہوئے تھے میں نے آغا جی سے پوچھا کیا انور سدید کے نو سو چوہے پورے ہو گئے ہیں؟ آغا جی مسکراتے ہوئے کہا وہ تو کب کے پورے ہو چکے ہیں اب تو انہوں نے اگلے نو سو کو ہاتھ لگایا ہوا ہے۔ میرے گھر میں ان کا آنا ایسے ہی تھا جیسے گھر کا کوئی فرد آتا ہے میری بیوی کا ان سے پردہ نہیں تھا وہ گھر کے تمام حصوں میں بلاتکلف آتے میرے بیڈ روم میں کئی دفعہ آئے تو میری بیوی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ اکبر صاحب کو سمجھائیں کہ الماریاں ہوتے ہوئے بھی کپڑے باہر کھونٹی پر لٹکاتے ہیں۔ آغا جی نے ہنستے ہوئے کہا فکر نہ کریں سب شاعر ادیب ایسے ہی کرتے ہیں۔

آغا جی کا رسالہ اوراق بے حد مقبول ہوا سال میں تین چار شمارے آتے تھے۔ مجھ سے ان کا خصوصی رابطہ تھا۔ جب کبھی مجھے تخلیقات بھیجنے میں دیر ہو جاتی تو ٹیلی فون آتا اکبر صاحب اوراق کی بس چلنے کو تیار ہے۔ سواریاں پوری ہو گئی ہیں ایک سیٹ خالی ہے اور وہ آپ کی ہے جلد آئیں تاکہ بس روانہ ہو۔ اوراق میں میری چار پانچ تحریرات شائع ہوتیں۔ غزل، انشائیہ، خاکہ، تنقید، مضمون، خط چھپتے۔ اوراق اپنے بے شمار دوستوں کو اعزازی طور پر بھیج دیتے تھے۔ اوراق ایک سیکولر پرچہ تھا۔ اسی لئے مقبول بھی تھا، ایک دفعہ ایک شمارے میں انور سدید کا نام ادارتی ناموں میں شامل ہو گیا۔ میں نے فوراً لکھا کہ اوراق سیکولر پرچہ ہے لیکن ڈاکٹر انور سدید کا نام ادارت میں شامل ہونے سے یہ تاثر باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ آئندہ شماروں میں ڈاکٹر انور سدید کا نام ہٹا دیا گیا ☆۔ مجھے فخر ہے کہ میری کسی بات کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ انشائیہ میں نے ان سے لکھنا سیکھا۔ انہوں نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ اکبر صاحب اب اوراق کے ہر شمارے میں آپ کا انشائیہ شامل ہونا چاہیے۔ ۱۹۸۵ میں اوراق کا انشائیہ نمبر شائع ہونے لگا تو آغا جی نے کہا جن کا کوئی مجموعہ شائع ہو چکا ہے ان کے لئے خصوصی گوشہ بنایا جائے گا۔ میں نے لکھا کہ آغا جی میری کتاب ابھی چھپی تو نہیں ہے مگر پریس میں ہے اس لئے میرا گوشہ بھی ہونا چاہیے۔ آغا جی نے فوراً لکھا آپ کے گوشے کے بغیر یہ نمبر کیسے شائع ہو سکتا ہے۔ جلد مطلوبہ چیزیں ارسال کریں۔ چنانچہ میرا گوشہ بھی شامل ہوا، اس میں وہ انشائیہ بھی شامل ہے جو پُر ملال لَے میں لکھا گیا تھا کیونکہ میرا خیال ہے انشائیہ کو بھی پوری زندگی کا نمائندہ ہونا چاہیے۔ میں نے اپنے دوستوں کی چیزیں بھی اوراق کو بھیجیں جو شائع کر دی گئیں۔ میں نے کہا نا کہ میری کسی بات کو ٹالتے نہیں تھے۔ وزیر آغا نے گوجرانوالہ میں بھی، اسلام آباد میں بھی میرے بلانے پر تقریبات میں آئے۔ میرے ساتھ منائی جانے والی کئی تقریبات میں تشریف لائے۔ میرے دوستوں کی تقریبات میں شامل ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ آغا جی کے درجے بلند کرے۔ وہ ہمیشہ اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ ان کا لفظ بولتا رہے گا۔ وہ صدیوں کے ہجوم میں بھی سنائی دیتا رہے گا۔

(مطبوعہ روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی۔ شمارہ: ۲۱/اکتوبر ۲۰۱۰ء)

☆میرا خیال ہے کہ ''اوراق'' میں انور سدید صاحب کے نام کی شمولیت اور عدم شمولیت کی کچھ اور وجوہات تھیں۔ باقی یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے زندگی بھر جس ادبی محبت اور علمی دلائل کے ساتھ وزیر آغا کا ساتھ دیا اس کی مثال ہماری ادبی دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے اس کردار کی قدر کی جانی چاہیے۔ **(حیدر قریشی)**

امجد اسلام امجد (لاہور)

چشمِ تماشا

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا کے تخلیقی، تنقیدی اور ادبی سفر کا دائرہ گزشتہ پانچ دہائیوں پر محیط ہے اور بلاشبہ ان کا شمار عصر حاضر کی ان ادبی شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنے عہد کی پہچان بن جاتی ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی نسل کے بیشتر نامور اہل علم وادب کی طرح طویل عمر پائی اور اپنے آخری دم تک لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف اور متحرک رہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی طرح ڈاکٹر صاحب نے بھی ادب کی کئی اصناف میں بیک وقت نہ صرف کامیاب طبع آزمائی کی بلکہ ایسے محکم اور پائیدار نقوش بھی چھوڑے جو ان کے نام کو دیر تک اور دور تک زندہ رکھیں گے۔ میرے علم میں نہیں کہ ان کے ادبی سفر کا آغاز تنقید سے ہوا یا شاعری سے لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہر دو اصناف ادب کے ساتھ ان کا تعلق کم وبیش ایک ساتھ ہی شروع ہوا تھا۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی وساطت سے وہ تحقیق کے میدان میں داخل ہوئے اور پھر انشائیہ نگاری کی منزلیں مارتے ہوئے بالآخر ادبی مجلّہ ''اوراق'' کی ادارت پر آخری پڑاؤ کیا جس کے متعلقین خاص نے آگے چل کر اپنے لئے دبستان سرگودھا کا نام پسند کیا اور ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو اس کارواں کا امیر مقرر کیا۔

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً 1967ء میں اوراق کے اس زمانے کے مدیر عارف عبدالمتین مرحوم کی معرفت ہوئی۔ ان دنوں ابھی ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں مستقل رہائش اختیار نہیں کی تھی اور عام طور پر شاہراہ قائداعظم پر واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک مخصوص نوع کی حلیمی اور بردباری تھی جس پر ان کی علمیت اور شگفتہ مزاجی سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ اس زمانے میں ابھی اس افسوس ناک گروپ بندی کا آغاز نہیں ہوا تھا جسے آگے چل کر دونوں طرف کے کچھ نادان دوستوں نے **فنون** اور **اوراق** کی آویزش کی شکل دے دی۔ سو اس پہلی ملاقات کے تقریباً پانچ برس بعد تک نئے پرانے تمام ادیب اور شاعر دونوں پرچوں میں بلاتخصیص چھپا کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب بڑی محبت آمیز فرمائش کے ساتھ تقریباً ہر پرچے میں میری کوئی نہ کوئی تحریر ضرور شامل کرتے تھے۔ بدقسمتی سے بعد میں اس سلسلے میں بوجوہ تعطل پیدا ہو گیا لیکن جہاں تک ڈاکٹر وزیر آغا سے ذاتی تعلق کا معاملہ ہے ہمارے درمیان شفقت اور عزت کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نہ صرف ایک بہت وسیع المطالعہ انسان تھے بلکہ نظم اور نثر دونوں میدانوں میں ایک ایسے

خوبصورت اور تخلیقی اسلوب کے حامل تھے جس نے ان کی علمیت کی خوشبو اور طبعی شرافت کو یک جان کر کے انہیں اپنے عہد کی ایک اہم اور غیر معمولی شخصیت کا درجہ دے دیا تھا۔ ذاتی طور پر ان کی تنقید کو ان کے دیگر ادبی کمالات پر ترجیح دیتا ہوں۔ کہتے ہیں دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اس لئے میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ اس ترجیح سے میری مراد ان کی استعمال کردہ باقی اصناف ادب میں ان کے کام کی اہمیت کو گھٹانا یا اسے غیر معیاری قرار دینا نہیں بلکہ صرف اپنی ذاتی پسند کی درجہ بندی ہے اور اس وضاحت کی ضرورت مجھے اس لئے پڑی کہ ایک بار میں نے کسی انٹرویو میں یہ کہہ دیا تھا کہ ''میرے نزدیک احمد ندیم قاسمی صاحب کے افسانوں کو وہ توجہ نہیں ملی جس کے وہ حق دار تھے جبکہ مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ ان کی شاعری سے بھی زیادہ لمبی عمر پائیں گے'' اس بات کو کسی مہربان نے یوں ''کوٹ'' کیا کہ امجد اسلام امجد نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ قاسمی صاحب کی شاعری تو ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی البتہ افسانے کچھ عرصہ نکال جائیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے آخری ملاقات چند ماہ قبل ان کے لاہور والے گھر میں ہوئی جہاں اب وہ مستقلاً قیام پذیر تھے اور غالباً عزیزی فیصل ہاشمی میرے ساتھ تھا جو اوسلو (ناروے) میں رہتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی نظموں کا مداح اور مترجم بھی ہے۔ وجود تو ان کا شروع ہی سے دھان پان سا تھا جو ان کی طویل قامتی کی وجہ سے قدرے زیادہ نمایاں لگتا تھا۔ اس دن وہ مجھے زیادہ کمزور اور بیمار سے لگے لیکن اپنی مخصوص شگفتہ طبعی کی مدد سے انہوں نے طوالت عمر کے حوالے سے دو چار مزے مزے کی باتیں کر کے اس ذکر کو ٹال دیا۔ وفات سے چند دن قبل جب وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے تو شہزاد احمد نے بتایا کہ وہ خاصے عرصے سے کئی سنگین اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا تھے مگر اپنے مخصوص مزاج اور غیر معمولی قوت برداشت کے باعث وہ نہ صرف پامردی سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے بلکہ کبھی حرف شکایت بھی لب پر نہ لاتے تھے۔ ان کے بیٹے سلیم آغا قزلباش نے بتایا کہ آخر دم تک ان کی ہمت قائم اور دماغ بالکل الرٹ تھا اور انہیں اپنی صحت سے زیادہ علمی اور ادبی کاموں کی فکر تھی جن میں وہ ان دنوں مصروف تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک کھاتے پیتے اور ٹھیک ٹھاک قسم کے زمیندار تھے لیکن انہوں نے ساری عمر اپنے آپ کو اپنے طبقے کے مخصوص اور معروف معمولات سے دور رکھا اور ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا کر ایک ایسی باوقار، بامقصد اور شائستہ زندگی بسر کی جو لائق تقلید بھی ہے اور قابل رشک بھی جبکہ ان کا کام معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے اہم بھی ہے اور وقیع بھی اور مجھے یقین ہے کہ اگر کچھ مہربان اپنی ذاتی لڑائیوں کے لئے انہیں بطور ڈھال استعمال نہ کرتے تو وہ اردو زبان وادب کو اور بھی زیادہ ثروت مند اور مالا مال کر سکتے تھے۔ اب وہ اس دربار میں پہنچ گئے ہیں جہاں ایک دن ہم سب کو بھی جانا ہے۔ میری دعا ہے کہ رب کریم ان کی روح کو اپنی امان میں رکھے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے نام پر اپنی دکانیں چمکانے والوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اپنے رویوں پر نظر ثانی کر سکیں تا کہ مستقبل کا مورخ ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم کی وہ خوبصورت شکل دیکھ سکے جو ان کا اصل چہرہ تھا اور ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ **ایکسپریس** لاہور۔ ۱۶؍ستمبر ۲۰۱۰ء)

افتخار نسیم (شکاگو، امریکہ)

افتی نامہ

ڈاکٹر وزیر آغا۔اردو ادب کا آخری ستون

ڈاکٹر وزیر آغا وفات پا گئے ہیں، یہ پاکستان میں اردو ادب کا آخری ICON تھا جو جسمانی طور پر ختم ہو گیا۔ میں یہاں وزیر آغا کے علم و فراست کی باتیں لکھنا شروع کر دوں تو میرا کالم بھی باقی کالموں کی طرح ہو گا۔ ایک تو یہ میں اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں کہ وزیر آغا کے کام پر لکھ سکوں، دوسری بات یہ ہے میرا دل نہیں کر رہا، میں بھی دوسروں کی طرح وزیر آغا کو اردو ادب کا چاند، سورج اور جو روایتی القاب ہوں وہ لکھ سکتا ہوں۔ پُلوں کی نیچے سے پانی گزر چکا ہے مگر ہمارے جیسے قصہ گو آج بھی آج کی نسل کو وہ باتیں بتائیں گے جو ان کیلئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ 1960ء کے آخری سالوں کا ذکر ہے میرے والد خلیق قریشی مرحوم اپنے اخبار ''عوام'' کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، میں کوئی چیز انہیں دینے کیلئے گیا، وہ اپنی کُرسی پر بیٹھے مجھے گھُور رہے تھے۔ ان کی نظروں سے پتہ چل گیا کہ معاملہ گڑ بڑ ہے، ابا جی نے ایک خط میرے آگے کر دیا، یہ ایک منظوم خط لکھا، میں جُوں جُوں خط پڑھتا گیا، میرے اوسان خطا ہوتے گئے۔ وہ منظوم خط وزیر آغا صاحب کی ہجو میں لکھا گیا تھا اور انتہائی گندہ اور بیہودہ تھا۔ بعد میں علم ہوا کہ یہ خط قتیل شفائی محسن بھوپالی اور چند اور لوگوں کی مشترکہ اختراع ہے (ایسا ہی خط میرے اپارٹمنٹ میں محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر جون ایلیا کی مشترکہ کوششوں سے محترمہ نیرّ جہاں کی شان میں لکھا گیا تھا، جس کی کاپی نذر نقوی کے پاس موجود ہے۔ (اس وقت تک نیر آپا نے ان کو اپنے مشاعروں میں نہیں بلایا تھا) میں نے ابا جی سے معذرت کی کہ مجھے تو ان لوگوں کا علم نہیں، آپ کے شاعر دوست ہیں، پھر میں لاہور پڑھنے کیلئے چلا گیا، احمد ندیم قاسمی صاحب سے میری نہ صرف عقیدت بلکہ محبت بھی تھی اور وزیر آغا صاحب کا میں مداح اور ان کے علم کا معترف۔ اس زمانے میں ''فنون'' اور ''اوراق'' میں چھپنا بالکل ایسے ہی تھا جیسے دنیا بھر میں آپ کو شاعر یا ادیب مان لیا گیا ہے۔ ''فنون'' اور ''اوراق'' کی اشاعت سے پہلے بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر لگا کرتے تھے اور جن شعراء اور ادباء کی نگارشات اس میں شائع ہوتی تھیں، ان کے نام لکھے ہوئے تھے، میں نے بھی دونوں رسالوں میں اپنی غزلیں دیں، ایک رات جب میں ہال سے نکل کر پرانی انار کلی کی سیر کر رہا تھا کہ ایک دیوار پر میری نظر ٹک گئی، وہاں دونوں رسالوں کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ شاعروں کے نام پڑھتا گیا، آخر میں دونوں پوسٹروں پر لکھا ہوا تھا افتخار نسیم۔ یقین کیجئے اتنی خوشی مجھے کسی اور جگہ پر چھپنے سے نہیں ہوئی، جتنی اس وقت اپنا نام دیکھ کر ہوئی۔ وزیر آغا عارف عبدالمتین اور چند اور لوگ چائنیز لنچ ہوم مال روڈ پر بیٹھا کرتے تھے اور شہزاد احمد، ناصر

کاظمی، انتظار حسین اور باقی شعرا اور ادیب پاک ٹی ہاؤس میں۔ ایسے لگتا تھا دونوں جگہوں پر بیٹھنے والوں کے مزاج الگ الگ اور ادب میں رجحان الگ الگ تھے۔ چائنیز لنچ ہوم میں بیٹھنے والے اپنے آپ کو ایلیٹ طبقہ سمجھتے تھے، جس میں افتخار جالب، انیس ناگی بھی شامل تھے اور پاک ٹی ہاؤس والوں کو ذرا نچلے طبقے کا سمجھا جاتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک پورے طبقے نے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی اور دیوار اتنی بلند کر دی گئی کہ اگر احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا ملنا بھی چاہتے تو مل نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ دونوں کا تعلق ایک ہی علاقے سے تھا ، امجد سلام امجد، عطاء الحق قاسمی، حسن رضوی، خالد احمد، نجیب احمد نے ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کیا ہوا تھا۔ وزیر آغا کے خلاف کالم، مضامین، ذاتی گفتگو اور گھٹیا باتوں میں خاندانوں کی اصلیت بتائی جاتی تھی (ابھی ٹی وی نہیں آیا تھا) وزیر آغا کا کئی جگہ پر داخلہ بند کر دیا گیا۔ قاسمی صاحب کے حواری ہا کی برادر مشہور ہو گئے جو بھی قاسمی پر تنقید کرتا یا وزیر آغا کے گروپ میں شامل ہوتا، اس کو ہا کیوں سے مارا جاتا مگر وقت کتنا ظالم ہوتا ہے، جب ملک سے باہر ایمبیسڈر بنانے کا وقت آیا تو احمد ندیم قاسمی پر اس کے ادنیٰ سے حواری کو ترجیح دی گئی۔ امجد اسلام امجد نہ تو ساری عمر شاعر بن سکا اور نہ ہی ادیب اور یہ کشف اس کو کھا گیا اور اس نے ساری عمر لوگوں کو لطیفے سُنا کر گزار دی۔ اگر کسی نے تمام عمر وزیر آغا کا ساتھ دیا ہے تو وہ ڈاکٹر انور سدید تھے، انہوں نے نہ صرف تمام عمر وزیر آغا کے ساتھ دوستی نبھائی بلکہ ان تمام لوگوں کے منہ بھی توڑے، جنہوں نے بلاوجہ ڈاکٹر وزیر آغا پر کیچڑ اُچھالا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا پرابلم یہ تھا کہ وہ بہت پڑھے لکھے تھے اور ان کوتاہ قد بونوں میں ایک قد آور شخصیت تھے، ان کے مداح دنیا بھر میں بیٹھے ہوئے ہیں، دنیا بھر کو چھوڑیئے، میں خود ان کا مداح ہوں، وہ ہمیشہ کہتے تھے، لائل پور سے دولڑکے آئے ہیں، عدیم ہاشمی اور افتخار نسیم، کیا اچھی غزل کہتے ہیں، اور مجھے یقین ہے ہم دونوں نے ان کے اس دعوے کا بھرم بھی رکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انڈیا موجی گھول کر پڑھا ہوا تھا، انہیں اپنے وطن کی مٹی سے بہت پیار تھا، مجھے یاد ہے عدیم ہاشمی اور میں باقی مداحین کی طرح ایک دفعہ وزیر آغا صاحب سے ملنے، ان کے گاؤں بھی گئے تھے۔ وزیر آغا چلے گئے، ہم بھی چلے جائیں گے مگر وہ تمام لوگ جنہوں نے وزیر آغا کے ساتھ زیادتیاں کی تھیں، وہ اس کا نتیجہ بھگتنے کیلئے آج بھی زندہ ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا تھا، اگر ان کا پڑھا لکھا ہونا اور صاحب علم ہونا، ان کے معاصرین کو کھلتا تھا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے، میں کچھ زیادہ نہیں لکھ رہا کیونکہ کالم میں جگہ کم ہوتی ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسی شخصیت کے بارے میں لکھنے کیلئے ان جیسا صاحب علم ہونا پڑتا ہے جو کہ میں نہیں ہوں۔ میں صرف ان کے دیرینہ دوست ڈاکٹر انور سدید اور ان کے بیٹے سلیم آغا قزلباش اور ڈاکٹر وزیر آغا کے لاتعداد مداحین سے تعزیت کرتا ہوں۔

☆☆☆

Pakistan News weekly, USA, issue 38 dated september , 16 , 2010

روزنامہ **آج** پشاور۔۲۱/ستمبر ۲۰۱۰ء

راوی نامہ: سرفراز سید

ڈاکٹر وزیر آغا بھی رخصت ہو گئے!

ایک اور بڑا نام' بڑی شخصیت' ڈاکٹر وزیر آغا بھی رخصت ہو گئے۔عمر 88 برس چار ماہ۔طویل عرصے سے علیل تھے۔چار روز قبل تشویشناک حالت میں ہسپتال میں داخل کرایا گیا مگر وہ وقت آ چکا تھا جب انسان ابدی نیند اوڑھ لیتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی رخصتی ایک عام انسان کی رخصتی نہیں۔عربی میں مقولہ ہے کہ کسی عالِم کی موت کُل عاَلَم کی موت ہوتی ہے۔ہمارے پاس پہلے ہی علم شناس معتبر لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ان میں ڈاکٹر وزیر آغا کو خاص امتیاز حاصل تھا۔بہت وسیع مطالعہ والے بلند پایہ محقق' نقاد' ادیب' شاعر' نہایت شریف النفس نرم گو انسان۔ایسے لوگ معاشرے کے لیے مینارہ نور ہوا کرتے ہیں۔شعر و ادب پر تنقید کی 20 کتابیں' اُردو کے 16 شعری مجموعے' پنجابی کے دو مجموعے' آپ بیتی' انشائیہ پر پانچ کتابیں اور عام مضامین کی تین کتابیں! حکومت کی طرف سے تمغہ امتیاز اور ستارہ امتیاز کے اعزازات۔

ڈاکٹر صاحب 18 مئی 1922ء کو سرگودھا کے نزدیک قصبہ وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک' 1943ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے معاشیات میں ایم اے اور 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اُردو ادب میں طنز و مزاح' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔کچھ عرصہ ایم اے کے طلبا کو پڑھایا مگر زیادہ توجہ لکھنے پڑھنے پر صرف کی۔سرگودھا کے نزدیک ان کی اچھی زمینداری تھی اس لئے ملازمت کے چکر میں نہیں پڑے۔ابتدا سے ہی مطالعہ کا بہت شوق تھا۔اردو' فارسی اور انگریزی ادب پر وسیع عبور حاصل تھا۔ان کی تصنیف کردہ کتابیں مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیمی بورڈوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر عبادت بریلوی' پروفیسر وقار عظیم اور ہم عصر احباب میں مولانا صلاح الدین (مرحوم) غلام الثقلین نقوی (مرحوم) غلام جیلانی اصغر (مرحوم) شمس آغا (مرحوم) اور مشتاق قمر (مرحوم) کے علاوہ موجودہ حضرات میں ڈاکٹر انور سدید' ڈاکٹر خورشید رضوی اور دوسرے لوگ شامل رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب 1973ء میں سرگودھا سے لاہور منتقل ہو گئے تھے باقی وقت انہوں نے یہیں گزارا۔چند سال قبل سرگودھا میں اپنی رہائش گاہ پر گر گئے۔ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔میں اور حسین مجروح عیادت کے لیے

سرگودھا گئے۔بہت خوش ہوئے' ساتھ ہی افسوس کا اظہار کیا کہ ہم لوگ تو لاہور سے چل کر ان کے پاس پہنچ گئے مگر وہ خود چل کر ہمارے خیر مقدم کے لئے دروازے تک نہ آ سکے!

اتنی بڑی شخصیت کا ایک مختصر کالم میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید' شاعری' انشائیہ اور دوسری اصناف ادب کے ذریعے اُردو اور پنجابی ادبیات پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ان کی شخصیت اور علمی وجاہت کا یہ عالم کہ سویڈن میں ادب کا نوبل انعام دینے والی اکیڈمی نے انہیں خصوصی لیکچر کے لیے وہاں بلایا اور ان کے ساتھ نہائت عزت و تکریم کا مظاہرہ کیا۔ان کے علمی و ادبی کارناموں کے بیان کے لیے جامع مضمون درکار ہے۔ان کے شعری کلام کا نمونہ دیکھئے:

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا　　سارا لہو بدن کا 'رواں مُشتِ پَر میں تھا
جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مشتعل　　چُھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

......☆☆......

کوزوں کے ساتھ ہم بھی تھے بکھرے پڑے وہاں　　اُس شہر بے مثال کے آثار ہم بھی تھے

......☆☆......

ہم خالی کوزے آنکھوں کے!

ہم خالی کوزے آنکھوں کے/ہم اندھے غار پہاڑوں کے/ہم سوکھی بوندیں برکھا کی/اور میلے پھول ستاروں کے/ہم 'طول' اور 'عرض' کے باشندے/ہم 'گہرائی' سے ناواقف/بس چند لکیریں کاغذ پر/یا نقش زمیں پر قدموں کے! حیرت سے تہی/آنسو سے تہی/خوابوں سے تہی/ہم پیاسی فصلیں پلکوں کی'/ہم خالی کوزے آنکھوں کے!!

......☆☆......

مجھے بھی نصب ہونا ہے

زمیں میں نصب ان کالے پہاڑوں کی قطاروں میں
مجھے بھی نصب ہونا ہے
مجھے بھی اپنے اندر پھیلتے صحرا
کے اِک گوشے میں خود کو ایک دن آباد کرنا ہے
کسی دن مجھ کو بھی آخر
عظیم الشان بننا ہے، کوئی اَہرام بننا ہے!
ابھی لیکن ہُوا سوئی پڑی ہے
ابھی دریا کے بجرے

میرے اعضا ڈھونڈنے نکلے نہیں ہیں
ابھی کچے گھروں پر خواب کے تنبو تنے ہیں
ابھی بھاری سلوں پر
چابکوں کی ضرب پڑنے کی صدا جاگی نہیں ہے!
ابھی میں ذرّہ ذرّہ دُور تک بکھرا پڑا ہوں
مگر اِک دن، بہم ہو کر
مجھے بھی اپنے حصے کی زمیں میں نصب ہونا ہے
مجھے بھی آخر اِک دن عظیم الشان بننا ہے
کوئی اَہرام بننا ہے!!

☆☆

روزنامہ **اوصاف** اسلام آباد ۹ر ستمبر ۲۰۱۰ء

Government of Pakistan:

Islamabad, Sep 09: **President Asif Ali Zardari/Punjab CM Muhammad Shahbaz Sharif & Chairman PAL** on Wednesday expressed deep sorrow and grief over the death of renowned literary figure Dr Wazir Agha, who passed away last night. Dr. Agha was a renowned poet and intellectual and his literary services would be remembered for a long time.

Islamabad—Chairman, Pakistan Academy of Letters (PAL), **Fakhar Zaman** has expressed deep grief over the death of renowned critic, poet and editor Dr. Wazir Agha.

In his condolence message, he said that Dr. Wazir Agha is among the Urdu writers who gave literature a different approach in criticism and introduced new taste in poetry.

His contributions in the fields of poetry, criticism, editing and his writings regarding different modern critical theories specially structuralism are considered an asset.

He published 17 collections of poetry, 5 collections of essays and 22 books on criticism and research. He also founded literary magazine "Auraq" which proved mile-stone in the history of modern Urdu literature.

PAL has published a book on Life and Work of Dr. Wazir Agha under publishing project of "Makers of Pakistani Literature". He was also Life Fellow of PAL since 1995.

Fakhar Zaman, Chairman, PAL and Khalid Iqbal Yasir, Director General, PAL prayed for the salvation for the soul of Dr. Wazir Agha and patience for their siblings.—APP

تعزیتی تاثرات

نوٹ: ان تعزیتی تاثرات کا بیشتر حصہ براہِ راست مجھے بھیجا گیا۔مرتضیٰ حسن نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ویب سائٹ پر تعزیتی گوشہ بنا دیا تھا http://www.wazeeragha.com/?p=83#more-83۔۔۔میں سارے موصولہ تاثرات وہاں بھیج دیا کرتا تھا۔اس سائٹ کا لنک بھی بہت سارے احباب کو ارسال کیا تھا سو چند ایک نے براہِ راست اس سائٹ پر اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا۔سلیم آغا،انور سدید اور دیگر محبان وزیر آغا کے ساتھ تعزیت کرنے والوں کی الگ سے طویل فہرست ہے۔**حیدر قریشی**)

Dr. G.C. NARANG

A GREAT, VERY GREAT WRITER INDEED …. WHAT A LOSS WHICH CAN NEVER BE FILLED. HE WAS A PILLAR OF LITERATURE AND A BEACON OF ENLIGHTEMENT. THE NEWS IS VERY VERY SADENING.
PRAYING FOR HIS MAGHFARAT .
THANKS FOR LETTING ME KNOW.
YOURS IN GRIEF…

Prof. Gopi Chand Narang, Emeritus Professor, Delhi University
Former President, Sahitya Akademi(National Academy of Letters, India)
D-252, Sarvodaya Enclave,New Delhi 110017 India

C.M NAIM: Inna lillahi… A major name in several genres, a mentor to so many talentd people, and from what I read about him also a very fine human being. **Chicago, U.S.A**

Dr. Wazir Agha's death is a great loss to Urdu literature. He was really a legend in our langauage .

Nand Kishore Vikram,Editor Aalmi Urdu Adab Delhi

I am sharing with all Urdu literary world deep grief over the sad demise of Dr. Wazir Agha. I and my colleagues in Russia knew him as an intellectual and a very talented critic and writer who introduced a new, different approach in criticism in Urdu literature.
"Urdu Shairi ka Mizaj" was the first work by Dr. Wazir Agha which I had read a long ago; since that time I was always looking for his articles, essays and poetry in different magazines available here. I had the pleasure to meet and to talk to Dr. Wazir Agha at a conference and remembered him as a very nice and interesting person. His death is really a great loss for Urdu Literature.Thanks to letting me know.Yours, duaon ke sath,

Dr. Ludmila Vasilyeva,
S.I.Institute of Oriental Studies,Moscow, Russia

اردو ادب کا وہ ''بزرگ'' چلا گیا جسے میں اپنا سبق دکھایا کرتا تھا۔استاد کی جگہ خالی ہوگئی۔**گلزار**(فلم نگری،ممبئی)

وزیر آغا ہمارے دور کے ہند پاک کے محترم اور معتبر نقاد،شاعر،نثر نگار تھے۔اُن کی رحلت اردو ادب کا ہی نہیں سارے اردو بولنے والے علاقوں کا نقصان ہے۔ایسے لوگ قدرت کا معجزہ ہوتے ہیں جو کبھی کبھی انسانی جسم میں ظاہر ہوتے ہیں۔حالؔی پانی پتی کے بعد ان کی تحریروں نے نئے ادب کے لیے نئی راہوں کو ہموار کیا ہے۔غالبؔ، فراقؔ،یگانہ اور فیض کبھی کبھی زمین پر اترتے ہیں۔وزیر آغا بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔خدا ان کی مغفرت کرے۔

ندا فاضلی(بالی ووڈ،ممبئی)

اردو کے عہد ساز نقاد،منفرد شاعر اور مایہ ناز ادیب ڈاکٹر وزیر آغا کی ناگہانی رحلت کی خبر ای میل پر پڑھ کر انتہائی صدمہ پہنچا اور اس پر مستزاد آپ کی تعزیتی تحریر،جس نے مزید سوگوار کیا۔ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی خدمات بے مثال ہیں۔اردو تنقید کی نظریاتی (سیاسی) آویزشوں کے درمیان ان کی تنقیدی تحریر کہیں زیادہ بصیرت افروز اور خیال انگیز ثابت ہوئی ہیں۔ہم جیسے غیر جانب دار لوگ جن کا مسکن نہ تو جدیدیت ہوسکتی ہے اور نہ ہی مابعد جدیدیت ہماری ادبی بناہ گاہ بن سکتی ہے،ایسے کشمکش آمیز ماحول میں وزیر آغا کی امتزاجی تنقید ہمیں سہارا دیتی تھی۔اگر آپ اتفاق کریں تو میری حقیر رائے ہوگی کہ''جدید ادب'' کا ایک یادگار دستاویزی شمارہ وزیر آغا کی حیات وخدمات کے لیے مختص ہو۔اللہ ڈاکٹر وزیر آغا کے درجات دنیا کی طرح آخرت میں بھی بلند کرے،آمین۔

شریکِ غم **خورشید اکبر**(پٹنہ،بہار)

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے سانحۂ ارتحال نے مجھے اتنا اداس کر دیا کہ مجھے تو جیسے چپ ہی لگ گئی۔میں نے یہ دن دکھ کے ساتھ گزارے اور مرحوم کو بے طرح یاد کیا۔ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت سے محروم ہوگئی جس نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزار دی۔مرحوم وزیر آغا صاحب نے اردو کو اتنا کچھ دیا جس کی مثال کم ہی کہیں ملے گی۔ان کے متعین کردہ معیارات اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوش تا ابد رہنمائی کرتے رہیں گے۔کیسے ممکن ہے کہ آنے والا وقت ان کے نام اور کام سے کسی طور صرفِ نظر کر سکے۔مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان سے میری خط وکتابت رہی ہے۔انہوں نے مجھے ہمیشہ عزت دی۔آج ان کا سایہ ہمارے سروں پر نہیں رہا لیکن ان کے الفاظ آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ان الفاظ کی روشنی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی۔احمد ندیم قاسمی کے بعد وزیر آغا کا یوں اٹھ جانا۔۔۔۔۔۔حیدر بھائی،میں بہت اداس ہوں۔مجھے وزیر آغا صاحب رہ رہ کر یاد آرہے ہیں۔اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔آمین۔وزیر آغا صاحب جیسے

بڑے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔**ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے**

احمد حسین مجاہد(بالاکوٹ)

وزیر آغا صاحب کے انتقال کا افسوس بہت شدید ہے۔مجھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔جون میں لاہور جانا ہوا تھا۔اور فون پر ان سے بات ہوئی تھی۔ان کی آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔اللہ مغفرت فرمائے۔

پروفیسر شمیم حنفی(دہلی)

Dear Janab Haider Qureshi

I got the news of sad demise of Dr.Wazir Agha from your E.mail.Believe me I am shocked .He was really a true and original scholar and a poet.This loss to Urdu literature is irrepairable and no body can take his place now.His writings and his poetry are a rich treasure for urdu literature .Coming generations will definitely benefit and get inspiration from his books left by.His magazine Awrak was also a leading journal which contributed a lot in Urdu literature.I pray that his soul may rest in peace. Amin.I am sorry ?cannot write in roman urdu so pl.accept my codolence in ver bad english. ,

Your old but sincere friend **Dr.A.B.Ashraf (Ankara, Turkey)**

ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب کی ان عظیم ہستیوں میں سے تھے جن کی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔اردو ادب کے عالمی سطح کی یہ بزرگ شخصیت کا انتقال اردو ادب کے لیے بھی،عالمی ادب کے لیے بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)**Halil Toker**

ڈاکٹر خلیل طوق أر(استنبول یونیورسٹی،ترکی)

جب سے وزیر آغا صاحب کے انتقال کی خبر سنی ہے،بہت افسوس ہے۔اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر نازل ہو۔آمین

ہانی السعید(مصر)

Dr. Wazir Agha’s departure does not close a chapter, it brings to an end an entire institution in Urdu literature.His contributions and dedication to promote literature were exemplary. He expressed himself through poetry, essays, critiques and editing and in each of these areas his professional excellence led him to attain a level of such an authority that his works will be remembered and cherished for a long time to come.At this time of grief, our thoughts go for his family and professional colleagues.

With sympathy **Dr. Riaz Akber**

Adjunct Associate Professor

Queensland University of Technology
Brisbane, **Australia**

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ڈاکٹر صاحب کی وفات کا بے حد دکھ ہوا ہے۔اللہ ان کو جنت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل۔اردو ادب میں یہ خلا شاید کبھی پُر نہ ہو سکے۔ان کی ادبی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

اسلم رسولپوری (جام پور)

ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال سے اردو دنیا کا ایک پائیدار ستون گر گیا۔میں ان کی نظمیں اور مضامین ''جدید ادب'' میں بڑے اشتیاق سے پڑھتا رہا ہوں۔سلیس الفاظ میں اور بڑی سادگی کے ساتھ پیچیدہ باتوں کی وضاحت وہ بڑی آسانی سے کر جاتے تھے۔ان کی اپنی نظموں میں contemporary issues کی وضاحت جدید استعاروں اور تشبیہات کے ساتھ بڑی خوبی سے کر جاتے تھے۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ نظمیں کسی نوجوان شاعر کے قلم سے نکلی ہوں۔
آپ نے ان کی وفات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اور ان کی اردو کے تئیں خدمات کو بخوبی اجاگر تو کرتا ہی ہے، اُن کے لیے آپ کی عقیدت اور ایثار کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ان کی شخصیت مقناطیسی تھی کہ جس کو بھی اردو ادب سے لگاؤ ہے وہ خود بخود ان کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔آپ کا جذباتی اظہار ان کے لیے بے مثال خراجِ عقیدت ہے۔اللہ ان کی روح کو جنت بخشے۔

جگدیش پرکاش (انڈیا)

انا للہ و انا الیہ راجعون۔ابھی کل ہی آپ کے مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ذکرِ خیر پڑھا تھا۔ٹی آئی کالج کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک گہرا رشتہ تھا۔اللہ غریقِ رحمت کرے، آمین۔باخبر رکھنے کے لیے شکریہ۔

ناصر جمیل (امریکہ)

ڈاکٹر وزیر آغا جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے لیکن آپ کے ہمارے دلوں نے قبول نہیں کیا تھا، نہ اب ہی دل مان رہا ہے، جبکہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔بیٹا سہیل جاوید، (اہلیہ) شہناز خانم اور یہ سوگوار اُن کے غم میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

I share with you and with all lovers of Urdu literature the sad demise of Dr.Wazir Agha. Twenty years back I recited my Persian Ghazal in Iran Cultural Center Rawalpindi, Pakistan. He had presided that literary function. He admired my Persian poetry. May Allah shower His blessings and mercy on his soul. Amen.
Sincerely yours,
Dr.Maqsood Jafri , New York (USA)

ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔وہ بلاشبہ ایک عظیم دانشور تھے اور اردو ادب پر ان کے بہت احسانات ہیں۔ان کا گزر جانا ادب کا ایک بڑا نقصان ہے۔اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو اور ان کو چاہنے والے تمام علم دوست ساتھیوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔آمین۔

منیزہ جمال (سعودی عرب)

یہ بُری خبر پڑھ کر افسوس ہوا۔وزیر آغا صاحب کے ساتھ آپ کی خاص قربت کی وجہ سے آپ ان کی وفات پر تعزیت قبول کریں۔ڈاکٹر وزیر آغا اردو شعر و ادب میں نئے ذہن کے stalwart تھے اور ایک بنیادی اہمیت کے دانشور تھے۔لکھنے (اور پڑھنے) والوں کی ایک سے زیادہ نسلوں کے بڑے حصے نے اردو شعر و ادب و تنقید میں نئی زندگی اور نئی ذہن و فکر کا تعارف اور مطالعہ جناب وزیر آغا کی تنقیدی، تحقیقی کتابوں سے ہی کیا۔خود جناب وزیر آغا کی شاعری، خاص طور پر ان کی نظموں میں نئے ذہن و فکر کے وقیع نشانات ملتے ہیں۔ایک بار پھر افسوس اور تعزیت۔

کاوش عباسی (سعودی عرب)

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی وفات ہم سب کا مشترکہ صدمہ ہے۔عکاس انٹرنیشنل کے لیے انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔اچھے مشورے دیئے۔میرا کوئی ایسا ادبی حوالہ نہیں ہے لیکن انہوں نے اس طرح حوصلہ بڑھایا کہ کام کرنے کی لگن بڑھتی گئی۔
ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی مقام اور مرتبہ کو ابھی ہم لوگ پوری طرح سمجھ نہیں سکے۔سمجھنا تو بعد کی بات ہے، اردو دنیا تو ابھی انہیں پوری طرح پڑھ بھی نہیں سکی۔جب انہیں پوری طرح پڑھا جائے گا، پھر انہیں سمجھنے کی باری آئے گی اور اس کے بعد ان کے ادب میں مقام کا تعین ہو سکے گا۔موت العالِم موت العالَم!

ارشد خالد مدیر **عکاس** انٹرنیشنل اسلام آباد

جناب وزیر آغا صاحب کی وفات کی اطلاع پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔شعر و سخن پر اطلاع لگا دی گئی ہے۔

سردار علی (کینیڈا)

ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال کی خبر بجلی بن کر گری۔خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔(آمین) رمضان کے مبارک مہینے میں وصال پانا بھی بڑی بات ہے۔خدا ہم سبھوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے (آمین ثم آمین)

اقبال حسن آزاد (مونگیر، بہار)

وزیر آغا کی رحلت کی خبر کئی ذرائع سے ملی۔ آپ کا شکریہ۔ اردو ادب کا ایک عظیم نقصان ہوا۔ آج ایک عظیم قلم کار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی رخصت ہوا۔ اللہ سے ان کے لیے دعا گو ہوں کہ انہیں غریقِ رحمت کرے اور پسماندگان اور احباب کو صبر عنایت کرے۔ **عمران مشتاق** (برطانیہ)

آغا صاحب کی وفات نے سب کو دکھی کر دیا ہے۔ سب کا مشترکہ غم ہے۔ ان کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہے گا۔
عامر سہیل (ایبٹ آباد)

آغا صاحب کی رحلت اردو ادب کا بڑا نقصان ہے۔ **وقار جاوید**

---

it is a personal loss fot me. he was not only a good scholar wsitor but a good homan being too.i am stunned.but he will always live in his writings.
Arman Najmi (India)

مرحوم وزیر آغا کی وفات کا سن کر بے حد رنج ہوا۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون**۔ ابھی آپ نے پچھلے ہی شمارے میں ان کی دو طویل نظمیں شامل کی تھیں۔ **سہیل اختر**۔(Bhubaneswar ,India)

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب دنیائے ادب کے درخشاں قطبی ستارے تھے۔ اُن کی ادبی خدمات نے ادب کو فروغ دینے میں بلند کردار ادا کیا ہے۔ آپ یقیناً جدید اردو ادب کے مایۂ ناز دانش ور، شاعر و ادیب اور محقق تھے۔ اپنے عہد کے بہت بڑے تخلیق کار تھے اللہ پاک انہیں اپنے جوارِ رحمت میں بلند درجات عطا کرے۔ آمین۔ آپ کے دیرینہ ساتھی اور بزرگ تھے، مجھے بھی ایک دو بار ملاقات میں ان کی شفقت اور محبت حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ ''اوراق'' میں مجھے چھپنے کا اعزاز بخشا اور نیاز مندی نصیب ہوئی۔
افضل چوہان (مظفر گڑھ)

May ALLAH SWT laid him in peace; Amin. **Dr. Asmat Hayat Alvi**

Dr. Wazir Agha's Grand Services to Urdu language and Urdu literature will always be remembered.Just now , we posted to you the following message on the given format. Hope that you have received the same.
http://www.urdumanzil.com/2010/vaziragha/index.html
آج اردو ادب کی ایک اہم اور معتبر شخصیت ڈاکٹر وزیر آغا ہم سے رخصت ہو گئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

ہم ادبی منزل کی جانب سے ادبی برادری، ڈاکٹر وزیر آغا کے اہلِ خانہ، متعلقین اور دوستوں سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں۔ یہ صدمہ پوری ادبی برادری کا صدمہ ہے۔ **صبیحہ صبا، صغیر جعفری** (دبئی)

آپ کو ۸؍ستمبر کو وزیر آغا صاحب کے انتقال کی خبر دی تھی۔ اس دوران مختلف اخبارات میں خبریں اور مضامین نظر سے گزرتے رہے۔ وزیر آغا صاحب تخلیق کار کے طور پر بھی بہت بڑے تھے اور نقاد و دانش ور کے طور پر بھی بہت عظیم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں اُن کے پائے کا دوسرا دانش ور اب دکھائی نہیں دے رہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ **سعید شباب** (خانپور)

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی وفات کی خبر ہم سب کے لیے مشترکہ دکھ جیسی ہے۔ مجھے وہ دن یاد آ رہے ہیں جب وہ رحیم یار خاں اور خانپور تشریف لائے تھے۔ تب کانپور کے میونسپل ہال میں ایک تقریب کے علاوہ علاقہ بھر کی شاعرات کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی تھی۔ ایک اور بار سرگودھا میں اکبر حمیدی صاحب کی کتاب کی رونمائی کی تقریب میں شرکت کا موقعہ ملا تو میں وزیر آغا صاحب کی مہمان تھی۔ اکیڈمی آف لیٹرز کے ایک سالانہ جلسہ میں بھی ان سے ملاقات رہی۔ ہر بار ان کا شفقت آمیز اور شگفتہ برتاؤ بہت بھلا لگتا رہا۔ میں نے جتنا عرصہ شاعری کی، وزیر آغا صاحب نے مجھے بہت عزت اور محبت کے ساتھ ''اوراق'' میں شائع کیا۔ انہوں نے شاعروں اور ادیبوں کی کئی نسلوں کو ''اوراق'' کے ذریعے پال پوس کر جوان کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ان کی مغفرت کرے اور ان کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ **پروفیسر فرحت نواز**
شعبہ انگریزی۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین۔ رحیم یار خان

"Agha was given a Soft and Vast heart he encourage NewCreators,his thought provoking ideas and concepts influenced amongst two generation .His contribution towards Literature of 21st century always be Countable and unforgetable.Mourner Hashmi"
S. Anwer Javed Hashmi (Karachi)

وزیر آغا علم و ادب کے ایک درخشاں ستارے اور روشن مینار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اردو ادب میں ایک مستند اور منفرد مکتبِ فکر کے سرخیل اور روحِ رواں تھے۔ ان کا علمی، ادبی، تنقیدی اور تخلیقی کام ادبِ عالیہ کا درجہ رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے، آمین۔ **ناصر نظامی** (ہالینڈ)

وزیر آغا کی وفات پر میں بھی مغموم ہوں۔ ان دنوں میں آپ کے ملک جرمنی میں ہوں اور Essen کے میوزیم Folkwang سے آپ کو یہ میل بھیج رہا ہوں۔ **فاروق خالد** (ہالینڈ)

Dr.Wazir Agha was surely a legend poet writer and critic,his death is a great loss of Urdu World. **Ehsan Sehgal,**The Hague,Holland

---

I am grieved on sad demise of Dr. Wazir Agha.He was one of the most prominent figures of Urdu Literature.I have the honour to be his neighbour, in Civil Line Sargodha,during my school days.May Allah rest the departed soul in eternal peace, Aameen! **Khakan Sajid**

آپ جس طرح ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال پر مختلف مشاہیر کے احساسات جس طرح جمع کر کے یکجا کر رہے ہیں، یہ انتہائی احسن قدم ہے۔اردو ادب اور ثقافت میں ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال سے پیدا ہونے والا خلا پُر ہونا ممکن نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے ،اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا ہو۔

خادم علی ھاشمی(ملتان)

ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال کی خبر سن کر مجھے روحانی صدمہ پہنچا۔وہ ایک بڑے دل کے مالک تھے،بڑے نقاد تھے،اردو میں انشائیہ نگاری کو فروغ دینے میں انہوں نے اہم کام کیا ہے۔وہ ہمیشہ ادبی طور پر میرے دل کے قریب رہے اور ان سے میری خط و کتابت رہی۔وہ اپنی کتابیں اور''اوراق'' مجھے بھیجتے رہے۔میں ان کے ابدی سکون کے لیے دعا کرتا ہوں۔ **نذیر فتح پوری**(ایڈیٹر''اسباق''پونہ،انڈیا)

Dr Wazir Agha sahib urdu adab meiN os chatnawar darakhat ki haysiyaat rakhtay haiN Jis ke saaiee meiN poori ek nayee nasal parwaan charhi hai aur wazir agha sahib ki tanqeed say zahni parwarish hooi hai.un ke chalay janay say jo khalaa payda hooa hai oss ki bhrpaai mumkin nain. **Parvez Muzaffar**

Agha sb kee wafat maray baray dukhon main aik bara dukh hay.Woh is waqt urdu adbi dunya k sab say ziada bamutalia shakhsiat thay.Kuhda un ko apne jawar e rehmat main jagah day AMEEN Jadeed urdu nazm kay un ki masai zinda a javed rahan ge.

IQTIDAR JAVED

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب پاکستان کی پہچان تھے۔ان کی وفات دکھوں میں ایک بڑا دکھ ہے۔وہ اس وقت اردو ادبی دنیا کے سب سے زیادہ با مطالعہ شخصیت تھے۔خدا ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے،آمین۔جدید اردو نظم کے لیے ان کی مساعی زندہ جاوید رہیں گی۔**ڈاکٹر محمد عرفان صادق**()

ڈاکٹر وزیر آغا کے انتقال سے اردو دنیا اور خاص طور سے آپ کا جو نقصان ہوا،تکلیف اور دکھ ہوا۔ہم لوگ اس میں آپ کے ساتھ ہیں۔ **ڈاکٹر رضیہ حامد**(بھوپال)

میں اور''اثبات فیملی''اس سانحہ پر اہلِ غم کے ساتھ ہیں۔ **اشعر نجمی** ایڈیٹر اثبات ممبئی

وزیر آغا،سراج الدین آرزؔو کی روایت کا تسلسل تھے جنھوں نے بیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں کو اپنے افکار و تخلیقات کے ذریعے اُردو ادب کو نئی تنقیدی اور تخلیقی جہات سے متعارف کرایا۔تاہم وہ اپنے خیالات میں متشدد نھیں تھے اور ہمیشہ کھلے ذہن کے ساتھ اختلافِ رائے کو سنتے تھے۔اِسی لیے اُنھوں نے''اوراق'' کے صفحات میں ہمیشہ تعمیری اختلافات کو اہتمام سے شائع کیا کہ اسی سے قلب ونظر کو جلا ملتی ہے۔وزیر آغا اُردو دان ادبی حلقوں کو جدید مغربی تنقیدی رویوں سے متعارف کرانے کے باوجود ان کے سیلاب میں بہہ نہیں گئے بل کہ ہمیشہ اپنی روایت اور دھرتی سے جڑے رہے کہ یہی اُن کی اساس تھی۔جب کہ اُنھوں نے تخلیقی سطح پر''اوراق'' کے صفحات کو انشائیہ، ماہیا اور ہائیکو کے لیے مخصوص کر کے اُردو ادب نثر و نظم کو نئی اصناف سے مالا مال کیا۔

وزیر آغا نے اپنی تحریرات (بشمول افکار،تخلیقات اور رویوں) سے نئی نسل کے متعدد تخلیق کاروں اور نقادوں کو متاثر کیا جو اپنے اپنے رنگ میں اُن کے کام کو آگے بڑھا بھی رہے ہیں۔ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ نئی نسل کے یہ تخلیق کار اور نقاد وزیر آغا کے پیروکار بن کر ہی نہ رہ جائیں بل کہ اُن جیسی وسعتِ قلبی سے نئے نظریات اور خیالات پر کان دھرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہیں۔ **مبشر احمد میر**(گجرات)

وزیر آغا کی شناخت کی کئی جہتیں ہیں۔شاعری،تنقید،انشائیہ،صحافت......انھوں نے زندگی کی شادابیاں دیکھی تھیں۔تلخیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ذاتی زندگی میں ان کے لیے فرسٹریشن جیسی چیز عنقا تھی۔ان کے پاس وہ حساس دل بھی تھا،جو ان کی شاعری میں دھڑکتا ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ روایت کے معاملے میں لکیر کے فقیر نہ تھے،اور حقیقت بھی یہی ہے کہ روایت لکیر کا فقیر ہونے کا نام نہیں۔نفسیات اور فلسفے کو انھوں نے اپنا موضوعِ خاص بنایا۔ادبی تنقید کو انھوں نے مختلف علوم کی مدد سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی۔ان سے کئی سنجیدہ اور اچھے مضامین یادگار ہیں۔انھوں نے کئی مستقل موضوعات پر بھی کام کیا۔انشائیے کے خدوخال متعین کرنے کی کوشش کی،لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج تک انشائیے کی کسی ٹھوس تعریف کا تعین نہیں ہوسکا۔اتنی بات تو ادب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہی ہیں کہ انھوں نے انشائیے کے لیے کیا کیا۔وہ اس صنف کے استحکام کے لیے،جو کر سکتے تھے،کیا۔وہ انشائیے کے رجحان ساز ہیں۔'اوراق' کے صفحات کے ساتھ اس صنف پر ان کی ایک باقاعدہ

کتاب بھی ہے۔اگر بات صحافت کے سلسلے میں کی جائے تو ان کے اندر کے صحافی کو تو سب سے پہلے محبِّ اردو، وقارِ صحافت، ژرف نگاہ صحافی مولانا صلاح الدین احمد نے دریافت کیا تھا۔'ادبی دنیا' سے [وابستگی سے لے کر'اوراق' تک کا سفر انھوں نے تنہا طے نہیں کیا۔ان کے ساتھ قدم قدم پر وہ تجربات بھی چلتے تھے، جن سے ان کی شخصیت عبارت تھی۔اس سفر میں مخالفتیں بھی خوب ہوئیں۔مخالف سمت سے جو آوازیں اٹھ رہی تھیں، وہ کتنی صحیح یا غلط تھیں، یا ان کے اسباب وعلل کیا تھے، ان کی تہ میں اترنے کا یہاں موقع نہیں۔البتہ، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مخالفت بھی اسی کی ہوتی ہے، جو کچھ کرتا ہے۔وقت سب سے بڑا منصف ہے۔وہ خود طے کر دیتا ہے کہ کھرا کون ہے اور کھوٹا کون۔

وزیر آغا کا حساس دل، جو ان کی شاعری میں، تنقید میں، انشائیے میں اور، اداریے میں بولتا تھا، آج خاموش ہے، لیکن ان کی تحریر کے الفاظ میں وہی حرکت ہے۔ان کا لفظ لفظ آج بھی بول رہا ہے......لفظ مردہ نہیں ہوتا......لفظ زندہ ہوتا ہے۔

معید رشیدی (دہلی)

YOUR COMPILATION OF REACTIONS AND CONDOLENCES ABOUT THE DEPARTING OF A HIGHLY INFLUENCIAL AND TOWERING FIGURE IS A SERVICE TO URDU LANGUAGE. NO DOUBTTHERE IS NO ONE TO REPLACE HIM....... THANKS.

Prof. Gopi Chand Narang
Emeritus Professor, Delhi University
Former President, Sahitya Akademi
(National Academy of Letters, India)
D-252, Sarvodaya Enclave,New Delhi 110017 India

EXPRESSION OF GRATITUDE

I sincerely appreciate the messages of condolences, impressions and articles relayed by literary personalities, well wishers and admirers from all over the world on the sad demise of my father, Dr. Wazir Agha. His death not only has left a huge void in my personal life but has also dealt a severe blow to Urdu language and literature.

SALIM AGHA QIZILBASH

Life and times of Dr Wazir Agha – Urdu's most noted critic

By Dr Amjad Parvez

It pains me to add the word 'late' to Dr Wazir Agha's name, whom I found to be a great intellectual, a good friend and an excellent human being. Dr Agha's journey in literature is aptly summed up by his couplet: kehney ko chandgaam tha yeh arsa-e-hyayat, lekin tamaam umr hi chalna para mujhey.

Dr Wazir Agha saw his destination only a few steps away, but he had to walk (struggle) all his life to accomplish what he desired to achieve. Perhaps that is true for all of us. He started his journey in this world on May 18, 1922 in a village in Sargodha district. In his autobiography 'Shaam Ki Mundair Sey', Dr Wazir relates how his father obtained a janam patri from a pandit at his birth. However, he did not open it all his life.

He also reveals that his father was a businessman who dealt in horses from the Persian-speaking Qizilbash family. Dr Agha's father obtained 750 acres of land from the British government in Sargodha district. His father used to speak in Farsi with his elder sisters, but would converse in Punjabi with his mother, who was a Punjabi.

So, Wazir Agha picked up Farsi from his father, Punjabi from his mother and the English language from his British friends. He was entrusted to the care of a family friend, Shah Saheb, who was a teacher in a far-flung Sikh village.

During his school years, Dr Agha developed a strong fondness for Urdu ghazals and started composing poetry on his own.

Dr Agha was introduced to literary circles in 1948 when his poems were published in Maulana Salahuddin Ahmad's then famous literary magazine 'Adabi Duniya'. Later, he served as the co-editor of the magazine from 1960 to 1963.

He did his graduation from the Government College, Jhang and later masters in Economics from Government College, Lahore. He was awarded the degree of doctorate by the University of Punjab in Urdu Literature (humour) in 1956.

Renowned physicist Dr Abdul Salam, who was also studying at Government College, Jhang at the time, was recognised by Dr Agha as a young man of outstanding intellectual qualities. Wazir Agha was the editor of the college magazine 'Chanab' and on his request, Salam wrote a play for the magazine. Next year, Agha left for Lahore. In his book 'Inshai Tanqeed', Professor Jamil Aazar equated Wazir Agha's 'Dastak Us Key Darwazey Par' with Hermann Hesse's novel 'Journey to the East', and an evening with words and their meanings behind them, amongst others.

Daily Times Friday, September 10, 2010

Dr Wazir Agha

a source of inspiration for writers

By: Munir Ahmed

ISLAMABAD – Dr Wazir Agha, the founder of a new school of criticism in Urdu literature, is buried in his ancestral village Wazirkot, Sargodha Wednesday. He died Tuesday night after protracted illness.

He was a trend-setter poet, critic and intellectual who have written more than 50 books. Some of them are “Urdu Shairi Ka Mizaaj”, “Naey Maqlat”, “Urdu Adab Mein Tanz-o-Mazah”, “Tanqeed-o-Ehtasab”, ”Tanqeed-o-Majli Tanqeed”, “Tanqeed aur Jadeed Urdu Tanqeed”, “Nazam-e-Jadeed ki Karwatain”, “ Ghaas Mein Titlian” (poetry), “Khayal Paray” (Inshaiye). He launched a literary magazine “Auraq” and edited it for decades. Auraq is considered as a trend-setter magazine in Urdu Literature.

Born in 1922, Dr Wazir Agha introduced many theories in Urdu literature. He is most famous for his work on Urdu humour. He has also written a seminal book on modern Urdu poets, notably those who have written more poems than ghazals. He has also written poetry and his poems mostly have an element of story.

Author of more than fifty books on criticism, poetry and other genres, Agha has lived life to the full. Cooped up in his room, he has been welcoming many a lover of literature who thronged his house from dawn to dusk even during his illness.

When and how did he start writing? This question is well answered by Wazir Agha in his recently published interview. He says, “I was studying at Government College Lahore when I fell in love with Urdu nazm. It fascinated me a lot in those days. I read poetry of Meera Jee, N M Rashid, Faiz, Majeed Amjad. I too started writing poetry. But I did not send these poems to any magazine. Later in 1944, I came across Maulana Salahuddin Ahmad who was the editor of famous magazine ‘Adabi Duniya’. His encouragement proved to be very beneficial for me and I started writing poetry with more zeal.”

....

Dr Wazir Agha is a great name in criticism and his best-known Urdu works are: Adam Mein Tanz-o-Mazah (1958), Takhleequi Amal (1970), Urdu Shairi Ka Mizaaj (1965), Tasawuraat-e- Ishq-o- Khird – Iqbal Ki Nazar Mein (1977), Majeed Amjad Ki Dastaan-e-Muhabbat (1991) and Ghalib Ka Zauq-e-Tamasha (1997).

His essays titled ‘Nazam-e-Jadeed Ki Karwatein (1963), Tanqeed Aur Ehtesaab (1968), ‘Naye Maqaalaat’ (1972), ‘Naye Tanaazur’ (1979), ‘Ma’ani Aur Tanaazur (1998), ‘Tanqeed Aur Majlisi Tanqeed’ (1975), ‘Daairey Aur Lakirein’ (1986), ‘Tanqeed Aur Jadeed Urdu Tanqeed’ (1989), ‘Inshaiye Kei Khad-o-Khaal’ (1990), ‘Saakhtiat Aur Science’ (1991), ‘Dastak Us Darwaazey Par’ (1994) and ‘Imtizaji Tanqeed Ka Scienci Aur Fikri Tanaazur’ (2006) fall in the same category.

In 2007, I had observed while commenting on his book ‘Imtizaaji Tanqeed’ that Dr Wazir Agha promoted the concept of the artist’s presence in his creation. Later, he went a step ahead and challenged the theory of negating artist’s presence in the literary text. He believed that without expressing one’s person in the creative process, a piece of literature cannot be created. With the decline of post-modernism, Western critics seem to have accepted this point of view as well. According to Colin Davis’ book ‘After Post-structuralism’ it was Julia Kristeva who was the propagator of the extinction of artist from the centre and who declared the creator as anti-essentialist or anti-universalistic. Over time, she has amended her point of view and now says that instead of centrality.

This change occurred in Kristiva when she herself wrote a novel. However, the interesting fact is before Julia Kristiva changed her mind, Dr Wazir Agha had fully understood and comprehended the concept of presence of the author in his creation in the milieu of creative process. He had also negated the concept of gradual diminishing of the artist’s presence in his creativity as forwarded by Roland Barthes. So, in the context of Urdu literature, Dr Agha contended that the intelligence of critics of the present era was exposed when they kept on repeating the concepts of structuralism. Dr Agha stuck to the principles of synthesis in the creative process and has stayed away from the limitations imposed by earlier theories in criticism.

It will take a lot of time and space to cover Dr Agha’s poetry (15 books) and kuliyaat (four books). Famous poet Naseer Ahmad Nasir introduced me to Dr Agha two decades ago and I had the privilege of studying all his books and commenting on them. It was only a month ago that Dr Agha called me and asked me to visit him at his residence on Sarwar Road, Lahore Cantonment. Due a personal engagement, I could not visit him and I will regret missing this opportunity for the rest of my life. Dr Agha passed away on September 7. His literary legacy will live on and his contribution to Urdu literature will continue to inspire poets, writers and critics alike for a long time to come.

....

The Nation | Published: September 09, 2010

in memory

An era unto himself

By Hammad Ghaznavi

Dr Wazir Agha initiated, or at least made a key contribution to, every literary debate in the subcontinent during the last six decades. A mentor to a generation, he was one of the most influential literary figures of his times.

Though not a formal student of Urdu literature, I had read poets beyond Faiz and Faraz during my school days but had never heard of Wazir Agha. Even Abid Ali Abid and Dr Syed Abdullah sounded familiar but not Wazir Agha. He was certainly not a 'pop' poet or writer.

I first read his name during my last college year. It was a piece on Faiz Sahib, pointing at his 'self-repetition' as a poet. "Repeating yourself is worse than repeating others," it said. That was blasphemy: absolute blasphemy! Faiz was god those days particularly in the circles that we moved in. Before that essay, I had heard criticism of Faiz only on the ideological basis. I was intrigued by one Mr Dr Wazir Agha.

A couple of months later, in the 'Urdu Literature' section of the then newly-founded Quaid-e-Azam Library, I chanced upon 'Urdu Shairi Ka Mizaj' by the same author. I read the book in two sittings, super-quick by my standard. As I finished the book, I started re-reading it, perhaps the only book of prose to-date that I went back to without a time lapse. I took notes and copied almost all the names mentioned under the bibliography and started looking for those books.

'Urdu Shairi Ka Mizaj' played a crucial role in my personal journey from having an interest in Urdu literature to becoming a serious student of the discipline.

Even today I find Agha Sahib's interpretation of the origins and the development of Urdu poetry stimulating. His is not the only point of view on the subject but is definitely one of the more valid ones, creatively constructed and effectively supported by a trove of information that comes with serious learning.

The account of my first meeting with Agha Sahib, followed by dozens in the later years, is not a drab story. When I entered journalism, I wanted to write on literature with the journalistic bite and not as a literary critic, since that was neither my stature nor my

aspiration.

One day, Shehzad Ahmad, a respected poet, scholar and a dear friend, suggested to me that I should do a story on the 25-year-long feud between the two literary groups headed by Ahmad Nadeem Qasmi and Dr Wazir Agha, and how it had impacted the literary scene in the country. It was a very controversial subject. I liked the idea and started working on it. In the following weeks, I met or talked to a long list of writers, poets, publishers, etc, from Intizar Hussain and Muzaffar Ali Syed to Habib Jalib and Niaz Ahmad of Sang-e-Meel Publications. Having thoroughly done my homework, I was ready for the final interviews of the two 'Dons', Qasmi Sahib and Agha Sahib.

First, it was Qasmi Sahib, a sensitive soul and a thorough gentleman. He explained his point of view gracefully. His 'Don' image, however, suffered a serious blow. Beneath the armour of perhaps the tallest literary figure of his times, there was innocence.

I had already seen Qasmi Sahib on tv and mushairas but with Agha Sahib it was different — for he had never been on tv (and those were pre-YouTube days).

Agha Sahib's smile was child-like. He was humble, friendly and courteous. Another 'Don' bit the dust! Like Qasmi Sahib, he was jovial. His erudition surfaced only when I asked for it.

In brief, both Agha Sahib and Qasmi Sahib did not look like two bosses heading two warring literary camps, having in their arsenals two literary magazines (Auraaq and Funoon respectively), an army of writers, columnists and critics promoting only the writers belonging to their own camp and belittling the works of the members of the rival gang.

Qasmi Sahib and Agha Sahib were once friends. Despite an earlier failed attempt at rapprochement, they still wanted a patch-up. Mansoora, Qasmi Sahib's foster daughter and his guardian angel, once graciously showed to me her willingness to go to Agha Sahib as a first step towards a thaw. We could not pull it off, unfortunately.

In a word, the truce remained 'elusive' because of those sidekicks, more-loyal-to-the-king-types, who had crossed all realms of decency in their writings. On each side, they formed baggage that torpedoed all such efforts.

(It was one of the more talked-about literary pieces of my career. It was translated in many vernacular newspapers and literary journals, Khaled Ahmed wrote an editorial note on it and so on. It kicked off many a controversy. Amjad Islam Amjad said something in his interview that Qasmi Sahib did not like while Agha Sahib said something that Dr Anwar Sadeed sharply reacted to, leading to intra-camp tribulations. In short, that was, so to speak, my first five wicket haul in journalism).

Pardon my digression and back to Agha Sahib.

In the ensuing years, I was one of his regular visitors. I was impressed by his learning and he

was kind to me. There was a small cluster of friends every other day at his place comprising poets and writers. Agha Sahib was certainly the most well-read and respected figure in that group. He, however, never tried to impose his opinion on others. Curiosity rather than authority was the hallmark of his talks.

I learnt a lot from him. For hours on end, we would discuss the creative process, our mutual interest number one. He gave me all his books one by one. First, we discussed a book and then he gave me the next one. From 'Urdu Adab Mein Tanzo Mizah' to 'Dastak Uss Darwaazay Per', he gave me almost all his books. From Saussure to Roland Barth, he explained various writers to me. I still have his drawings he did explaining structuralism to me.

Inshaia was a genre that he was committed to promoting in Urdu. He used to give dozens of examples to separate satire and humour from light essay (Inshaia). His contribution to this cause is unparalleled.

He was a voracious reader. One day I went to him and he was very happy with some new books in his hands. He had bought them from the net. One book was on the concept of Meme and a couple of others were on Quantum Physics. He was excited at the prospect of getting the books through this new means.

Agha Sahib once asked me to write the foreword of his self-translated book of poetry, 'The Symphony of Existence'. I dillydallied. He asked me again. I finally mustered courage and refused. He was not expecting it but took it gracefully. The episode did not affect our relationship. Did I do the right thing, I still sometimes wonder.

Agha Sahib died last week. The literary landscape in this country looks even more barren. There can be two opinions on various aspects of his literary personality but one thing is irrefutable — Agha Sahib was one of the most well-read men of his times with a life-long commitment to the creative process and promotion of literature; who influenced generations and determined the course of literary history of his times in this apart of the world.

Tags: daily times, DAWN, Death of Dr. Wazir Agha, Dr. Wazir Agha, Dr. Wazir Agha passes away, Government of Pakistan, gulzar, india, indian press, jhang, Muhammad Shahbaz Sharif, Natioinal Loss, News, Poetry, President Asif Ali Zardari, The News, Urdu, Urdu literature

This entry was posted on Sunday, September 12th, 2010 at 6:03 am and is filed under Impressions. You can follow any responses to this entry through the RSS 2.0 feed. You can leave a response, or trackback from your own site.

....

THE NEWS Lahore 19.9.2010

A word about letters

A farewell to Dr Wazir Agha

By Kazy Javed

The first night of the second week of September was the only pleasant night of the rainy season in Lahore — but its morning was spoilt by columnist Nasir Bashir's five-word telephonic message: "Dr Wazir Agha is dead."

It was only a few weeks ago that Agha Sahib's friends celebrated his 88th birthday and I organised a public lecture on his life and literary works at the Model Town Park. He was pleased when I called him to offer congratulations.

"Yes, Kazi Sahib," he said, "I have completed 88 years of my life. Old age has now confined me to the four walls of my house. But I am not suffering from any sort of Kafkaesque loneliness. I read books, watch television and am blessed occasionally with visits of my children and friends.

I chimed in: "Dr Anwar Sadeed Sahib told me you are composing poetry."

"Yes, I can't stop it," he replied.

With 15 collections of poetry to his credit, Dr Wazir Agha always insisted he was a poet first and a critic or essayist second. Like many of his readers and admirers I never agreed. I consider his 'Urdu Shairi ka Mizaj' his best work. The book presents a deeper analysis of the cultural and historical factors that played vital role in the formation of Urdu poetry.

The book caused many controversies because many were not willing to accept that poetry was linked to the soil. Some of Dr Agha's other writings too attracted critics including those who stooped to disparaging.

The number of Dr Wazir Agha's prose books in not less than 30. More widely read among them are collections of light essays. His first book that came my way was a book of essays titled 'Musarrat ki Talash' which is the exact Urdu translation of the title of Bertrand Russell's famous work 'Conquest of Happiness. I got Agha Sahib's book from my fathers' collection and it really fascinated me.

Dr Wazir Agha spent many years of his life in Lahore. He is buried in Wazirkot, a village near Sargodha where he was born in 1922.

....

The News Lahore 19.9.10

میرے نزدیک دونوں بزرگوں کے ٹوٹل کام کی بنیاد پر ہی ان کا مجموعی Impact بنے گا۔ ان کو خانوں میں تقسیم کر کے یعنی احمد ندیم قاسمی کی غزل کو ان کے افسانے سے لڑا کے یا آغا جی کی نظم کو ان کی تنقید سے لڑا کے تو وہ آغا جی Verses آغا جی اور قاسمی جی Verses قاسمی جی تو یہ بات نہیں بنے گی۔ ان کے ٹوٹل ورک سے ہی ان کا ٹوٹل Impact بنے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کسی صنف یا تحریر میں اس قدر مضبوط ہوں کہ دوسری صنف نسبتاً کچھ کم لگے لیکن جو بڑے Artist ہوتے ہیں۔ ان کی کمزور تحریر کا بھی کوئی کم از کم Level ہوتا ہے۔ اور وہ کم از کم Level جو ہے وہ بہت سوں کے بڑے لیول سے بھی زیادہ ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ کسی ایک حوالے سے ان کی پہچان مقرر کی جائے۔ ہاں آغا جی کے حوالے سے میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ ان کا اکیڈمک لیول انتہائی ہے کہ ان کو تو ابھی تک پاکستان میں صحیح طرح سے سمجھا ہی نہیں گیا۔ (**حیدر قریشی** کے ایک انٹرویو سے اقتباس۔ مطبوعہ **عکاس** اسلام آباد۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

وزیر آغا

عمر کی اس ناؤ کا چلنا بھی کیا،رُکنا بھی کیا
کِرمکِ شب ہوں مِرا جلنا بھی کیا،بجھنا بھی کیا

اک نظر اُس چشمِ تر کا میری جانب دیکھنا
آبشارِ نور کا پھر خاک پر گرنا بھی کیا

زخم کا لگنا ہمیں درکار تھا،سو اُس کے بعد
زخم کا رِسنا بھی کیا اور زخم کا بھرنا بھی کیا

تیرے گھر تک آ چکی ہے دُور کے جنگل کی آگ
اب ترا اس آگ سے ڈرنا بھی کیا،لڑنا بھی کیا

در دریچے وا مگر بازار گلیاں مُہر بند
ایسے ظالم شہر میں جینا بھی کیا،مرنا بھی کیا

تجھ سے اے سنگِ صدا،اس ریزہ ریزہ دور میں
اک ذرا سے دل کی خاطر دوستی کرنا بھی کیا

وزیر آغا

اتنے چپ چاپ کبھی رات کے تارے بھی نہ تھے
اور یوں مُہر بہ لب زخم ہمارے بھی نہ تھے

کیسی عجلت میں کیا اپنوں نے اقرارِ شکست
ہم ابھی پوری طرح جنگ تو ہارے بھی نہ تھے

شب کی تزئین کی خاطر ہمیں جانا ہی پڑا
شام کے کام ابھی ہم نے سنوارے بھی نہ تھے

کاغذی ناؤ تھی،منجدھار میں دَم توڑ گئی
پاس پتوار بھی تھی،دور کنارے بھی نہ تھے

رات تھی،ریت تھی،بے نور سفر تھا،ہم تھے
سمت ناپید تھی،گردوں سے اشارے بھی نہ تھے

اُس کے پیکر کو سمجھنے میں ہوئی عمر تمام
نقش اُس کے ابھی ہم نے تو ابھارے بھی نہ تھے

کیوں زمانے نے ہدف ہم کو بنایا تھا کہ ہم
خاک زادے بھی نہ تھے،راج دُلارے بھی نہ تھے

آ گئے کرچیاں پھولوں کی لیے آج وہ پھر
ہم نے احسان ابھی اُن کے اتارے بھی نہ تھے

صبا اکبر آبادی

ہر ایک کو خوش رکھنے میں کوئی نہ ہوا خوش
میرے دلِ مخلص سے نہ بندے نہ خدا خوش
ہیں نا خوشیٔ حسن پہ اربابِ وفا خوش
اللہ اسے خوش رکھے جو ہم سے ہے ناخوش
تو شمع کی دشمن ہے شگوفوں کی ہوا خواہ
اے بادِ سحر یہ تو بتا کون ہوا خوش
ہے لطفِ خلش حاصلِ آوارہ خرامی
رہتے ہیں بیاباں میں ترے آبلہ پا خوش
حاصل ہے مکافاتِ عمل حسب توقع
دوزخ میں نہیں آج کوئی میرے سوا خوش
واقف ہے مرے جذبۂ خود داریٔ دل سے
اٹھتے نہیں جب ہاتھ تو ہوتی ہے دعا خوش
کچھ پختگیٔ عشق کے آثار تو پائے
ظالم کے تغافل نے مجھے اور کیا خوش
دنیا میں ہوئے آ کے شریکِ غم دنیا
اس بزم میں کیا ہنستے جہاں کوئی نہ تھا خوش
ہے دل پہ مرے کفرِ محبت کا جو الزام
اس کفر پہ میں خوش ہوں صبا میرا خدا خوش

صبا اکبر آبادی

جس میں کمی ہو کچھ وہ نہیں چاہتا ہوں میں
وہم و گماں بہ حد یقیں چاہتا ہوں میں
دنیا پہ اقتدار نہیں چاہتا ہوں میں
اقلیمِ دل کو زیرِ نگیں چاہتا ہوں میں
جب تو نہیں تو خیر تری آرزو سہی
جلووں کو بے حجاب نہیں چاہتا ہوں میں
میں خاک ہوں مگر مری ہمت بلند ہے
ایک ایک ذرہ عرش نشیں چاہتا ہوں میں
دل ہی تو ہے بدلنا تھا آخر بدل گیا
کل چاہتا تھا آج نہیں چاہتا ہوں میں
اے گردشِ بہارِ جہاں میری بات سُن
جو پھول جس جگہ ہے وہیں چاہتا ہوں میں
اک پیکرِ جمال ابھی تک ہے سامنے
آنکھوں سے تجھ کو اور قریں چاہتا ہوں میں
اک شاخ پر سجا لئے تنکے تو کیا ہوا
صیّادِ گُل چمن تو نہیں چاہتا ہوں میں
تم نے تو مجھ سے میری تمنا بھی چھین لی
اب اور التفات نہیں چاہتا ہوں میں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کسے چاہتے ہو تم
کہہ دوں کہ آپ کو تو نہیں چاہتا ہوں میں
اس رنگِ رخ کا عکس پڑے گا کب اے صبا
ہر پھول کو کچھ اور حسیں چاہتا ہوں میں

اسلم انصاری (ملتان)

کچھ تو احوالِ غمِ دل بھی سنایا ہوتا
رُک گیا تھا تو اُسے اور بھی روکا ہوتا

شام اُتری ہے سرِ عرصۂ صحرائے خیال
منظرِ دل سے کوئی چاند بھی اُبھرا ہوتا

کسی پتے سے ہی ملتا کوئی عنوانِ بہار
پھول کوئی تو سرِ شاخ بھی مہکا ہوتا

جس کی گلیوں میں ہوا بن کے پھرے ہیں برسوں
کوئی اُس شہر سے اپنا بھی علاقہ ہوتا

وہ ملا تھا سرِ راہے، پہ بہت لوگ تھے ساتھ
آج کی شام تو وہ شخص اکیلا ہوتا

لے اُڑی تجھ کو کہاں منزلِ جاناں کی ہوا
نا سمجھ ، راہ میں کچھ اور بھی کھویا ہوتا

شام ٹھہری ہوئی ہوتی ، لبِ جُو تُو ہوتا
عکس پانی میں ترے رُخ کا لرزتا ہوتا

اسلم انصاری

شدتِ تلخیٔ حالات بڑھا دیتی ہے
آگہی، درد کے شعلوں کو ہوا دیتی ہے

کس کی آہٹ پہ فضا کان دھرے بیٹھی ہے
خامشی کس کو سرِ شام صدا دیتی ہے

نکہتِ گیسوئے دلدار کہاں بکھری ہے
پوچھتا ہوں تو ہوا خاک اُڑا دیتی ہے

کتنے ہی تاروں کا خوں ہو ، تو کرن بنتی ہے
روشنی بھی کسی ظلمت کا پتا دیتی ہے

کون ہوتا ہے شریکِ غمِ ہستی ، اے دوست
ڈال بھی سوکھے ہوئے پات گرا دیتی ہے

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

اک پہاڑی سلسلے میں کھو گیا ہوں
شام ہے اور راستے میں کھو گیا ہوں

آئینے میں ڈھونڈتا رہتا تھا خود کو
اب آپ اپنے آئینے میں کھو گیا ہوں

ہر کس و ناکس کو رہبر کر لیا تھا
سب سے رستہ پوچھنے میں کھو گیا ہوں

وہ ہجومِ آرزو تھا مجھ میں اکبر
میں خود اپنے قافلے میں کھو گیا ہوں

اکبر حمیدی

اور کچھ چاند رات آگے بڑھے
جو دلوں میں ہے بات آگے بڑھے

سب ہے انساں کی پیش قدمی پر
یہ بڑھے، کائنات آگے بڑھے

میں ہی رہتا ہوں اپنی ذات میں بھی
میں بڑھوں ،میری ذات آگے بڑھے

تین سے سات تک تو پہنچا ہوں
تب مزہ ہے جو سات آگے بڑھے

ناچیں اودھم برات کے لونڈے
یہ ہٹیں تو برات آگے بڑھے

کچھ ادھر کا اشارہ ہو اکبر
تو ہمارا بھی ہات آگے بڑھے

احمد ہمیش (کراچی)

کچھ نہیں ،کچھ نہیں ہے دنیا میں
یعنی دنیا نہیں ہے، دنیا میں

یہ تصور محال ہے گویا
ہم فقط جی رہے ہیں دنیا میں

آدمی ہے خیال سے باہر
صرف باقی ہے خدا دنیا میں

درد تو درد کے بغیر نہیں
یعنی دنیا نہیں ہے دنیا میں

تم محبت کی بات کرتے ہو
کیامحبت نہیں ہے دنیا میں

تم نے کس سے کہا ہے دنیا میں
تم نے کس سے سُنا ہے دنیا میں

تاجدار عادل

شہر کور چشماں میں عُذرِ کم نگاہی کیا
شب پرست لوگوں میں صبح کی گواہی کیا
وہ تو جیسا موسم ہو اُس طرح کے ہوتے ہیں
مصلحت پسندوں کو کچھ بھی ہو بُرا ہی کیا
تم اگر نہ مل پائے، مان لو، نہ ہوگا غم
دل کھنڈر رہے پہلے ہی دل کی پھر تباہی کیا
وحشیوں کی دنیا میں زخم و گل تو یکساں ہیں
نفرتوں کے نرغے میں عشق کا سپاہی کیا
رات کا اندھیرا کیا، سورجوں کی بستی میں
وقت کی عدالت میں داستاں پناہی کیا
سلطنت زمانے کی ہم فقیر ٹھکرادیں
جھونپڑی میں گوتم کی قدرِ بادشاہی کیا
خواہشوں کے جنگل میں راستے بھی دلدل ہیں
پاگلوں کی بستی میں امر کیا نواہی کیا
بارشوں کے موسم میں بے ایاغ مستی میں
فخر پارسائی کیوں عجزِ بے گناہی کیا
دل میں رنگ اس کے ہیں کوئی شکل دیکھیں ہم
آئینے کی آنکھوں میں عکس کی گواہی کیا
رات اس کے خواب عادلؔ ہم نے اس کو پھیرے تھے
باغیوں کی نظروں میں شان کج کُلا ہی کیا

تاجدار عادل (کراچی)

کوئی ساتھی نہیں ڈھونڈا تھا محبت کے سوا
اجنبی کون ملا تیری رفاقت کے سوا
آئینہ خانۂ خواہش میں ہے چہرہ اُس کا
اور میں کچھ بھی نہیں ایک بصارت کے سوا
ہجر کی خاک سے وحشت کا شجر پھوٹتا ہے
اک تباہی ہے ترے بعد قیامت کے سوا
شیشۂ جبر کو انکار کے پتھر دینا
ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھے تھے عبادت کے سوا
بہہ گئے وقت کے طوفان میں بے سمتِ سفر
عشق کی راہ میں سب کچھ ملا قسمت کے سوا
دستِ دنیا سے بچایا تری یادوں کو سدا
ہر خزانے کو لُٹایا ہے امانت کے سوا
اب تو بازار تمنا میں نکل آیا ہوں
گوشہ گیری نے دیا کیا مجھے شہرت کے سوا
مجھ کو ہر چیز ملی ہے مری خواہش سے الگ
میرا ہر مول لگا ہے مری قیمت کے سوا
اتنی خوبی تو کبھی عشق کا حصہ ہی نہ تھی
ہاں تجھے یاد کیا ہے تری چاہت کے سوا
ایک دریا کے کنارے تھیں وہ آنکھیں روشن
عکس سارے ہی تھے جن میں غم فرقت کے سوا
بس وہی دیکھنا چاہا جسے دل نے مانگا
کوئی صورت نہیں چاہی تری صورت کے سوا
مڑ کے دیکھا ہے اگر عمر گزشتہ کو کبھی
کوئی لذت نہ ملی عشق کی لذت کے سوا
جب بھی دیکھا ہے نظر اس کو اٹھا کر عادلؔ
آئینہ کچھ بھی نہیں تھا مری حیرت کے سوا

تاجدار عادل

ڈھلتی محبتوں کا پکارا تو کچھ نہ تھا
گرتی عمارتوں کا سہارا تو کچھ نہ تھا
ہم راہ جو چراغ تھا سورج میں ڈھل گیا
دن میں کھلا کہ رات کا تارا تو کچھ نہ تھا
سب کچھ عطائے دوست تھی واپس وہ لے گیا
ہم تو امینِ غم تھے ہمارا تو کچھ نہ تھا
اک شخص کے حوالے سے دیکھی تھی کائنات
تھا حسن اس کے دم سے نظارہ تو کچھ نہ تھا
خوابوں میں عمر کاٹ کے جاگے تو خواب تھے
تعبیر زندگی کا اشارا تو کچھ نہ تھا
اک شخص ملنے آیا تھا دل کے جزیرے میں
لہروں نے خواہشوں کو اُبھارا تو کچھ نہ تھا
آہنگ فکر ایک ملا جب بھی ہم ملے
حالانکہ اس سے ربط ہمارا تو کچھ نہ تھا
موجوں میں بہہ گیا تھا خیالوں کا شہر بھی
یادوں نے اُس کی پار اتارا تو کچھ نہ تھا
تتلی کا حسن کھوگیا جب اور رنگ دیا
ہیرے کو دل نے اور سنوارا تو کچھ نہ تھا
دل پر جو اس کا نقش تھا کیا چھینتا کوئی
رنگوں سے اس نے رنگ اتارا تو کچھ نہ تھا
اچھی گزر رہی ہے مگر کیا امید تھی
جینے کا اس کے بعد سہارا تو کچھ نہ تھا
سب کو ہمارے بارے میں تھیں خوش گمانیاں
اس میں مگر قصور ہمارا تو کچھ نہ تھا
عادلؔ یہ کیا ہوا ہے کہ اس کو بھلا دیا
اس سے زیادہ تم کو پیارا تو کچھ نہ تھا

خورشید اکبر (سمستی پور)

دھوپ کا سائباں پھر ضروری ہے کیا
اک نیا آسماں پھر ضروری ہے کیا

آنسوؤں کی زباں پھر ضروری ہے کیا
دُھند میں کہکشاں پھر ضروری ہے کیا

زخم سوغات اس کی شریعت میں ہے
مذہبِ دوستاں پھر ضروری ہے کیا

شہر کا شہر پھر بے پناہی میں ہے
حسرتِ رائگاں پھر ضروری ہے کیا

نامرادی ہی جب اپنی تقدیر ہے
اک ترا آستاں پھر ضروری ہے کیا

ہر پرندہ تری دسترس میں نہیں
اس یقیں پر گماں پھر ضروری ہے کیا

درد تیری امانت مری جان ہے
ذائقہ داستاں پھر ضروری ہے کیا

وحشتوں کی قسم گھر بیابان ہے
شہرِ آوارگاں پھر ضروری ہے کیا

سیرِ درویش کو دو جہاں دو قدم
سرحدوں کا نشاں پھر ضروری ہے کیا

بستیاں کتنی زیرِ زمیں سو گئیں
ایک تیرا مکاں پھر ضروری ہے کیا

جسم پتوار ہے سانس منجدھار ہے
وصل جاں درمیاں پھر ضروری ہے کیا

ایک خورشید شبنم کی آغوش میں
اس کے آگے بیاں پھر ضروری ہے کیا

خورشید اکبر

کیسی کشتی میں ہم سوار ہوئے
میں ہی ڈوبا نہ تم ہی پار ہوئے

تم بھی کیا خوب تاجدار ہوئے
ہم بھی ٹوٹا ہوا مزار ہوئے

یہ الگ بات ہم تو خوار ہوئے
وقت کیا تیرے شاہکار ہوئے

تم بہت یاد آرہے تھے جہاں
راستے کتنے اشک بار ہوئے

پیرہن پیرہن مری جاں ہے
ہم جنوں والے تار تار ہوئے

تم بھی کشمیر کی طرح نکلے
ہم بھی کچھ آتشیں چنار ہوئے

صبر کی ان سنی کہانی ہم
پہلے جتنے تھے جاں نثار ہوئے

کتنی بیمار ہو گئی دنیا
ہم بھی کیا آخری انار ہوئے

تشنگی کی جگہ پہ وحشت ہے
جو سمندر تھے ریگزار ہوئے

ہم بھی دیوارودر پہ اگ آئے
کس بیاباں کے سبزہ زار ہوئے

زندگی!تو ہماری ماں کی طرح
ہم ترے طفلِ شیرخوار ہوئے

رات اور دن کی طرح مل نہ سکے
ماہ و خورشید باربار ہوئے

کاوش عباسی (سعودی عرب)

ترنگ ہے جو وہی درد کی صدا بھی ہے
غمِ حیات کوئی تیری انتہا بھی ہے

اے اپنے حُسن میں مشغول،اپنے ناز میں گم
بہت تڑپ سے کوئی تجھ کو دیکھتا بھی ہے

وہ یونہی جھینپتا گزرا نہیں ہے پہلو سے
نظر نظر میں اُسے میں نے کچھ کہا بھی ہے

میں حالِ دل کبھی جس کو بتا سکوں بھی نہیں
غرورِ لطف سے کچھ مجھ سے پوچھتا بھی ہے

ہمی سے کرنے کی باتیں کرے وہ غیروں سے
ہمیں یہ طرزِ سخن اس کا چھیڑتا بھی ہے

وہ بیٹھ کر کئی پردوں کی اوٹ میں کاوشؔ
ہمارے ذکر سے محظوظ ہو رہا بھی ہے

کاوش عباسی

گھر سے اپنے تو کامیاب تھے ہم
راہِ دنیا میں کیا خراب تھے ہم

دوسروں کے دہن سے پھوٹ پڑتا
آپ پر اپنا ہی عذاب تھے ہم

ہم پلٹتے نہ وہ بکھرتا تھا
دائمی خواب کا سراب تھے ہم

وہ محبت جو یونہی بٹتی رہی
اُس محبت کا آفتاب تھے ہم

کوئی دیکھے گا کیوں ہمارا خوں
صفحے پر اک خبر خراب تھے ہم

ہم ہیں،اچھا تھا ہم نہیں ہوں،اب
اپنوں کا،غصے کا یہ خواب تھے ہم

زندگی تو لُٹی ،بس اب کاوشؔ
موت کا انتظاری باب تھے ہم

صادق باجوہ (میری لینڈ، امریکہ)

نہ پُونچھ پائے تھے آنسو جو آستیں سے کہیں
بنے ہیں نازشِ سجدہ مری جبیں سے کہیں

ذرا سنبھل کے نکالو زباں سے بات کوئی
کہ بات پھیلتی جاتی ہے پھر کہیں سے کہیں

مرے وجود میں رَچ بَس گیا لہو کی طرح
گمان بڑھ نہیں سکتا مرے یقیں سے کہیں

سکونِ قلب و جگر بھی ہے راحتِ جاں بھی
کہ بات راز کی کہنا نہ ہمنشیں سے کہیں

کمالِ اوج زمانے کی تلخیوں سے پرکھ
بندھے گا رشتۂ امید پھر یہیں سے کہیں

رہِ حیات حوادث سے پُرسہی لیکن
مسرتوں سے بھی دامن بھریں یہیں سے کہیں

ہے مصلحت تو اسی میں کہ چپ رہے صادق
ڈسا نہ جائے کسی مارِ آستیں سے کہیں

احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)

دل ہے تو عشق کے آزار میں کام آئے گا
ورنہ ہمسائے کی دیوار میں کام آئے گا

اس نے یہ کہہ کے مجھے میرے غزل لوٹا دی
یہ قصیدہ تمہیں دربار میں کام آئے گا

میں وہ بزدل ہوں جو ظالم کی حمایت میں اٹھا
اب مرا سر کسی مینار میں کام آئے گا

کام آئی تھی مرے، دشت میں میری وحشت
یار ہنگامۂ بازار میں کام آئے گا

اک دیا ہے جو پسِ چشم فروزاں ہے کہیں
یہ دیا رنج کے اظہار میں کام آئے گا

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

مضائقہ نہیں کوئی جو پھل ہی کاٹ دیا
شجر تمام مگر بے محل ہی کاٹ دیا

ملا تھا وقت ہمیں 'وقفۂ صفر' کی طرح
جھجک جھجک کے یہ انمول پل ہی کاٹ دیا

اُڑان بھرنے کا موقع نہیں دیا اس نے
جواز شہپری پہلے پہل ہی کاٹ دیا

معلقات کو دیمک تمام چاٹ گئی
سخن کا دعویٰ ضرب المثل ہی کاٹ دیا

چلا سنبھال لیا خاکسار کو اس نے
انا پرست سے روزِ ازل ہی کاٹ دیا

ہم اپنی شرط پہ ردو قبول کرتے ہیں
جو کاٹنا تھا بیانگِ دہل ہی کاٹ دیا

غزل تو خیّر جنابِ مدیر نے چھاپی
ملال یہ ہے کہ بیت الغزل ہی کاٹ دیا

رؤف خیر

ہم اگر ردِ عمل اپنا دکھانے لگ جائیں
ہر گھمنڈی کے یہاں ہوش ٹھکانے لگ جائیں

خاکساروں سے کہو ہوش میں آنے لگ جائیں
اس سے پہلے کہ وہ نظروں سے گرانے لگ جائیں

دیکھنا ہم کہیں پھولے نہ سمانے لگ جائیں
عندیہ جیسے ہی کچھ کچھ ترا پانے لگ جائیں

پھول چہرے یہ سرِ راہ ستارہ آنکھیں
شام ہوتے ہی ترا نام سجھانے لگ جائیں

اپنی اوقات میں رہنا دلِ خوش فہم ذرا
وہ گزارش پہ تری سر نہ کھجانے لگ جائیں

ایک بِل سے کہیں دو بار ڈسا ہے مومن!
زخم خوردہ ہیں تو پھر زخم نہ کھانے لگ جائیں

ہڈیاں باپ کی گودے سے ہوئی ہیں خالی
کم سے کم اب تو یہ بیٹے بھی کمانے لگ جائیں

دعویٰ خوش سخنی خیّر ابھی زیب نہیں
چند غزلوں ہی پہ بغلیں نہ بجانے لگ جائیں

غلام مرتضیٰ راہی (فتح پور، یوپی)

رکتا نہیں ہے دشت سروکار آب سے
بہلائے جاتے ہیں یہاں پیاسے سراب سے

دن میں بھی گھر اجالے سے محروم ہے تو ہے
کرنوں کا کیا سوال کروں آفتاب سے

بالکل درست ہوتے ہوئے فیل ہو گیا
میں نے جواب نقل کیا تھا کتاب سے

وہ سال ہو کہ ماہ ہو،دن ہو کہ ہو گھڑی
باقی نہیں بچوں گا کسی کے حساب سے

ہر شے پر اک اُچٹتی نظر ڈالتا چلوں
بیکار ہو گا میرا اترنا رکاب سے

غلام مرتضیٰ راہی

جب دھوپ میں فصل پک رہی تھی
ہر آنکھ چمک دمک رہی تھی

شیشے میں عکس ساعتوں کا
پتھر میں صدی جھلک رہی تھی

احساس کی لَو گھٹا لی میں نے
میری ہی طرف لپک رہی تھی

جب آگ میں ہم پناہ گزیں تھے
اشجار کو برف ڈھک رہی تھی

دیوار کے رخنۂ کرم سے
دنیائے دروں جھلک رہی تھی

مشکل سے ملی ہوائے تازہ
جنگل میں کہیں بھٹک رہی تھی

سرحد کی لکیر دیکھ آئے
خنجر کی طرح چمک رہی تھی

افتخار نسیم (شکاگو)

اس قدر بھی تو نہ جذبات پہ قابو رکھو
تھک گئے ہوتو مرے کاندھے پہ بازو رکھو

بھولنے پائے نہ اُس دشت کی وحشت دل سے
شہر کے بیچ رہو باغ میں آہو رکھو

خشک ہو جائے گی روتے ہوئے صحرا کی طرح
کچھ بچا کر بھی تو اس آنکھ میں آنسو رکھو

روشنی ہو گی تو آ جائے گا رہرو دل کا
اُس کی یادوں کے دیے طاق میں ہر سو رکھو

حمیدہ معین رضوی (لندن)

جس درد کو خود ہی پالا ہو اس درد کا درماں کیا کرتے
پھر قریۂ دل پامال ہوا، تو وصل کا ارماں کیا کرتے

اک دشت تھا جس میں چلتے ہوئے دن بیت گیا ہے شام کھڑی
اب اور کسی منزل کے لئے ہم راہ کا ساماں کیا کرتے

سب خواب جلا ڈالے ہم نے برسوں جو سجائے پلکوں پہ
تعبیر نہ تھی جن کی کچھ بھی، وہ خوابِ پریشاں کیا کرتے

دل ٹوٹا آنکھیں خون ہوئیں ہم زہر خموشی پیتے رہے
چہرے پہ لکھی کلفت کو مگر، اے قلب پشیماں کیا کرتے

سچائی ، دہائی دیتی ہے، انصاف، سسکتا پھرتا ہے
ایسے میں جیئے جانے کی ہم، خواہش کو فروزاں کیا کرتے

کہتے ہیں بہار آئی ہر سو ہونٹوں پہ خزاں کے نوحے ہیں
جب گلشن گلشن مقتل ہو ہم جشنِ بہاراں کیا کرتے

آسیب کی اک دہشت ہے اب سب گلیوں میں بازاروں میں
اب ہر گھر خود ہی خرابہ ہے ہم ذکرِ بیاباں کیا کرتے

معراج رعنا (کانپور)

جلا ہواہے بدن روح بھی جلی ہوئی ہے
ہر ایک سمت عجب آگ سی لگی ہوئی ہے

انا کی برف بھی کیا چیز ہے خدا جانے
جہاں جمی تھی وہیں آج تک جمی ہوئی ہے

یہ معجزہ کسی مہتاب سے نہیں ممکن
لہو جلایا تو نس نس میں روشنی ہوئی ہے

مرے چراغ! الجھنا مگر خیال رہے
شکست کھاکے ہوا اور سر پھری ہوئی ہے

ہوا ہے رخشِ جنوں دشتِ دل میں آوارہ
سنا ہے جب سے تری یاد شیرنی ہوئی ہے

جبینِ عشق کہاں دیکھتی ہے دیروحرم
جہاں جھکی تھی وہیں آج تک جھکی ہوئی ہے

یہاں گھٹن ہے تعفن ہے سازشیں معراؔج
یہاں پہ آکے پشیمان زندگی ہوئی ہے

معراج رعنا

جو آنی تھی محبت میں وہ عیاری نہیں آئی
دلِ سادہ! تجھے اب تک ادا کاری نہیں آئی

ہوا سے باندھنا مشکل تھا پر جب باندھ دی کشتی
سمندر کے سفر میں کوئی دشواری نہیں آئی

مرے سارے ہنر زنبیل میں رکھے کے رکھے ہیں
ابھی کرتب دکھانے کی مری باری نہیں آئی

کئی خوش تھے قبیلے میں کئی ناراض تھے ہم سے
رہے سردار لیکن ہم کو سرداری نہیں آئی

خرابہ جس طرح آباد تھا آباد ہے اب تک
مری وحشت کو اب تک کوئی بیماری نہیں آئی

بہت چاہا کہ اپنے آپ کو تبدیل کرلوں میں
بہت کوشش بھی کی لیکن ریاکاری نہیں آئی

حفیظ انجم (کریم نگر)

میں چل پڑا ہوں سفر ہے مِرا یہ نا دیدہ
اندھیری شب ہے ،قدم رکھ رہا ہوں لرزیدہ
ہوابھی گرم ہے اُڑتے ہوئے بگولے ہیں
ہے میرے سر پہ بھی سورج سوار شوریدہ
ترے لبوں کا تصدق،دے جام میں بھر کر
تجھے خبر ہے مِری تشنگی ہے بالیدہ
مِرا ضمیر مجھے بڑھ کے روک لیتا ہے
قدم اُٹھا نہ سکوں گا میں کوئی لغزیدہ
میں کس کے شانے پہ رکھوں سرِ نیاز مِرا
سفر میں ساتھ نہیں ہے کوئی بھی سنجیدہ
تجھے سمجھنے میں کم ہو گی عمرِ خضر تلک
یہ تیری زلف ہی کیا، بات بھی ہے پیچیدہ
ہر ایک شخص تو غواص ہو نہیں سکتا
سمندروں کی تہوں میں گہر ہیں پوشیدہ
ابھی بھی لوگ مجھے سنگ ہی سمجھتے ہیں
میں بُت نہیں ہوں تمہاری طرح تراشیدہ
عجیب طرفہ تماشا ہے یہ حفیظ انجم
جو ناسمجھ ہے اُسی کا ہے نام فہمیدہ

غیاث انجم (بکارو)

بہتا ہے شرمسار سا دریا یہیں کہیں
کل جاں بحق جو ہو گیا پیاسا یہیں کہیں

سب کو تلاش رہتی تھی ہر شب عجیب سی
گرتا تھا آسمان سے تارا یہیں کہیں

پامال کر چکے ہو جو اسلاف کا وقار
ڈھونڈو گے تو ضرور ملے گا یہیں کہیں

رکھتا تھا اپنے پاس جو تصویرِ زندگی
برباد ہے وہ آئینہ خانہ یہیں کہیں

اب تک کہاں ملا ہے تگ و دو کے باوجود
برسوں جو کھو گیا تھا کنارا یہیں کہیں

ٹکراتی ہیں دعائیں سماعت سے بار ہا
لگتا ہے آج بھی ہے وہ چہرہ یہیں کہیں

یادش بخیر! ٹیس سی اُٹھتی ہے آج بھی
روندی گئی تھی دل کی تمنا یہیں کہیں

خرم خرام صدیقی (اسلام آباد)

دامنِ کوہ میں مور کے رقص کی دلکشی دیکھ کر
روح شاداب ہے ایک معصوم سی سرخوشی دیکھ کر

وقتِ شب تھا سفر پر روانہ میرا قافلہ اور میں
راہ میں رک گیا تیرے رخ کی حسیں روشنی دیکھ کر

کھو گیا میرا حسنِ تخاطب کسی ملگجی خواب میں
اس کی خوابیدہ آنکھوں میں فرقت کا نم سرمئی دیکھ کر

اتنے مانوس ہم ہوگئے موت کے بے یقیں خوف سے
مسکراتے نہیں اپنے اطراف میں زندگی دیکھ کر

اب سفر کی روانی میں ہے عافیت جان و دل کی خرّام
لوٹ آیا ہوں ہر سمت سے میں رہِ واپسی دیکھ کر

خرم خرام صدیقی

فلک پہ ابرِ گریزاں نے جب قیام کیا
تو میرے یارِ کم آمیز نے کلام کیا

ہوئی تھی دیر سے تجدیدِ کارِ عشق شروع
اگرچہ ہم نے بہ عجلت اسے تمام کیا

بہت خفیف سہی جنبشِ نگاہِ کرم
مگر یہ طے ہے کہ اس نے ہمیں سلام کیا

ہمارا درد کسی دل میں جاگزیں نہ ہوا
سو اس نے حرفِ سیہ پوش میں مقام کیا

سبک روی سے وہ دامن چھڑا گئے ہم سے
نظر نے دور تک اندازہءِ خرّام کیا

معید رشیدی (دہلی)

ایک ہنگامہ شب و روز بپا رہتا ہے
خانۂ دل میں نہاں جیسے خدا رہتا ہے

میرے اندر ہی کوئی جنگ چھڑی ہے شاید
میرے اندر ہی کوئی دشتِ بلا رہتا ہے

جب بھی نزدیک سے محسوس کیا ہے خود کو
میں نے دیکھا ہے کوئی مجھ سے خفا رہتا ہے

ہم تو آباد جزیروں سے گزر جاتے ہیں
اور پھر دور تلک ایک خلا رہتا ہے

خامشی کا پسِ دیوارِ جنوں ہے سایہ
اِس طرف سلسلۂ آہ و بکا رہتا ہے

معید رشیدی

زندگی سفر پر ہے
بے گھری مقدر ہے
خاکداں میں رہتا ہے
دل بھی اک قلندر ہے
کوئی جل رہا ہے اور
سامنے سمندر ہے
آئینہ ہے پہلو میں
اور دیدۂ تر ہے
ٹھوکروں میں ہے کوئی
دار پر کوئی سر ہے
سر پہ اک ستارہ ہے
اک چراغ گھر پر ہے

ناصر نظامی (ہالینڈ)

ایک نایاب شخص کھو بیٹھے
اک مسیحا سے ہاتھ دھو بیٹھے

قتل کرکے امید کا سورج
بے یقینی کی فصل بو بیٹھے

روشنی کا چراغ گل کرکے
تیرگی کے اسیر ہو بیٹھے

پار جانا تھا جس سفینے میں
اس سفینے کو ہم ڈبو بیٹھے

میرا انصاف کرنے سے پہلے
قبلہ رُو وہ ذرا سا ہو بیٹھے

ان کے ہاتھوں ہوا ہمارا قتل
کرسیٔ عدل پر ہیں جو بیٹھے

کٹ نہیں سکتا روشنی کا بدن
بات ان کی سمجھ میں تو بیٹھے

اہلِ دل ہیں تمہارے غم سے نڈھال
اہلِ احساس تم کو رو بیٹھے

محمد ارباب بزمی (گوجرانوالہ)

ماں جائے سے ڈَر لگتا ہے
اَب سائے سے ڈَر لگتا ہے

جِس میں چاہت نہ ہو شامل
اُس چائے سے ڈَر لگتا ہے

گھومے تھے ہم جس جس جا، اَب
اُس جائے سے ڈَر لگتا ہے

مظلوموں کے دِل سے نِکلی
اِک ہائے سے ڈَر لگتا ہے

اِک دُوجے کے دُشمن ہیں سب
ہمسائے سے ڈَر لگتا ہے

بچھڑیں جس سے پیار بھرے دِل
اُس رائے سے ڈَر لگتا ہے

جھلسائے جو تَن مَن بزمؔی
اُس سائے سے ڈَر لگتا ہے

سالم سلیم (دہلی)

دشت کی ویرانیوں میں خیمہ زن ہوتا ہوا
مجھ میں ٹھہرا ہے کوئی بے پیرہن ہوتا ہوا

اول اول کچھ سہارا دے رہا تھا ایک خواب
آخر آخر وہ بھی آنکھوں کی جلن ہوتا ہوا

میرے سارے لفظ میری ذات میں کھوئے ہوئے
ذکر اس کا انجمن در انجمن ہوتا ہوا

جز ہمارے کون آخر دیکھتا اس کام کو
روح کے اندر کوئی کار بدن ہوتا ہوا

ایک کشتی غرق میری آنکھ میں ہوتی ہوئی
اک سمندر میرے اندر موجزن ہوتا ہوا

ایک پرچھائیں مرے قدموں میں بل کھاتی ہوئی
ایک سورج میرے ماتھے کی شکن ہوتا ہوا

سالم سلیم

بدن سمٹا ہوا اور دشت جاں پھیلا ہوا ہے
سو تا حد نظر وہم و گماں پھیلا ہوا ہے

حصار ذات سے کوئی مجھے بھی تو چھڑائے
مکاں میں قید ہوں اور لامکاں پھیلا ہوا ہے

یہ کیسی خامشی میرے لہو میں سرسرائی
یہ کیسا شور دل کے درمیاں پھیلا ہوا ہے

تمہاری آگ میں خود کو جلایا تھا جو اک شب
ابھی تک میرے کمرے میں دھواں پھیلا ہوا ہے

ہمارے پاؤں سے کوئی زمیں لپٹی ہوئی ہے
ہمارے سر پہ کوئی آسماں پھیلا ہوا ہے

شریف احمد قریشی (رام پور)

ایسا کھویا ہوں تری آئینہ سامانی میں
''آئینہ ڈوب گیا ہے مری حیرانی میں''

جن کا خمیازہ بھگتنا پڑے نسلوں کو کبھی
کام ایسے نہ کرو دوستو نادانی میں

عام انساں کی طرح جینا تو سیکھو یارو
لطف درویشی کا آئے گا نہ سُلطانی میں

ٹھہرے دریا ہیں یوں پتھّر پہ نہ پتھّر پھینکو
کوئی طوفاں نہ اُٹھا دیں کہیں ہم پانی میں

آخری وقت ہے، آسیب ہے یا حوصلہ ہے
کوئی شے کھینچ رہی ہے مجھے طغیانی میں

عہدِ حاضر کے سُبک لہجے کو کیا کہیے شریفؔ
سنگ ریزے ہوں چھپے جیسے گل افشانی میں

رفیق شاہین (علی گڑھ)

خود ہیں جو علم و فن کے کمالات میں صفر
وہ لکھ رہے ہیں ہم کو کمالات میں صفر

اظہار میں صفر نہ اشارات میں صفر
وہ ہیں تو میرے خط کے جوابات میں صفر

تنہائی میں تو کہتے رہے ان سے دل کی بات
ثابت ہوئے انہیں سے ملاقات میں صفر

اب وہ کریں گے میرے مقدر کا فیصلہ
مشہور ہیں جو رحم کے جذبات میں صفر

تیاری کے بغیر جو دیتے ہیں امتحاں
ملتا ہے اُن کو ایسے ہی حالات میں صفر

نامعتبر رباعیاں کہتے ہیں وہ رفیقؔ
ہوتے ہیں جو کہ علم مخافات میں صفر

سلیم محی الدین (پربھنی)

وحشت نگار لمحے آہو قطار لمحے
میں ہوں شکاران کا میرا شکار لمحے

آنکھیں ترس رہی ہیں، آنکھیں برس رہی ہیں
تصویر ہوگئے ہیں پلکوں پہ چار لمحے

بھاری اگرچہ ہے من ہر سانس جیسے الجھن
کٹ جائیں گے یقیناً یہ انتظار لمحے

بیٹھی جگہ مہاجر، آنکھیں ہوئیں مسافر
آ قید کر مصور، یہ تار تار لمحے

اپنی تو ایک ہٹ ہے بے لاگ بے لپٹ ہے
صدیوں کی ایک رٹ ہے، دیدے ادھار لمحے

کیا بیر ہے کسی سے، ملئے گلے سبھی سے
بہتر ہیں ہر خوشی سے، یہ اشکبار لمحے

تجھ پر غزل کہیں گے اور جھوم کر پڑھیں گے
تجھ راہ میں بچھیں گے، سوسو ہزار لمحے

سلیم محی الدین

شعر کے بیج تو کیجئے پھر اثر کا سوچنا
کیا کہیں کیسے کہیں ہے عمر بھر کا سوچنا

ہر مسافت تو ہتھیلی پر لکھی ہوتی نہیں
پاؤں رکھنا گھر سے باہر تب سفر کا سوچنا

فرش ہو پیروں تلے، سر پر بھی ہو چھت کا نشاں
تب تو کچھ واجب لگے، دیوارودر کا سوچنا

ہرکہانی میں کوئی تو موڑ ہوتا ہے ضرور
کب تلک کردار کے زیر و زبر کا سوچنا

کالے پتھر پر میاں جو کالی چیونٹی دیکھ لے
اس کے آگے کیا نظیریں کیا نظر کا سوچنا

لفظ سچے، دل بھی سچا، تجربہ سچا سلیمؔ
کیا ضروری ہے میاں پھر رات بھر کا سوچنا

حیدر قریشی

گیان، دھیان کے رستوں پر اب اور نہ مجھ کو رول
میرے مالک! مجھ پر میرا ساتواں دَر بھی کھول
ایک نئے آدم کی پھر تشکیل ہے میٹھے پانی!
جذب ہو میری مٹی میں یا مجھ کو خود میں گھول
دنیا کو سمجھائیں کیسے، آخر کیسے سمجھے
باتیں اپنی سچی،سیدھی اور دنیا ہے گول
قیمت اپنی کچھ بھی نہیں تھی، شان ہے اُس پیارے کی
یاروں نے بے مول کیا تھا، اُس نے کیا اَنمول
کب اپنی پہچان کے سارے بھید کھلے ہیں خود پر
جھانک ابھی کچھ اور بھی اندر،من کو اور ٹٹول
کتنی اور زمینیں تیرا رستہ دیکھ رہی ہیں
اس دھرتی سے آگے چل،اب اُڑنے کو پر تول
دُکھ اور سُکھ کے اتنے ہی میلے تھے بس قسمت میں
جیون کے اس کھیل میں اپنا اتنا ہی تھا رول
راضی ہوں تیری مرضی پر لیکن بھید کھلے بھی
تیری مرضی کیا ہے یارا، کچھ تو کھل کر بول
ہجر کی رُت میں بھی پیغام وصال کا آیا حیدؔر
دیکھ! بُلاوا آیا ہے تو مت کر ٹال مٹول

حیدر قریشی

عشق میں سب کچھ اک جیسا ہے،کیا پانا،کیا کھونا
لذت میں ملتا جلتا ہے ہنسنا ہو یا رونا

ساری ریاضت خاک ہوئی اور زعمِ کرامت ٹوٹا
اک درویش پہ چل گیا ایسا حُسن کا جادو ٹونا

جن و ملک سب سے اُکتا کر رب نے بنایا،آخر
سانسوں کی چابی سے چلنے والا ایک کھلونا

سُن یارا! مت اُلجھ تُو اُس سے جس کی ایک نظر ہی
سونے کو مٹی کردے، مٹی کو کردے سونا

زہریلی نفرت کا موسم جتنا زہریلا ہو
اپنی آنکھوں میں سچی چاہت کے خواب ہی بونا

ہم ہی کتنی دیر سے ساری بات کیے جاتے ہیں
اتنی دیر سے چُپ بیٹھے ہو،تم بھی کچھ تو کہو نا!

ڈر ہے بھیدوں کے افشا کا موجب نہ بن جائے
حیدؔر بھید بھرے دل کا اب چھید بھرا دل ہونا

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

مر گیا پانی جو تھا ٹھہرا ہوا
سوچئے ، ہے اور کیا ٹھہرا ہوا

ڈھونڈھتی پھرتی ہے جس کو اب دعا
ہے کہاں دستِ دعا ٹھہرا ہوا

دھیان کی شاخِ شجر پر ہے ابھی
ایک چہرا پھول سا ٹھہرا ہوا

گھر کے اندر آبسی کیوں بے گھری
کون یہ گھر سے گیا ٹھہرا ہوا

پاؤں چلتے ہیں ، سفر کٹتا نہیں
ہے سفر کا راستا ٹھہرا ہوا

گھنٹیاں بجنے لگیں کانوں کے پاس
قافلہ دل کا چلا ٹھہرا ہو

کام ایسا کیجئے جس کو کہیں
چشمۂ آبِ بقا ٹھہرا ہوا

آسماں پر ہے چڑھائی کا خیال
آسماں پر ہے خدا ٹھہرا ہوا

عبداللہ جاوید

صنم کدے میں صنم کے سوا بہت کچھ تھا
میں کیا بتاؤں ،اے میرے خدا بہت کچھ تھا

کسی کے نام سے کھنچا گیا خطِ تنسیخ
وگرنہ لوح پہ لکھا ہوا بہت کچھ تھا

وہ جس نے باندھ رکھا ہے عمر بھر مرے دل کو
جو میرا ہو نہ سکا وہ مرا بہت کچھ تھا

بدن میں روح تھی لیکن پہنچ سے باہر تھی
بدن سے روح تک فاصلہ بہت کچھ تھا

جہاں میں آپ کے ، میری بساط ہی کیا تھی
جہاں میں آپ کے اچھا برا بہت کچھ تھا

زمانے بھر کے تماشے، نظر میں تھے جاویدؔ
میں دیکھتا ہی نہ تھا، جانتا بہت کچھ تھا

عبداللہ جاوید

گریۂ ندامت کے ما سوا مرا کیا تھا
اس کباڑ خانے میں اے خدا مرا کیا تھا

آسماں بھی ان کا تھا اور زمین بھی ان کی
درمیان دونوں کے جو بھی تھا مرا کیا تھا

سب وسائلِ ہستی آپ ہی کی قدرت میں
جو پڑا تھا دنیا میں آپ کا، مرا کیا تھا

آتے جاتے لوگوں سے، ہے بسی ہوئی دنیا
آتے جاتے لوگوں کا سلسلہ مرا کیا تھا

جگ بسائی تھی ان کی، جگ ہنسائی تھی میری
کھیل تھا، تماشہ تھا، جو بھی تھا، مرا کیا تھا

میرے ہر سفر میں تھا، وقت کا سفر شامل
راستہ جو کٹتا تھا، راستا مرا کیا تھا

میری اک دعا بھی کیوں مستجاب ہو جاتی
ہر دعا سے یہ پوچھا مدعا مرا کیا تھا

مانتا ہوں رہتا تھا کوئی میرے اندر بھی
سوچتا ہوں اس سے بھی واسطا مرا کیا تھا

جس کو میں نے چاہا تھا، جس کو میں نے پوجا تھا
وہ جو مجھ پہ مرتا تھا، کون تھا، مرا کیا تھا

میری سوچ جس کی تھی، جس کی سوچ میری تھی
جس کو میں نے اپنا دل دے دیا، مرا کیا تھا

حرف وصوت سے جاویدؔ بارہا یہ پوچھا ہے
حرف وصوت میں جو بھی، تھا رچا، مرا کیا تھا

عبداللہ جاوید

آگ کو مطلب جلانے سے رہا
وقت بھی بدلاؤ لانے سے رہا

ہم جلے جس آگ میں، اس آگ کو
زور دریا کا، بجھانے سے رہا

جو زمانے سے، سدا بچتے رہے
واسطہ ان کا زمانے سے رہا

ہجرتیں کیسی یہاں، کیسے قیام
ہر تعلق آب و دانے سے رہا

موسموں پر کچھ مرا قابو نہیں
دید کا موسم بلانے سے رہا

حاسدوں کی ہم نے کب تذلیل کی
ایک اک حاسد ٹھکانے سے رہا

جس گلی میں عمر کاٹی میرؔ نے
میں وہاں کس کس بہانے سے رہا

زندگی جاویدؔ گزری حرف حرف
واسطہ لکھنے لکھانے سے رہا

عبداللہ جاوید

اگر سیلاب کا چہرا نہ دیکھا
تو گویا آپ نے دریا نہ دیکھا
رکھیں آنکھیں کھلیں گو ہم نے دل کی
مگر دل سا کوئی اندھا نہ دیکھا
بہت سے آئینے دیکھے دِکھائے
مگر جو عکس چاہا تھا، نہ دیکھا
عبث تھا بھاگنا دنیا کے پیچھے
جو بھاگے ان نے پھر کیا کیا نہ دیکھا
فقیری تو گنوانے کا ہنر ہے
وہ پیالہ کیا جسے ٹوٹا نہ دیکھا
پڑی جب روشنی پر چھائیں ناچی
کوئی بھی ناچنے والا نہ دیکھا
رہے سب پیڑ کے سائے کے نیچے
کسی نے پیڑ کو جلتا نہ دیکھا
گلی میں ہم نے اکثر دھوپ تاپی
کسی دیوار کا سایہ نہ دیکھا
زمانے نے بہت سے لوگ دیکھے
کوئی مجھ سا، کوئی تجھ سا نہ دیکھا
وہ سب دیکھا فلک نے جو دکھایا
زمیں نے آج تک کیا کیا نہ دیکھا

(ق)

مگر جو آدمی دکھلا رہا ہے
زمیں نے آج تک سوچا نہ دیکھا
کبھی جاویدؔ یہ دنیا سے پوچھو
یہاں کیا دیکھنا تھا کیا نہ دیکھا

رشید قیصرانی (مرحوم)

میرے لیے تو حرفِ دعا ہو گیا وہ شخص
سارے دُکھوں کی جیسے دوا ہو گیا وہ شخص

میں آسماں پہ تھا تو زمیں کی کشش تھا وہ
اُترا زمیں پر، تو ہوا ہو گیا وہ شخص

سوچوں بھی اب اُسے، تو تخیل کے پر جلیں
مجھ سے جُدا ہوا تو خدا ہو گیا وہ شخص

سب اشک پی گیا مرے اندر کا آدمی
میں خشک ہو گیا ہوں، ہرا ہو گیا وہ شخص

میں اس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً
سمٹا، سمٹ کے رنگِ حنا ہو گیا وہ شخص

پھرتا ہے لے کے آنکھ کا کشکول در بدر
دل کا بھرم لُٹا تو گدا ہو گیا وہ شخص

یوں بھی نہیں کہ پاس ہے میرے وہ ہم نفس
یہ بھی غلط کہ مجھ سے جُدا ہو گیا وہ شخص

پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کر اُسے رشید
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص

رشید قیصرانی (مرحوم)

کتنا متناسب ترا ہر انگ لگے ہے
ہر رنگ میں تُو مجھ کو غزل رنگ لگے ہے

اے بھاگتے سورج کی کرن مجھ سے لپٹ جا
برسات کا موسم ہے مجھے زنگ لگے ہے

شیشے کا بدن اوڑھ کے نکلے ہے جو گھر سے
میں پھول بھی پھینکوں تو اسے سنگ لگے ہے

تو جب بھی پکارے ہے دھنک دیس کی دیوی
من راگ میں دھیرے سے نیا انگ لگے ہے

وہ چند مہکتے ہوئے لفظوں کا صحیفہ
اب تو میری سوچوں کی بھی فرہنگ لگے ہے

سینے میں سماتے نہیں یادوں کے دفینے
اب مجھ کو بدن میرا بہت تنگ لگے ہے

نکلا ہے جسے تھام کے اندھا ہے وہ سورج
اِس دن کا بھی چہرہ مجھے شب رنگ لگے ہے

اِس شہر میں بھی ہو گا کوئی ہیر بسیرا
کچھ تو ہے کہ ملتان مجھے جھنگ لگے ہے

رشید قیصرانی (مرحوم)

روہی دیس کے گیت سُنانے سانول تم کب آؤ گے؟
پیر فرید کی یاد منانے سانول تم کب آؤ گے؟

پلکوں کے پَٹ کھول کے کرنیں دائرہ بُنتی رہتی ہیں
اِس آنگن میں دھوپ نہانے سانول تم کب آؤ گے؟

بیری بیری بُور لگا ہے، سرسوں سرسوں پھول کھلے ہیں
لوٹ آئے ہیں یار پُرانے سانول تم کب آؤ گے؟

بجھتی آنکھیں، روگی مَن اور اُڑتے پنچھی سانسوں کے
پوچھتے رہتے ہیں دیوانے سانول تم کب آؤ گے؟

ہم تو کب سے دیپ جلائے، نین بچھائے بیٹھے ہیں
پیت پریت کی رِیت نبھانے سانول تم کب آؤ گے؟

دیکھو آج دھنک نے اپنے سارے رنگ بکھیر دیئے ہیں
اِن رنگوں میں رنگ جمانے، سانول تم کب آؤ گے؟

چاند زمیں پہ کب اُترے گا، کون رشید یہ کہہ سکتا ہے
ہم کیا سمجھیں، ہم کیا جانیں، سانول تم کب آؤ گے؟

رشید قیصرانی (مرحوم)

اِک چاند تھا جب اُبھرا، اُبھرا مری غزلوں میں
جس نے بھی اُسے دیکھا، دیکھا مِری غزلوں میں

دھیرے سے کوئی دستک وجدان کی چوکھٹ پر
چُپکے سے کبھی آ جا، آ جا مری غزلوں میں

ہر بار یہ اشکوں کے جھرمٹ میں اُترنا کیا
آنا ہے تو آ تنہا، تنہا مِری غزلوں میں

تُو تھی تو غزل بانو ہر لفظ میں لہریں تھیں
اور موج میں تھا دریا، دریا مری غزلوں میں

اب چاند نگر میں ہوں اور کب سے سوالی ہوں
بس ایک کرن داتا، داتا میری غزلوں میں

میں نے بھی رشید اُس کو لفظوں میں چھُپا دیکھا
اس نے بھی مجھے ڈھونڈا، ڈھونڈا مری غزلوں میں

رشید قیصرانی (مرحوم)

میں نے کہی تھیں آپ سے باتیں بھلی بھلی
رُسوا کیا ہے آپ نے مجھ کو گلی گلی

میں نے کہا نہیں تھا کہ شعلہ بدن ہیں لوگ
اب کیوں دکھا رہے ہو ہتھیلی جلی جلی

اک اور شب کی راہ میں آنکھیں بچھایئے
یہ شب، بصورتِ شبِ رفتہ، ڈھلی ڈھلی

کیسے سرک سرک کے بھری گاگریں گریں
جب میرے ساتھ ساتھ کوئی منچلی چلی

میں نے غزل سنائی تو اک اہلِ دل رشید
سینے پہ ہاتھ رکھ کے پکارا علی علی

رشید قیصرانی (مرحوم)

گاتا رہا ہے دور کوئی ہیر رات بھر
میں دیکھتا رہا تری تصویر رات بھر

تاروں کے ٹوٹنے کی صدا گونجتی رہی
ہوتی رہی ہے رات کی تشہیر رات بھر

میں چل پڑا تو کٹ کے وہ قدموں میں آ گری
لٹکی تھی میرے سر پہ جو شمشیر رات بھر

سورج نے صبح دم مرے پاؤں میں ڈال دی
میں کاٹتا رہا ہوں جو زنجیر رات بھر

میں خامشی میں ڈوب کے کچھ سوچتا رہا
کچھ بولتی رہی تری تصویر رات بھر

میں سو گیا رشید تو ہالہ بکھر گیا
پہنی نہ چاند نے کوئی زنجیر رات بھر

رشید قیصرانی (مرحوم)

تنہائیوں کا حبس مجھے کاٹتا رہا
مجھ تک پہنچ سکی نہ ترے شہر کی ہوا

وہ قہقہوں کی سیج پہ بیٹھا ہوا ملا
میں جس کے در پہ درد کی بارات لے گیا

اِک عمر جستجو میں گزاری تو یہ کھُلا
وہ میرے پاس تھا جسے میں ڈھونڈتا رہا

نکلا ہوں لفظ لفظ سے میں ڈوب ڈوب کر
یہ تیرا خط ہے یا کوئی دریا چڑھا ہوا

نظریں ملیں تو وقت کی رفتار تھم گئی
نازک سے ایک لمحے پہ صدیوں کا بوجھ تھا

میں نے بڑھا کے ہاتھ اسے چھو لیا رشید
اتنا قریب آج مرے چاند آ گیا

رشید قیصرانی (مرحوم)

صدیوں سے میں اِس آنکھ کی پُتلی میں چھُپا تھا
پلکوں پہ اگر مجھ کو سجا لیتے تو کیا تھا
تُو پھیل گیا تا بہ ابد مجھ سے بچھڑ کر
میں جسم کے زنداں میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا
ہاں مجھ کو ترے سُرخ کجاوے کی قسم ہے
اس راہ میں پہلے کوئی گھنگرو نہ بجا تھا
گزرے تھے مرے سامنے تم دوشِ ہوا پر
میں دور کہیں ریت کے ٹیلے پہ کھڑا تھا
سینے میں اُبھرتے ہوئے سورج کا تلاطم
آنکھوں میں تری، ڈوبتی راتوں کا نشہ تھا
گزرا نہ ادھر سے کوئی پتھر کا پجاری
مدت سے میں اس راہ کے ماتھے پہ سجا تھا
اب جانیے کیا نقش ہواؤں نے بنائے
اس ریت پہ میں نے تو ترا نام لکھا تھا
اے دیدہء حیراں تُو ذرا اور قریب آ
اے ڈھونڈنے والے میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا
اچھا ہے رشید آنکھ بھر آئی ہے کسی کی
اس خشک سمندر میں تو مَیں ڈوب چلا تھا

سہیل اختر (بھوبنیشور)

یہ کون ہے جو مقدر کا کھیل کھیلتا ہے
مجھے پہاڑ کی چوٹی سے کیوں دھکیلتا ہے

مری طرح کبھی پرواز کر نہیں سکتے
یہ جوڑ توڑ انہیں کا مجھے غلیلتا ہے

وہ چاہتا تو مری شب بھی جگمگا اٹھتی
رخِ سحر پہ مگر کولتار انڈیلتا ہے

جو تجھ کو سوچوں تو روشن نئے نئے امکاں
جو تجھ کو لکھوں تو کاغذ بھی جیسے پھیلتا ہے

یہ شہر جبر ہے یہ خود تمہیں سکھا دے گا
کوئی خموشی سے ہر کرب کیسے جھیلتا ہے

ادھر نہیں کہ ارادہ جدھر تھا جانے کا
ہجوم مجھ کو کسی اور سمت ریلتا ہے

تلاش جس کی ہے وہ شئے ملے بھی کیسے سہیلؔ
کہ جستجو کو زمانہ مری نکیلتا ہے

سہیل اختر

میری آنکھوں میں ستارے سا چمکتا ہے کوئی
شب گئے دیر تلک مجھ میں سسکتا ہے کوئی

ڈوب جاتا ہے تری آنکھ میں جب چاند مرا
میرے اندر کہیں سائے سا سرکتا ہے کوئی

آسماں تاروں کا میداں ہے نہ ہی چاند ہے گیند
طفلِ نادان سا کیوں مجھ میں ہمکتا ہے کوئی

کیوں تمہیں بھیگنا بارش میں بھلا لگتا ہے
میری بات اور ہے مجھ میں تو دہکتا ہے کوئی

کٹ چکی جب ہے وہ شہ رگ ہی تعلق کی تو پھر
کیوں میرے سینے میں دل بن کے دھڑکتا ہے کوئی

لڑکھڑاتی ہے نقاہت سے غریبی میری
مجھ کو پی کر مرے نشّے میں بہکتا ہے کوئی

شہر کرفیو میں ہے سنسان گلی چپ ہیں شجر
کانپ جاتا ہوں جو پتّا بھی کھڑکتا ہے کوئی

شعر لکھتا ہوں میں قسمت کی سیاہی سے سہیلؔ
آج بھی مجھ میں ہمہ وقت دمکتا ہے کوئی

سہیل اختر

میں نے رنگوں کی حکومت سے بغاوت کی ہے
جرم تسلیم ہے خوشبو سے محبّت کی ہے

ہے تو ننھا سا دیا، پھر بھی یہ جرأت کی ہے
ظلمتوں میں بھی اجالے کی حمایت کی ہے

اب کوئی زخم ہو بھر جائے گا مجھ کو ہے یقین
آ کے اک پھول نے کل میری عیادت کی ہے

دل سے ہی سوچتا ہوں، کچھ بھی سمجھتا ہوں کہاں
جانِ من تم نے یہ بے کار ہی زحمت کی ہے

ٹوٹتی کیوں نہ قیامت پہ قیامت مجھ پر
مجھ میں جب قوّتِ برداشت قیامت کی ہے

جس کا مصرف نہ ہو، ہو جاتی ہے وہ شئے برباد
کس نے محسوس یہاں میری ضرورت کی ہے

لاکھ تاریک ہو شب میری ہے امید مجھے
اک ستارے نے چمکنے کی عنایت کی ہے

ایک جیسی ہے نظر پھر بھی ضرورت میں ہے فرق
ہے بصیرت کی تجھے اور مجھے حیرت کی ہے

سہیل اختر

طلب کیا جب اس نے اپنا خون دے دیا اسے
اسی بہانے اک ذرا جنون دے دیا اسے

ٹھٹھر رہا تھا اپنی ہی دسمبروں میں کب سے وہ
تو میں نے جا کے اپنا سارا جون دے دیا اسے

جسے عطا کیا ہے بھوک، ٹھوکریں، گداگری
نہ جانے کیوں مہارتِ فنون دے دیا اسے

بد انتظامیوں سے اسکی تنگ آ چکا ہوں میں
نہ جانے کیوں حکومتِ درون دے دیا اسے

نہ دے سکا میں اس کے خشک موسموں کو برگ و بار
تو اپنی آنکھ کے وہ مانسون دے دیا اسے

جسے جہان دے دیا قرار اس کا لے لیا
جسے نہیں دیا ہے کچھ سکون دے دیا اسے

بنا لیا پھر اس نے سحرِ سامری کا اک اِرم
خدا نے کیا نگاہ بھر فسون دے دیا اسے

اکیلا کیوں نہ چاند جگمگھٹے کے باوجود ہو
کہ انجمن بغیر حرفِ نون دے دیا اسے

سہیل اختر

ایسا وردان ملے جس کو وہ پاگل ہو جائے
ہاتھ سونے کو لگاتا ہوں تو پیتل ہو جائے

تنہا رہنا ہے تو تنہائی مکمّل ہو جائے
کیوں نہ ہر شخص تصوّر سے بھی اوجھل ہو جائے

مر چکا آنکھ میں امید کا پنچھی میرا
میرے ارمانوں کی دھرتی بھی نہ دلدل ہو جائے

عشق نازک سا وہ جذبہ ہے جو اندر اندر
کبھی چبھتا بھی رہے اور کبھی مخمل ہو جائے

جس کو چاہو نہ ملے جس کو نہ چاہو وہ ملے
زندگی تیرا معمّا بھی کبھی حل ہو جائے

لو میں جس کی میں جلا کرتا ہوں دن رات وہی
جب مجسّم ہوان آنکھوں میں تو بادل ہو جائے

وقت نے اتنی گذارش بھی مری ٹھکرا دی
آرزو تھی کوئی اک پل بھی مرا پل ہو جائے

گھر میں یاد آتے ہیں وحشت کے وہ دن رات سہیلؔ
ایسا ہو اب یہی کمرہ مرا جنگل ہو جائے

سہیل اختر

یہ گومگو ہے عجب کچھ کہا نہیں جاتا
کہے بغیر بھی لیکن رہا نہیں جاتا

نقوشِ پا سے بھی آگے ہے منزلِ مقصود
وہاں ہے جانا جہاں راستہ نہیں جاتا

رہائی قیدِ معانی سے لفظ پا نہ سکے
میں چاہتا ہوں بہت پر کہا نہیں جاتا

نہ زینے پر کوئی آہٹ نہ در پہ ہے دستک
تو کیوں سکون سے گھر میں رہا نہیں جاتا

یہ روز و شب کا تسلسل کہیں سے ٹوٹے تو
امید و یاس کا یہ سلسلہ نہیں جاتا

کچھ ایسے زخم کسی کو دکھا نہیں سکتے
کچھ ایسا درد جو بالکل سہا نہیں جاتا

کہاں وہ آرزو لکھتے طویل خط اس کو
یہاں تو فون بھی ہم سے کیا نہیں جاتا

سہیلؔ منتیں کرتی ہے روز تنہائی
مگر ہمارا ہی زعمِ انا نہیں جاتا

سہیل اختر

میں جب آیا تھا اک انجام کا آغاز لایا تھا
چھپا کر مٹھیوں میں زندگی کے راز لایا تھا

دھڑکنے کے کسی آہنگ سے واقف کہاں تھے دل
ہوا یوں پھر میں دھڑکن نام کا اک ساز لایا تھا

یہاں بستے تھے سناٹے، جمود اور خامشی پہلے
تو پھر اس برف پر میں شعلۂ آواز لایا تھا

کہ جنبش کر نہ پاؤں دوش پر بارِ گراں رکھا
پرندوں کی طرح میں خواہشِ پرواز لایا تھا

تو جاتے جاتے اس نے کر دیئے الفاظ ہی محدود
خبر تھی اس کو میں مفہوم کا اعجاز لایا تھا

لیے ہم فاختہ پہنچے کہ طے تھا امن ہونا ہے
مگر اپنی کلائی پر وہ ظالم باز لایا تھا

بھگتنا ہی تھا پھر تو منفرد ہونے کا خمیازہ
اکیلا میں یہاں سب سے الگ انداز لایا تھا

اگر سب ٹھیک تھا اخترؔ تو بس اک فون کر دیتے
یہی کہنے وہ کیوں چشمِ نمِ غمّاز لایا تھا

سہیل اختر

جائزہ لینے میں نکلا ہی تھا باہر بچ کر
دھیرے سے تیز ہوا نے کہا ''اخترؔ بچ کر''

ساتھ چلنے کا اگر شوق ہے تو آؤ چلو
پر مری جان ذرا سوچ سمجھ کر بچ کر

اب حضور آ ہی گئے ہیں تو ذرا رک جائیں
لوگ ہیں تاک میں جائے نہ ستم گر بچ کر

سخت پہرہ ہے درِ خواب پہ ارمانوں کا
میں کسی طرح چلا آیا ہوں اندر بچ کر

ہم سراپا نگۂ شوق بنے بیٹھے ہیں
اب کہاں جائے گی وہ لذّتِ منظر بچ کر

جس طرف دیکھئے جلتی ہوئی آنکھوں کی ہے لو
کیسے آئے وہ اِدھر موم کا پیکر بچ کر

ترکِ دنیا تو ہے آسان یہاں میری طرح
رہ کے دکھلائے تو اک دن وہ قلندر بچ کر

ایسے عالم میں پڑھے کون سنے کون سہیلؔ
عافیت ہے کہ ہیں ہم جیسے سخنور بچ کر

سہیل اختر

ٹین کے شیڈ میں مرا خوابِ گماں رہتا ہے
زنگ آلودہ سا احساسِ زیاں رہتا ہے

گرد آلود مری آنکھ، یہ مجمع بھی وہی
میرے اطراف عجب زرد سماں رہتا ہے

ہجر کا زہر بھی چڑھنے لگا اب نس نس میں
ہے جو تریاق خدا جانے کہاں رہتا ہے

اچھے اچھوں کو کیا وقت نے ٹھنڈا مری جاں
تھے جہاں شعلے ابھی صرف دھواں رہتا ہے

لوگ اتنے ہیں کہ رونق سی سدا گھر میں مگر
سونا پن ایک عجب سب میں نہاں رہتا ہے

رات آجاتی ہے جب سبز پری مت پوچھو
میں کہاں ہوتا ہوں احساس کہاں رہتا ہے

خود فریبی کی ہی کوشش تھی محبت میری
عمر بھر ساتھ بھی اب کون یہاں رہتا ہے

ساجد حمید (شیموگہ)

آسماں روٹھا زمیں تنگ ہوئی
رات جب مجھ سے ہم آہنگ ہوئی

میری آنکھوں میں اتر آیا فلک
ڈوبتی شام دھنک رنگ ہوئی

کیا کروں چاند ستارے لے کر
جب تپسیا ہی مری بھنگ ہوئی

تھام کر دامنِ شب میں جو چلا
فتنہ گر چشمِ سحر دنگ ہوئی

وہ جو لگتی تھی فرومایہ گھڑی
فہم و ادراک کا ارژنگ ہوئی

معتبر ہو گیا لمحوں کا سفر
عکس اور شیشے میں جب جنگ ہوئی

☆

ساجد حمید

ہوا میں خواب سبک رو اچھال دیکھتے ہیں
کہ سارے شہر کو حیرت میں ڈال دیکھتے ہیں

شگفتہ لمس کی رنگین آہٹوں میں چھپے
سلگتے درد کو نغموں میں ڈھال دیکھتے ہیں

جو ایک ربط فلک سے تھا قہر جاں ٹھہرا
چلو یہ خار بھی دل سے نکال دیکھتے ہیں

ہیں صاحب نظراں ہی خموش یا قسمت
اداس چاند ہے سورج نڈھال دیکھتے ہیں

وہ آزمائے ہی کیوں ہم کہاں کے پیغمبر
برہنہ ہو گئی تابندہ ڈال دیکھتے ہیں

وہ سیپیوں پہ ہیں قانع، امام ساحل زاد
امیر بحر سمندر کنگال دیکھتے ہیں

کسے پڑی ہے سنبھالیں امانتیں ساجد
ہے کج کلاہی کا بے شک زوال دیکھتے ہیں

☆

ساجد حمید

الاؤ جلتے رہیں قصہ گوئی جاری رہے
نشہ نہ ٹوٹنے پائے جنون طاری رہے

چلو کچھ ایسی جگہ ڈھونڈ کر بسا لیں گھر
وجودِ عکسِ زیاں ہو نہ غم گساری رہے

خدا کرے کہ کوئی ایسا وقت بھی آئے
نہ دیوتاؤں کا چکر نہ ہی پجاری رہے

یوں دشمنی کی بھی رکھتا ہے کوئی لاج میاں
کہ اس کی مات نہ ہو جیت بھی ہماری رہے

بدل گئی ہے فضا زندگی کی ورنہ حمیدؔ
کسی زمانے میں ہم بھی بڑے شکاری رہے

ساجد حمید

شعلۂ جاں سمٹ گیا معلوم
مل گئی خاک میں ہوا معلوم
اس نے جو دی تھی وہ خلاؤں میں
ہو گئی منتشر دعا معلوم
کر گئی ریزہ ریزہ ہر منظر
جانے کس کی نظر خدا معلوم
جس طرف موجۂ غبار اٹھا
اس طرف رنگ، شہر تھا معلوم
دشتِ ویراں کو کر گئی آباد
حسنِ بے سمت کی صدا معلوم
آرزو کے کھنڈر کی سانسوں میں
پھر مہکنے کو ہے ضیا معلوم
ڈھل گئے پتھروں میں عکسِ نفوس
کس نے پھونکا تھا سحر کیا معلوم
شب کا جادو رگوں میں پھیل گیا
حرف سر سبز جل اٹھا معلوم
ذہن کی تہ میں دفن برسوں سے
جو پڑا ہے وہ حادثہ معلوم
جھیل میں چاند کے اترتے ہی
سارا جنگل چمک اٹھا معلوم
مجھ سے بادل حمیدؔ پوچھتے ہیں
کیا خدا کا تمہیں پتا معلوم

ساجد حمید

فلک پر خشک سالی ہے دنوں بعد
زمیں کی آنکھ خالی ہے دنوں بعد

وہ میری آگ سے ہو کر منزہ
الگ کیا رہ نکالی ہے دنوں بعد

کہیں چشم ِ جبیں پھر کھل نہ جائے
کہ دشت ِ دل سوالی ہے دنوں بعد

سمجھ میں وقت کا آیا کرشمہ
نظر خود پر جو ڈالی ہے دنوں بعد

کہا اس نے بالآخر مسکرا کر
یہ دنیا دیکھی بھالی ہے دنوں بعد

عجب اک کشمکش سی اندروں ہے
ضیا بھی کالی کالی ہے دنوں بعد

کوئی مجنوں مگر آتا نہیں ہے
مرا صحرا سوالی ہے دنوں بعد

خدا رکھے تجھے آباد ساجدؔ
غزل تو نے بنا لی ہے دنوں بعد

ساجد حمید

یہ کیا کہتے ہو تم وہ من گیا ہے
خبر آئی ہے ظالم تن گیا ہے

کوئی حاجت نہیں اب کشتیوں کی
خدا کے فضل سے پل بن گیا ہے

بلائے جاں کہ قہر جاں تھا کیا تھا
ترے آنے سے خالی پن گیا ہے

بگولے آتشیں اٹھنے لگے ہیں
خدا جانے کدھر ساون گیا ہے

ہوا ہے جب سے دل قلاش ساجدؔ
ہمارے ذہن کا بچپن گیا ہے

عطاء اللہ (ایبٹ آباد)

اے عشق تو اکیلے میں ڈر تو نہیں گیا
میں سانس لے رہا ہوں میں مر تو نہیں گیا

کیوں روشنائی اڑنے لگی ہے خطوط کی
تو اپنی دوستی سے مکر تو نہیں گیا

اک پھول کھلنے والا تھا چشمے کے آس پاس
خواہش کی آندھیوں میں بکھر تو نہیں گیا

چلتے ہوئے بھی رکھتا ہے نظریں زمین پر
اے دل تو آسمان سے بھر تو نہیں گیا

اک زرد پیڑ نے کئی لوگوں سے یہ کہا
کیا موسم بہار گزر تو نہیں گیا

آوارگان شہر سنو چاند کی طرح
رستہ بدل لیا ہے میں گھر تو نہیں گیا

عطاء اللہ

گلی کا عام سا چہرہ بھی پیارا ہونے لگتا ہے
محبت میں تو ذرہ بھی ستارا ہونے لگتا ہے

یہاں گم سم سے لوگوں پر کبھی پلکیں نہیں اٹھتیں
اشارا کرنے والوں کو اشارا ہونے لگتا ہے

ہماری زندگی پر ہے ہمارے عشق کا سایہ
کہ ہم جو کام کرتے ہیں خسارا ہونے لگتا ہے

محبت کی عدالت بھی بھلا کیسی عدالت ہے
کہ جب بھی اٹھنے لگتے ہیں پکارا ہونے لگتا ہے

عطاؔ بے صبر لوگوں کے کبھی برتن نہیں بھرتے
گزارا کرنے والوں کا گزارا ہونے لگتا ہے

عطاءاللہ

کسی کسی کا نام عطا پائندہ رکھے گی
وہی رہے گا جسے محبت زندہ رکھے گی

مرضی سے وہ دن لائے گی اور مرضی سے شام
میرے چاند اور سورج کو شرمندہ رکھے گی

آدھی بات سے جس نے ہم کو آدھا مار دیا
آدھی بات پہ کب تک ہم کو زندہ رکھے گی

دھوپ اور دھول سے پژمردہ ہیں ان شہروں کے پھول
گاؤں سے تتلی آ کے انہیں تابندہ رکھے گی

وہاں وہاں پر کھلے ہوئے ہیں پھول بنفشے کے
جہاں جہاں وہ اپنے قدم آئندہ رکھے گی

عطاءاللہ

دل! تجھ میں ہر اچھی صورت بھر دوں گا
اک دن ساری دنیا خالی کر دوں گا

حسن تجھے بس اپنی ہی پڑ جائے گی
تجھے میں تیرے کم ہونے کا ڈر دوں گا

اے کم صورت دنیا مجھ کو چھونے دے
تجھے تو میں جنت سے بہتر کر دوں گا

مجھ سے بچھڑ کر دھواں رہے گا آنکھوں میں
تجھ میں تو میں آگ ہی اتنی بھر دوں گا

دل تو کیا ان گلیوں سے بھی مجھے نکال
پاگل شخص ہوں سب کو پاگل کر دوں گا

در در گھومتی یادو! واپس آجاؤ
تم کو گود میں لوں گا اپنا گھر دوں گا

ڈاکٹر ریاض اکبر (آسٹریلیا)

کبھی تو رم جھم گرد میں ڈوبے پتوں کو نہلائے گی
پُروا دھوپ کا ہاتھ پکڑ کے دور کہیں لے جائے گی

آتی رُت میں پیا ملن کی سوچوں کی تصویر کوئی
کھلے صحن میں اجلے بستر پر پلکیں جھپکائے گی

صاف ہوا میں بادل تارے آنکھ مچولی کھیلیں گے
کبھی تو میری بستی میں بھی رات کی رانی آئے گی

پاگل ہو چلا چلا کر امن کی باتیں کرتے ہو
اک دوجے سے پہلے دنیا تم پر تیر چلائے گی

شہر میں اہلِ خرد کی نوبت بجتی ہے تو یار مرے
ویرانوں میں اہلِ جنوں کی شہرت بھی ہو جائے گی

لاکھ کھپاؤ گے تم نظریں دن کو گھر کے کاموں میں
رات جگے کی سرخی لیکن آنکھوں میں لہرائے گی

ذرا سا میرے ہاتھ کو چھو کے وہ یہ کہہ کر چلا گیا
اب سے تیری تحریروں میں میری خوشبو آئے گی

اجڑے باغ میں خالی خرمن پر منڈلاتی خلقِ خدا
خود کو ریاضِ خلدِ بریں کے قصوں سے بہلائے گی

ڈاکٹر ریاض اکبر

شیشے سے نازک خوابوں کو کرچی کرچی پھوڑ گیا
دہشت کا عفریت ہزاروں امیدیں بھنبھوڑ گیا

بوڑھے شہروں کے نقشوں پر شکنیں میلی گلیوں کی
نئی کلوں کا بھاری دُھرا جن کو توڑ مڑور گیا

سوکھے پتے پیڑ سے چمٹے رہنے پر ہی راضی تھے
اک آوارہ جھونکا انکا یہ بندھن جھنجھوڑ گیا

لفظ چلے پھر سوچوں کے بازار میں سودا کرنے کو
دل پھر سے کچھ یادیں اپنے خانوں میں بند چھوڑ گیا

اپنا سب احوال کہا تا وہ بھی دل کی بات کرے
لیکن باتوں باتوں میں وہ باتوں کا رخ موڑ گیا

اپنی آب دکھانے سے کچھ اپنے ہی رنگ ماند پڑے
خود سورج نے دھنک بنائی خود ہی اس کو توڑ گیا

رات اُجالے کی تنہائی تارہ تارہ روشن تھی
دن آیا تو نقطہ نقطہ دھوپ کا پردہ جوڑ گیا

وہ خوش رنگ ریاض سے نکلا لیکن پھر سے ملنے کو
جاتے جاتے اک ہلکی خوشبو کا رستہ چھوڑ گیا

ڈاکٹر ریاض اکبر

خواب سی بات ہے پر جن دِنوں تم ساتھ رہے
دل شگفتہ سا رہا، پھول بھی رنگیلے اُگے

صبح تک کُھل گئی چپکے سے ہوئی رات جو بات
جن پہ شبنم تھی لُٹی پات وہ چمکیلے اُگے

جب بہار آئی تو پتوں سے بدن ڈھانپ لئے
جتنے بھی پیڑ اُگے باغ میں شرمیلے اُگے

یوں بدل ڈالا ہے گلچیں نے گلستاں کا مزاج
خار تو خار ہی تھے پھول بھی نوکیلے اُگے

ابر کچھ اتنا گریزاں تھا قحط اتنا شدید
سبزہ زاروں کی جگہ ریت کے کچھ ٹیلے اُگے

برف کی رُت میں یہاں خستہ مکانوں کے قریب
پیڑ سب دَب گئے پر جسم بہت نیلے اُگے

کوئی تو آس بندھاؤ کہ پھلو پُھولو گے
بُور پیڑوں پہ کسی طور کسی حیلے اُگے

اپنے سینے میں دبا رکھے امنگوں کی اُٹھان
کوئی بھی بیج نہ اس دَور میں زہریلے اُگے

خوف اور بھوک سے سیراب مری بستی میں
اب کے انسان بھی سرسوں کی طرح پیلے اُگے

ڈاکٹر ریاض اکبر

کچھ عنایاتِ گذشتہ ہی جتانے آیا
اب کے وہ شخص محض دل ہی دُکھانے آیا
رُک سے جاتے تھے مرے شام وسحر جس کے بغیر
میری دُنیا وہ بہت تیز گھمانے آیا
اپنی آہٹ کی شناسائی مجھے بخش گیا
اور پھر بھول کے کوچے نہ پرانے آیا
سارے دروازے کھلے رکھے تھے جس کی خاطر
وہ مِرے صحن کی دیوار گرانے آیا
اَن کہے لفظوں کی تشنہ لبی دیکھی نہ گئی
تو مَیں چپکے سے انہیں اشک پلانے آیا
دُھول تکتی رہی اُٹھ اُٹھ کے چھتوں سے اوپر
کوئی بادل نہ مگر بوند لُٹانے آیا
دیس میں دَور تھا کچھ چھوٹے بڑے سِکّوں کا
جن کے فرمان کو ہر شخص نبھانے آیا
ہم کو بَن باس سہی، تم کو مِلا راج تو کیا
شہر تو دیپ مری راہ میں جلانے آیا
پھر وہ حالات کی جھانجن وہ خیالوں کا ریاض
وقت لفظوں کو نیا رقص سکھانے آیا

ڈاکٹر ریاض اکبر

خانۂ دل میں تری یاد تھی مہماں کی طرح
ایک دن وہ بھی مجھے چھوڑ گئی جاں کی طرح

اتنی اُمید تھی اُس شوخ دہن سے دل کو
اُس کا انکار بھی کانوں نے سنا ہاں کی طرح

مٹ گئیں دھوپ سے پانی کی لکھی تحریریں
پھول سے رنگ اُڑے باغ سے مرغاں کی طرح

لوگ چنوائے ہوئے شہر کی دیواروں میں
لختِ اُمید لئے دیدۂ حیراں کی طرح

چشمِ یعقوب ہی مائل نہیں بہ گریۂ شب
ورنہ کنوؤں میں کئی چاند ہیں کنعاں کی طرح

ہاں یہ سیلاب اتر جائے گا،لیکن لوگو!
وہ میرا گھر جو کہیں بہہ گیا چوباں کی طرح

لے چلے اپنا بدن،کاسۂ دل،توشۂ جاں
گھر کا سامان کیا رختِ فقیراں کی طرح

دن کو گھمسان کا اک رَن تھا مگر ہر جانب
رات سی رات ہے اب شامِ غریباں کی طرح
دُود ھ کی طور پگھل جائے گا مَرمَر کا بدن
اک ریاض اور ذرا سنگ تراشاں کی طرح

ڈاکٹر ریاض اکبر

دنیا کے دکھ کا سایہ جو دل پر پڑتا رہتا ہے
چاند کی صورت درد تمہارا گھٹتا بڑھتا رہتا ہے
صحن میں تم، دالان میں تم، خوشبو کی طرح، شمع کی طرح
سُونے گھر میں دل یوں ہی افسانے گھڑتا رہتا ہے
تم وہ بادل ہو جو ساون بھادوں میں بھی نہ آئے
میں وہ سُوکھا بُور جو پیاسے پیڑ سے جھڑتا رہتا ہے
ایک ہمارا طور کہ جاگیں روز نئی امید کے ساتھ
ایک مزاجِ یاراں کہ ہر شام بگڑتا رہتا ہے
اُن کو چھو کر مجھ سے پوچھا نرم ہوا کے جھونکے نے
کہاں ہے وہ دیپک جو طوفانوں سے لڑتا رہتا ہے
سوچ کبھی کی اُس کے در پر دھرنا دھر کے بیٹھی ہے
پاؤں مگر پھر پاؤں ہے، جمتا ہے اکھڑتا رہتا ہے
ساری برف پگھل کر کب کی جا پہنچی ہے ساحل تک
کس پانی کی خاطر پگلا کھیت اجڑتا رہتا ہے
اُس کو کیا جو نیلی جھیل میں سیپ کی بستی اجڑ گئی
وہ رُوپہلے گہنوں میں بس موتی جڑتا رہتا ہے
آؤ دھوپ کے موسم میں دیواروں کو اونچا کرلیں
آگے پھر برساتیں ہیں دریا بھی چڑھتا رہتا ہے
ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ شہروں کے پھیلاؤ میں
دیواریں تو بڑھتی ہیں، انسان سکڑتا رہتا ہے

جوگندر پال (دہلی)

گرین ہاؤس

یو۔این۔او کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل کے اس نجی سن ڈاؤنز سے مولو اب گھر لوٹنا چاہ رہا تھا مگر اس نے اتنی پی لی تھی کہ اسے ڈر تھا، اٹھا تو لڑکھڑانے لگوں گا۔

آسٹریلین لاکر اس کی خواہش اور خوف بھانپ کر ہنسنے لگا۔ ''پر جب نشے کا یہ عالم ہو تو گھٹنوں کو سیدھا ہی کیوں کیا جائے۔''

لاکر سے مولو نے پوچھنا چاہا کہ یہ کیا نام ہوا، لاکر؟ اور خود ہی جواب بھی دینا چاہا۔ اچھا اپنے جرائم پیشہ باپ دادا کی یاد میں اب تمہارا منہ بند ہے.......مگر اپنے سامنے ہی بیٹھے امریکی فارن آفس کے ایک سینئر آفیشل کو پا کر وہ اسی پر ٹوٹ پڑا۔ ''مسٹر لاکر کیا تم ہماری امریکی سرکار کی کسی حالیہ بدحواسی پر تبصرہ کر رہے ہو؟''

''مطلب یہ کہ جب سے روسیوں نے تائب ہو کر کان پکڑ لئے ہیں، وائٹ ہاؤس نشے میں اپنی دو ٹانگوں پر کھڑا ہی نہیں ہو پا رہا ہے۔ تم یہی کہنا چاہ رہے تھے نا مسٹر لاکر؟'' مولو نے اپنی بات سے محظوظ ہو کر سٹیورڈ سے ایک اور وہسکی طلب کی۔ ''ان حالت میں کیا یہ بہتر نہیں، مائی ڈیر بلیک برڈ۔'' اس نے امریکی آفیشل سے پوچھا ''امریکی سرکار ذرا دم لینے کے لیے چپ چاپ بیٹھی رہے؟''

لاکر نے شاید وہسکی کا گھونٹ بھرنے کے لیے منہ کھولا تھا مگر وہ بول اٹھا۔ امریکی کا تو خاصہ ہے کہ دم لینا ہو تو اور تیز چلنے لگتا ہے۔

''میں بھی تو امریکی ہوں۔'' مولو نے اسے جواب دیا۔ ''میں تو دم لینے کے لیے دم ہی لیتا ہوں۔''

'اسی لیے وہ امریکی سیاست دان۔ کیا نام ہے اس کا؟ وہ تمہاری امریکیت کو مشکوک قرار دیتا ہے۔'' لاکر کو نشے میں زبان کو ڈھیلا چھوڑ دینا بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔ ''وہ تمہاری ساری صحافتی سلطنت خریدنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔''

''سنو مسٹر لاکر۔'' مولو پل بھر بے چین سا ہو کر وہی مول چند دھرم چند نظر آنے لگا جو کوئی ڈیڑھ ایک دہا پہلے کینیا کی آزادی پر وہاں اپنا سارا بزنس بیچ کر۔ یو۔ایس۔اے۔ میں آبسا تھا۔ ''تمہارا وہ گھاگ سیاست

دان ہی سرتاپا بک جائے گا۔'' اسے گویا اپنا یہ بیان بھی ناکافی لگا۔

''میرا مطلب ہے بشرطیکہ میں نے اسے خریدنا چاہا۔''

مولو نے ایک ہی ڈیک میں اپنی ساری وہسکی حلق سے اتار لی تو آپ ہی آپ پرسکون ہو کر مسکرانے لگا۔

بلیک برڈ کے کان بھی ڈھیلے ہو کر نیچے لٹک آئے اور وہ ہنس کر کہنے لگا، اگر تم میری تنخواہ کی دگنی رقم دینے پر تیار ہو مولو، تو مجھے ہی کیوں نہیں خرید لیتے؟''

''دگنی تنخواہ پر کیوں''

''ہیٹی کہتی ہے'' بلیک برڈ بدستور ہنستے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا، جو پینے سے سیر ہو کر کھا کھا کر منہ ہلائے جا رہی تھی۔ ''اگر تم دگنی تنخواہ نہ لائے تو تمہیں طلاق دے دوں گی۔''

''طلاق کے جھنجھٹ میں کیوں پڑتی ہو، ہیٹی ڈارلنگ،؟'' مولو نے بلیک برڈ کی بیوی کو مشورہ دیا۔ ''دگنی تنخواہ کے لیے دو خاوند کر لو۔'' ہیٹی اور بلیک برڈ نے سب سے اونچا قہقہہ لگایا۔

''اپنی بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لائے، ناٹی بوائے؟'' ہیٹی مولو سے پوچھنے لگی۔ ''کیسے لاتا؟ عین وقت میں اس کے ایک دانت میں درد جاگ پڑا۔ گھریلو نسخوں سے بات بننے میں نہ آئی تو میں نے ڈاکٹر کو فون کیا۔'' مولو نے سیٹورڈ کو ایک اور وہسکی کا اشارہ کیا۔ ''میں اسے ڈاکٹر کے گھر چھوڑ کر یہاں چلا آیا ہوں۔''

''خوبصورت عورتوں کو رات کے وقت جوان ڈاکٹروں کے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' ہیٹی اپنے پرس سے شیشہ نکال کر ہونٹوں پر لپ سٹک کی تہہ جمانے لگی۔

''خوبصورت عورتوں کی ترجیح اگر یہی ہو۔'' مولو ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی ایک دوسرے کے لیے اپنی محبت کو دہرا دہرا کر از حد بور ہو چکے ہیں۔ ''تو ہمارے امریکی قانون کے تحت شوہروں کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انہیں انہی کی ترجیحوں پر چھوڑ دیں اور اپنی ترجیح دریافت کریں۔''

جواباً ہیٹی نے اپنے بال جھٹک کر کچھ اس طرح آنکھیں مٹکائیں گویا کہہ رہی ہو، میں تو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں مگر مجھے دریافت کرنے کے لیے تم نامعلوم کہاں بھٹک رہے ہو۔'' تمہیں گھر جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیا پتہ ڈینٹسٹ اسے ساری رات علاج کے لیے وہیں روکے رکھے؟''

''مگر تم یہ کیوں سمجھتی ہو لٹل گرل، کہ گھر لوٹ کر ہم واقعی گھر جا پہنچتے ہیں؟''

''تو پھر کہاں جا پہنچتے ہیں؟''

ہیٹی کا خیال تھا کہ انجان پن کے میک اپ سے عورت کی جنسی کشش میں ڈھیروں اضافہ ہو جاتا ہے۔

''کیا پتہ کہاں؟'' اگر ہیٹی کا شوہر وہاں موجود نہ ہوتا تو مولو ہیٹی کے قریب سرک کر اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا لیتا۔ ''برڈی'' اس نے ہیٹی کے شوہر کو مخاطب کیا۔ ''اگر میں واقعی تمہیں خریدنا چاہوں تو کتنے پیسے لو گے؟'' اور

پھر اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ہیٹی کی طرف منہ پھیر لیا۔''ہاں''ہیٹی ڈیئر، کیا پتہ کہاں؟''

لیکن مولو کے ذہن میں اپنے گھر کا تصور صرف اسی ایک گھر سے بندھا ہوا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا ....ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے سے کچھ ہی فاصلے پر اس چھوٹے سے میدانی شہر سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا نہایت پرانا مکان، جو اتنا بڑا تھا کہ اتنے سالوں کی دوری سے بھی مولو کو ویسے ہی صاف دکھائی دیتا تھا، اور اتنا پکا کہ ابھی تک اس کے دل و دماغ میں جوں کا توں کھڑا تھا۔سیالکوٹ میں وہ کبھی گھر پہنچنے سے لیٹ ہو جاتا تو یہاں ٹرنکوں والے بازار سے اس جینیوں کی گلی میں ڈگ بھرتے ہوئے وہ وہاں اس پل پر آ پہنچتا۔۔اور پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے ایک سانس میں مندر کے پڑوس میں اپنے گھر کے دووازے کے سامنے۔

''بھابو جی!''

وہ گلا پھاڑ کر ماں کو آواز دیتا اور اس کی باولی ماں گویا اپنے بھیتر سے اسی کو ڈھونڈ رہی ہوتی اور اس کی آواز سنتے ہی بے اختیار اندر سے وارد ہو کر اپنے بازوؤں میں لے لیتی۔''تو کدھر نکل گیا سیں، مولو؟''بچپن میں بھی مول چند کو سب مولو ہی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔''کہہ کے جایا کر پترا۔''

''یا پھر ہیٹی''مولو نے اچانک ہیٹی کی طرف منہ اٹھا کر کہا''گھر وہ ہوتا ہے جہاں ہمارا انتظار کیا جاتا ہے۔''

بلیک برڈ نے زور سے قہقہہ لگایا''کس سے مخاطب ہو مولو؟ میری بیوی کو تو اس کی ایک دوست لے گئی ہے۔''

''کہاں؟......''

''یہیں کہیں کسی دلچسپ آدمی سے ملانے۔''

''دلچسپ آدمی''مولو نے منہ میں بڑبڑا کر وہاں سے ایک بار پھر اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن لڑکھڑا سا گیا اور پھر بیٹھ گیا۔

''تمہارا گھر بہت دور ہے مولو۔کیا تمہیں یقین ہے، بہ حفاظت پہنچ جاؤ گے؟''آسٹریلین لاکر نے مولو سے بھی زیادہ چڑھا رکھی تھی لیکن وہ کسی عادی مجرم کی طرح بڑا پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''فکر مت کرو لاکر''بلیک برڈ بولا''ہماری امریکی گاڑیاں بڑی قابلِ اعتماد ہیں۔''

''کیا وہ تمہاری طرح شراب نہیں پیتیں؟''روسی سفیر ایک جرمن امریکی فائر آرمز ڈیلر کے بازو میں بازو ڈالے کسی عرب ریپبلک کے نمائندے کے ساتھ یک بیک ان کے سروں پر آ کھڑا ہوا۔

''نہیں وہ ہماری مقدس مادرِ وطن کا تیل پیتی ہیں۔''عرب جمہوریہ کا نمائندہ سب کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔

''میں سمجھتا تھا ایکسی لنسی، تم دعویٰ کرو گے تمہاری مقدس مادر وطن کا دودھ پیتی ہیں۔''مولو کے ہاتھ پیر جواب دینے لگتے تو اس کا ذہن تن جاتا۔وہ سوچنے لگا، کیا ہی اچھا ہو جو آدمی کا اٹھنا بیٹھنا.........اس کی تمام تر

ٹریفکنگ صرف اس کے ذہن میں ہو، اس کے سارے کام یہیں انجام پاتے رہیں۔

اسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے پا کر سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں دراصل پراچین بھارت کے ان رشیوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا جو ایک بار کسی درخت کے نیچے کچی مٹی پر سمادھی لگا لیتے ہیں تو مٹی میں اتنے مٹی ہو جاتے تھے کہ ان کے وجود پر درخت اگ آتے مگر وہ اندر ہی اندر متواتر ڈھرکتے رہتے تھے اور ان کے وجود میں ساری کائنات سمٹ آتی تھی اور...........''

''خدا کے لیے مولو!''جرمن امریکی کارخانے دار نے مولو کو ٹوکا۔''ہم تمہارا یہ آرٹیکل کل تمہارے گڈ اولڈ، آل ورلڈ میں پڑھ لیں گے۔اس وقت صرف باتیں کرو، صرف منہ نہ ہلاؤ۔''

''اس میں کیا مشکل ہے؟''مولو نے جرمن امریکی کو کھانے کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دیکھ کر کہا''پیٹ بھرتے جاؤ، منہ ہلتا رہے گا۔''

''اس سے میرا کام بہت مشکل ہو جائے گا۔اسی گروہ کے ایک کونے میں عالمی ادارے کے فوڈ فار آل پروگرام کا باس بھی چپکے سے آ بیٹھا تھا۔''ہاں، مائی ڈیر مولو، اگر ہم نے اتنا کھانا شروع کر دیا''جرمن امریکی نے اشیائے خوردنی سے ہاتھ کھینچ لیا''تو تمہارے ہندوستان بھیجنے کیلئے کیا بچے گا؟''

''فائر آرمز، مائی ڈیئر ڈیلر ان ڈیتھ!''

''سبھوں کے قہقہے کسی بم کے مانند پھوٹ پڑے، جس سے آس پاس کے لوگ انہیں تجسس سے دیکھنے لگے۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔فوڈ فار آل پروگرام کا باس کہنے لگا۔''جب ہندوستان اور پاکستان کے پاس پیٹ بھر کھانا بھی نہیں تو وہ کسے بچانے کے لیے اپنا سارا پیسہ ڈیفینس پر خرچ کر دیتے ہیں؟''

''اور کسے اپنی بھوک اور...........''

''اور خدا کو.............ہے نا؟''

''ہاں ہندوستانی ہو یا پاکستانی، خدا کو بھی اپنے سامان میں باندھ کر پناہ کی تلاش میں دنیا بھر میں مارا مارا گھوم رہا ہے۔''

''خدا کو بھی کیوں؟''

''خدا کے بغیر اس کے لڑنے جھگڑنے کی خواہش کیونکر پوری ہوگی؟''سب ہنس دیے۔

''ہنسنے کی بات نہیں۔گھر میں آگ لگی ہو........''

''کون لگاتا ہے آگ؟''

''گھر میں آگ لگی ہو''بولنے والے نے ذہن میں بکھرتے ہوئے جملے کو جلدی سے از سر نو یکجا کیا ۔تو ہر شخص عافیت کے لیے باہر کی طرف دوڑتا ہے.........''

''عافیت!'' مائی فٹ!'' جرمن امریکی انہیں بتانے لگا۔'' میرے بھائی نے جرمنی سے لکھا ہے کہ وہاں بیسیوں مشکوک اڈوں پر ایک ایک کمرے میں ایک ایک درجن ایشیائی بیمار مویشیوں کی طرح فرش پر اوپر تلے پڑے رہتے ہیں اور پولس ویزا چیک کرنے لیے چھاپہ مارتی ہے تو وہ دہائی دینے لگتے ہیں، ہماری کھال کھینچ لو، جان لے لو، پر ہمیں واپس گھر مت بھیجو........''

''تعجب ہے.........ان کی بیوی بچے.....''

''بیوی بچوں کو بھی یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ گھر نہ لوٹ آئیں۔''

''تعجب ہے.....!''

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اگر وہ گھر لوٹ جائیں تو انہیں پردیس سے پیسہ کون بھیجے گا.......؟ کیوں، مولو.....؟''

''اوشٹ اپ!'' مولو اسے بڑی موٹی گالی بکنا چاہتا تھا مگر اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور جوان بہن کو پیچھے چھوڑ کر پہلے پہل کینیا آ نکلا تھا۔ ان دنوں ان کے یہاں اس کے دور کا ایک رشتے دار آیا ہوا تھا جس نے کینیا میں اپنی گروسری سے لاکھوں کی دولت پیدا کر رکھی تھی، گروسر نے اس کی بی۔ اے کی تھرڈ کلاس کی ڈگری پر ریجھ کر اسے کینیا چلنے پر آمادہ کر لیا تھا، تا کہ وہاں پہنچ کر وہ اس کی لڑکی سے شادی کر لے۔

کینیا میں مولو کی دلہن ایک دن اسے اپنے باپ کی گروسری وین میں نیشنل پارک لے گئی جہاں میلوں کے احاطے میں جنگلی جانور کھلے بندوں گھومتے پھرتے۔ اس روز کا ایک منظر مولو گویا اس وقت اس سن ڈاؤئر میں بعینہ دیکھ رہا ہو۔ ایک جنگلی بیل سر جھکائے گھاس پر منہ مار رہا ہے کہ اس کی پشت سے اچانک ایک شیر اس پر چڑھ آیا اور اسے چیرنے پھاڑنے لگا ہے مگر بیل بدستور اپنی چار ٹانگوں پر کھڑا ہے اور منہ میں آئی گھاس کو تیز تیز چبانے لگا ہے کہ مرنے سے پہلے اسے حلق سے اتار لے.......

وہ ساری رات مولو نے چپکے چپکے رو کر گزاری تھی اور اپنے ماں باپ اور بہن تینوں کو مخاطب کر کے ایک بڑی لمبی چٹھی لکھی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہر مہینے تنخواہ کے دن گھر پہنچنے سے پہلے انہیں اپنی نصف تنخواہ کا منی آرڈر پوسٹ کر دیا کرے گا۔ اس کے پہلے منی آرڈر کی وصولی پر بابا نے اسے فوری طور پر مطلع کیا تھا کہ یہاں پوری خیریت ہے۔ تمہارا منی آرڈر مل گیا ہے اور ہم نے سوچا ہے کہ اگلے تین ماہ کے منی آرڈروں سے پہلا کام یہ کریں گے کہ سارے گھر کا فرش پکا کروالیں.....تمہاری ماں اور تمہاری بہن کچے فرش کی لیپ پوت سے عاجز آ چکی ہیں اور.....

''شٹ اپ.....!'' مولو نے سر اٹھا کر فائر آرمز ڈیلر سے کہا مگر جب جرمن امریکی نے اسے ہنستے ہوئے بتایا ''میں تو تم سے پوچھ رہا ہوں بھائی، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے''، تو اس نے آواز لٹکا کر جواب دیا،'' آئی ایم ساری مائی ڈیئر مٹر۔۔۔''

''تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟''

''نہیں، میں نے بہت پی لی ہے۔'' مولو نے کہا'' ان حالات میں میرا نشہ اس وقت کم ہوتا ہے جب اور پیوں.........''

''اور......!'' جرمن امریکی نے جھوم کر کہا'' شراب کا نشہ ہو یا پاور کا، یا کوئی بھی اس کا تدارک اسی طور ممکن ہے''....اور.....پھر وہ سبھوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔'' ہیئر از دا میسج فرام آور گریٹ امریکا.......اور.......ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے، بس اور........! گلاس اٹھاؤ دوستو اور اپنے اس امریکی دوست کی خوشی کی خاطر ایک ہی ڈیک میں سارا بچا کچا اور پی جاؤ......''

سبھوں نے اپنے گلاس خالی کر دیئے تو دو سٹیورڈ بڑی خاموش مستعدی سے آگے بڑھ کر ان کے لیے اور شراب انڈیلنے لگے۔

مولو نے اپنے بھرئے ہوئے گلاس پر نگاہ ڈالی اور اسے چھوئے بغیر کھڑا ہو گیا:'' تھینک یو، ایوری باڈی باقی کی میں اب گھر جا کے پیوں گا۔''

''یہیں کیوں نہیں؟ بلیک برڈے نے اس سے پوچھا۔

''کیوں کہ اپنے مکان کی چار دیواری میں مجھے اپنا آپ بھروسے کے قابل معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی ایک جگہ ہے جہاں میں دھت چین سے سو جاتا ہوں۔''

ہٹی اس وقت انہی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ مولو کا جملہ کان میں پڑنے پر وہ کہنے لگا'' گھر میں سوؤ گے کس کے ساتھ مولو؟ تمہاری بیوی تو اپنے ڈینٹسٹ کے پاس گئی ہوئی ہے۔''

''دی اولڈ بچ!'' مولو نے دل ہی دل میں کہا اور اس کی طرف ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ بینکویٹ ہال میں ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک ونگ سے اسے سنائی دیا۔

''جامبو، بوانا مولو۔''

اس نے دیکھا کہ کینیا کا ہائی کمشنر چند لوگوں میں سے اٹھ کر اسے سلام کہہ رہا ہے۔

''جامبو، ایکسیلینسی۔'' اسے معلوم تھا کہ افریقی اور ایشیائی ریپبلکوں کے سفیر شاہی اہتمام سے پکارے جانے پر جامے میں پھولے نہیں سماتے۔'' آؤ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھو گے، بوانا؟''

مولو نے سوچا کہ ترقی پذیر ممالک کے نوکر شاہوں کی دعوت برسرِ راہ بھی قبول نہ کی جائے تو وہ اسے اپنی توہین پر محمول کر لیتے ہیں۔'' ہاں ہاں، کیوں نہیں ایکسیلینسی؟'' وہ لڑکھڑائے بغیر اپنا آپ لڑکھڑاتے محسوس کر کے اس گروپ میں آ بیٹھا اور ایک نیگرو سٹیورڈ اس کے سامنے گلاس رکھ کر شراب انڈیلنے لگا۔ نیگرو کے جھکے ہوئے سر کے بالوں کے چھلے دیکھ کر مولو کو لگا کہ وہ اپنے کینیا کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کا کالا نوکر اس کا گلاس بھر رہا ہے۔

کینیا کی بیس بائیس سالہ زندگی بھی گروسر کے داماد نے راجہ بن کر بتائی تھی۔ ہندوستان سے وہاں آئے ابھی اسے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ چند کالوں نے اس کے اکلوتے سالے کو قتل کر دیا۔اس کا سالہ نصف شب کو کبرا دیکھ کر نشے کی حالت میں گھر لوٹ رہا تھا کہ لیٹروں نے اس کی گاڑی رکوا کر اسے ڈرائیور کی سیٹ پر ختم کر دیا اور اس کا بٹوا، گھڑی، انگوٹھی.......جو کچھ بھی ان کے ہاتھ آیا..........لے کر چمپت ہو گئے۔اس کا رنڈوا سسر بھی اپنے بیٹے کے غم میں چند ہی ماہ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ پھر جب بڈھے کے وکیل نے اسے کل جائداد کی تفصیلات سے آگاہ کیا تو اس نے اپنی زندگی کو نئے سرے سے پلان کرنے کی ٹھان لی۔اس نے اپنی اچھی خاصی سرکاری نوکری چھوڑ دی۔ بڈھا اتنا کچھ چھوڑ گیا تھا کہ وہ کام وام کے بغیر بھی ٹھاٹ سے رہ سکتا تھا۔تاہم بچے کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا ہو تو وہ کب تک کھیلنے سے ہاتھ روکے رکھے گا۔تھوڑے ہی عرصے میں اس نے گروسری سنبھال لی۔اس کے علاوہ وہ اپنے بعض پرانے انگریز افسروں کے باقاعدہ کمیشن طے کر کے کئی سرکاری اداروں کو ٹھیکے پر متفرق ضروریات سپلائی کرنے لگا جوں جوں اس کا کام بڑھتا چلا گیا وہ سارے ایسٹ افریقہ میں نئے طرز پر گروسری کی ایک لمبی طلائی زنجیر بنانے میں جٹ گیا اور اتنی دولت پیدا کر لی کہ کوئی ایک دہائی میں اس کا شمار ملک کے نصف درجن مالدار ترین اشخاص میں ہونے لگا۔

اس کے ماں باپ؟.........اب اسے اتنی فرصت کہاں رہی تھی کہ ان کی یاد میں گھلتا رہے۔ پہلے پہل تو اس نے کئی بار انہیں لکھا کہ وہ بھی اسی کے پاس آ جائیں، لیکن بوڑھا، بوڑھیا اَڑ گئے کہ وہ اس عمر میں سمندر پار اپنا مردہ کہاں خراب کریں گے، وہ یہیں اپنے سیالکوٹ کے گھر میں اس کی طرف منہ اور من کر کے ٹھنڈی ہوائیں محسوس کر لیا کریں گے۔ چنانچہ وہ دونوں اس کی ٹھنڈی ہوائیں محسوس کر کر کے سلگتے رہے اور وہ ان کے ماہانہ الاؤنس میں ان کی شفقت و دعا کے صلے کی رقم بھی جوڑ کر انہیں اس وقت تک پیسے بھیجتا رہا جب تک اسے پتہ نہ چلا کہ اس کے پیسے چند ماہ سے ان کی بجائے نہ جانے کون وصول کرتا رہا ہے۔انہیں مرے کھپے تو آدھے سال سے بھی اوپر ہو لیا تھا۔

ان کی موت کی اطلاع پا کر اس شام کو وہ اپنے بنگلے کے ٹیرس پر تنہا آ بیٹھا تھا اور جانی واکر کے پیگ پے در پے چڑھاتے ہوئے اپنے دل میں ماں باپ کی جلتی ہوئی ارتھیوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھا اور اس کا رونا نہیں نکل رہا تھا شاید اس لیے کہ وہاں کوئی نہ تھا جو اس کی ڈھارس بندھاتا...اس کی بیوی؟...نہیں وہ اس کی ڈھارس کیسے بندھاتی۔ بانجھ لجاوتی کی کوکھ میں کینسر کا ٹیومر اگ آیا تھا اور اس کے پیٹ میں چار سو پھیل رہا تھا۔اسے تو خود آپ ڈھارس کی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے مولو نے چوبیس گھنٹوں میں آٹھ آٹھ گھنٹوں کے لیے تین تربیت یافتہ نرسیں لگا رکھی تھیں۔اس کے بچے؟ نہیں، اس کے کوئی اولاد نہ تھی جس کی توتلی آنکھوں میں کھو کر اسے اپنی ٹوہ کھوہ ہونے لگتی۔

جلتی ہوئی ارتھیوں پر بدستور ٹکٹکی باندھے اس نے ایک اور پیگ ہونٹوں سے لگا لیا اور جب شراب اپنا

رستہ چیر کو اس کے معدے میں اتر رہی تھی تو چاند آسمان سے اس کے سر میں سمائے جا رہا تھا........مولو!.....جب کینیا آنے کے لیے سیالکوٹ سے اس کی گاڑی روانہ ہوئی تھی تو چاند اس کے ساتھ ساتھ دوڑے چلا آ رہا تھا ....مولو......نہ جاؤ......مولو.......!اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟......مولو.....مو.....اوشٹ اپ.......شٹ اپ.......!تھوڑے ہی فاصلے پر ٹیرس کی لفٹ کے قریب افریقی بیرے مؤدب کھڑے انتظار کر رہے تھے کہ بوانا کو با کب بے ہوش ہوا اور کب وہ اسے اسٹریچر پر ڈال کر اس کے بیڈروم میں پہنچا دیں۔

''اوشٹ اپ.....'' مولو نے نشے میں ہڑبڑا کر کہا، اور یہ دیکھ کر کہ اس سے تو کینیا کا ہائی کمشنر ہمکلام ہے اسے تاسف ہوا.......''آئی ایم ساری، ایکسلینسی میں دراصل اپنے آپ کو ڈانٹ رہا تھا۔'' مولو نے سٹیورڈ کو اشارہ کیا کہ اس کے لیے وہسکی لائے۔

''کامن ویلتھ کے ملکوں کو یہ ایک برٹش دین ہے۔'' برٹش وائس کونسل والٹس بھی وہاں موجود تھا'' کہ اپنے آپ کو ڈانٹ کر وہ اپنی اصلاح کرتے رہیں۔''

''چہ خوب'' مولو نے سارے گروپ پر نظر دوڑا کر کہا۔ یہاں تو ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں پوری کامن ویلتھ کلاس روم میں موجود ہے۔انڈیا، پاکستان، یوگنڈا، کینیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اس نے اوب کر باقیوں کی طرف دیکھنے سے روک لیا۔

''کیا وکٹوریہ راج کی برکتوں پر کوئی سبق جاری ہے مسٹر والٹس؟''

''مسٹر مولو سپیکنگ کوائٹ لائیک ہم سیلف!'' والٹس نے کہا۔''ہم سب تمہیں مس کر رہے تھے۔''

''والٹس کے لہجے میں سفید جھنڈا پا کر مولو نے اپنا انداز بھلا کر لینا چاہا۔''مسٹر والٹس آئی وش آئی ہیڈ ناٹ ری ناؤنسڈ مائی برٹش سٹی زن شپ!''

''تم اگر درخواست دینا چاہو'' برٹش وائیس کونسل نے اسے جواب دیا۔''تو ہم پھر سے تمہاری برٹش سٹی زن شپ پر غور کر سکتے ہیں۔''

''تم برٹش لوگ اتنا غور مت کیا کرو مسٹر والٹس۔'' وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لے کر مولو خود کو روک نہ پایا،

''کیا مطلب؟''

''مولو وہسکی کا گھونٹ بھرنے کے لیے ذرا رک گیا۔''اب یہی دیکھو مسٹر والٹس، تمہارے گریٹ برٹین نے کینیا کے برٹش پاسپورٹ ہولڈروں کی برٹش شہریت تو قبول کر لی مگر بڑے غور خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی برٹش شہریت کے باوجود آپ کے ملک میں رہ نہیں سکتے......''

''وطن کی محبت کا تقاضہ تو یہ تھا مسٹر مولو'' ہندوستان کا سفیر کمود پوچھنے لگا۔'' کہ تم بھارت ہی لوٹ جاتے۔آخر تم یہاں امریکہ کیوں چلے آئے؟''۔۔

''وطن کی محبت کا تقاضہ پورا کرنے، مسٹر.... مسٹر کموڈ۔'' کموڈ سے بات کرتے ہوئے مولو کو ہمیشہ کموڈ کی، ڈی پر زور ڈالنے کی ترغیب رہتی۔''میرا مطلب ہے اسی کروڑ کی آبادی میں ایک اور نفس کا اضافہ کیوں ہو؟''

''اسی کروڑ!'' نیوزی لینڈر جن استعجاب میں اپنی آواز کو پھیلاتا ہی چلا گیا۔''کیا انڈیا کی عورتیں بارہ مہینے حاملہ رہتی ہیں مسٹر کموڈ؟''

''ہاں مسٹر جن۔'' کموڈ کے بجائے مولو نے اسے جواب دیا۔

''ہندوستانی مغربیوں سے اس مانند اپنے بدلے چکاتے ہیں۔ آپ لوگ کہیں بھی مریں، وہ آپ کو اپنے ملک میں پیدا کر لیتے ہیں۔''

''ری الی'' جن گھبرا کر اپنی ساری جن ایک دم پی گیا۔''ٹیرے بل! مجھے کسی ہندوستانی گھر میں پیدا ہونا پڑے تو میں پیدائش پر ہی رو رو کر جان دے دوں گا۔''

''مگر ہم ہندوستانی ساری زندگی روتے رہتے ہیں پھر بھی ہماری جان نہیں نکلتی۔''

''مگر ہم امریکیوں کو ہندوستانیوں میں شمار نہیں کرتے مسٹر مولو'' کموڈ کو مولو پر غصہ آ گیا۔

''مسٹر کموڈ، کیا مجھے پاکستانی سمجھ کر مجھ سے ناراض ہو گئے؟''

پاکستانی سفارت کار نے کمود کے گلے میں اپنا بازو ڈال دیا۔''میری اور کمود کی دوستی پر شک کی گنجائش روا رکھ کے تم ہم دونوں سے ظلم برت رہے ہو مولو۔''

''یہی تو سارے سکینڈل کی بنا ہے علی۔''

مولو کی پاکستانی سفیر سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔

''اشخاص ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور انہی اشخاص کی سرکاریں شاید ان کی محبت کے باعث ایک دوسرے سے نفرت۔''

''بس اگر کشمیر کا مسئلہ حل ہو جائے۔'' پاکستانی سفیر نے کہا۔''تو ہمارے درمیان اور کوئی تنازعہ ہے ہی نہیں۔''

مگر کشمیر ہندوستان کا انٹی گرل پارٹ ہے۔'' کمود بولا۔

''نہیں کشمیر پاکستان کی مذہبی اور تہذیبی کل میں واقع ہے۔'' علی نے فوراً جواب دیا۔

''نہیں.......!''

''نہیں.......!''

اسی دوران یو۔ این۔ او میں آسٹریلیا کا نمائندہ سب کو بتانے لگا۔''چند سال پہلے اپنے سڈنی میں ایک کشمیری میرا شریک کار تھا اس نے ہماری آسٹریلین شہریت اختیار کر رکھی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا

کیوں مسٹر ظہیر الدین یہاں آنے سے پہلے تم کہاں تھے، ہندوستان میں یا پاکستان میں.......؟'' پتہ نہیں کہاں.......؟'' اس نے جواب دیا۔ دنگوں سے جان بچانے کے لیے نامعلوم کہاں بھاگا پھرتا تھا مسٹر ڈاونر۔ مجھے تو یہاں آسٹریلیا پہنچ کر پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ میں اپنے ہی وجود میں ہوں.......'' ہندوستان اور پاکستان کے سفارت کار ابھی تک اپنے چہروں کے یکساں خدوخال سے برآمد ہوتے ہوئے ہونٹوں کو اتنی یکساں وسعت میں کھولے ہوئے تھے گو محبّ یا محبوب ہوں۔

''نہیں.......!''

''نہیں.......!''

گریٹ برٹین کے والٹس نے نہایت سفارت کارانہ صناعی سے بات کا رخ موسم کی خرابی کی طرف موڑ دیا''یہاں کی سردی بڑی خشک ہے مگر ہمارے گریٹ برٹین کی سردی اپنے گیلے پن کے باعث ہمیں بہت عزیز ہے۔''

مولو شاید بور ہونے لگا تھا۔''کیا آپ لوگ اسی لیے نہانے سے بہت گھبراتے ہیں؟''

جب سب لوگ ہنس رہے تھے تو کینیا کا ہائی کمشنر مولو کے اور قریب سرک آیا۔''میری سمجھ میں نہیں آتا بوانا تم نے ہمارا کینیا کیوں چھوڑ دیا۔''

جواب میں مولو صرف مسکرا دیا۔

کینیا کی آزادی سے چند سال پہلے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حالات کیسا پلٹا کھانے والے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی گروسری کی طلائی زنجیر کاٹنا اور جائداد بیچنا اور دھیرے دھیرے اپنا سارا پیسہ امریکہ بھیجنا شروع کر دیا تھا حتی کہ آزادی کے آس پاس وہاں اس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں ڈالر جمع ہو گئے۔ جب اس نے امریکہ روانہ ہونے کا طے کر لیا تو آزاد کینیا کی لیجس لیٹو کونسل کے ایک افریقی رکن نے اس سے پوچھا''جب ہندوستان کو آزادی ملی تو تم یہاں بھاگ آئے اور ہمیں ملی ہے تو تم امریکہ بھاگ رہے ہو۔ کیا تم وہاں نہیں رہ سکتے جہاں آقائیت کے اسباب نہ رہیں؟''

''شاید تم پوچھنا چاہ رہے ہو بوانا، میں وہاں کیوں نہیں رہتا جہاں آقائیت کے اسباب پیچیدہ ہونے لگتے ہیں۔'' مولو نے اسے ہنس کر جواب دیا اور سوچنے لگا میں اسے کیا بتاؤں؟ اس لیے کہ پناہ گاہیں بدلے بغیر میری نجی آقائیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جسے میں نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا ہے۔

''بوانا موانگی۔'' تھوڑے توقف کے بعد اس نے آزاد کینیا کی پارلیمنٹ کے رکن کو دوبارہ مخاطب کر کے کہا۔''جس اکثریت کی سرکار کو تم بذریعہ اور برائے اکثریت قرار دے کر خوش رہتے ہو ذرا اس کا چیر پھاڑ تو کر کے دیکھو۔ جمہوری انتخاب میں ڈھول بجانے والوں کو نہ گنیں تو انتخاب کرنے والے بھی وہی ہوتے ہیں اور منتخب بھی وہی۔''

''مگر بوانا۔''

''نہیں، بوانا، تمہاری سواحلی میں ایک کہاوت ہے: ''لومڑ اپنی چار ٹانگوں پر اس لیے سیدھا نظر آتا ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی اس لیے لومڑ کا دوسرا نام جمہوریت ہے۔''

''لومڑ دومڑ کو خارج کر کے سیدھی بات کرو۔''

''سیدھی بات یہ ہے کہ جمہوریت میں بھی سارے لوگ چند ایک کی حکمرانی میں ہی بسر کرتے ہیں۔''

''مجھے یقین ہے بوانا امریکی تمہاری یہ نان سنس پسند نہیں کریں گے۔''

''اور مجھے یقین ہے بوانا موانگی، اٹ شوڈ میک پرفیکٹ سینس ٹو دا امیریکنز ....خیر۔'' گروسری کے دھندے نے مولو کو باتوں کا اتنا دھنی بنا دیا تھا کہ وہ تسلسل توڑے بغیر بات سے بات پیدا کر لیتا۔''جمہوریت کا یہ غیر اخلاقی پہلو بھی دیکھ لو۔ یہاں بھی پہلا درس یہی ہے کہ آدرش جمہور یہ اقلیت کو ٹالنے کا مجاز نہیں۔ ہہ ہاہہ ....! جیسے بھی کہہ لو، کلیدی لفظ وہی ہے۔ واحد ...فرد واحد ......! سو جمہوریت کی تعریف یوں ہونی چاہیے ......'' مولو اپنے لفظوں کو ترتیب میں بٹھانے کے لیے ذرا رک گیا۔''سرکار بہ رشتہ اقلیت برائے اقلیت ....اینڈ آف کورس.......بذریعہ اقلیت.........بولو، ہے نا بوانا؟''

کینیا کی آزادی کے چند ماہ بعد مولو وہیں رکا رہا، کہ اس کی بیوی کے دم کا بھروسہ نہ تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا کہ کیا مرسی کلنگ مناسب نہ رہے گا مگر اس اثنا میں خدا نے آپ ہی اپنی مرسی کے دروازے کھول دیے۔ مولو نے پوری ہندو رسومات کے ساتھ مرحومہ کے دھوئیں کو بیکنٹھ کی طرف اڑانے کا اہتمام کیا اور خود آپ کینیا کی آزادی کا پہلا جشن خوب دھوم دھام سے منا کر امریکہ اڑ آنے کے لیے ہوائی جہاز میں آ بیٹھا۔ راستے میں چاند اس کے جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا......مولو....مولو.....! شاید وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور ......اور....

وہ سیالکوٹ میں اپنے ماں باپ کے کچے آنگن میں چاندنی میں اپنے سائے سے کھیل رہا ہے ....مولو........اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی ہے........اب اندر آ کے سو جاؤ بیٹا!......نہیں ماں مجھے نیند نہیں آ رہی......مولو......! اس کے باپ نے اسے ڈانٹ کر بلایا ہے.....چلو اندر آؤ......آیا، بابا........!

مولو ہڑ بڑا کر اپنی ہوائی جہاز کی سیٹ میں جاگ پڑا۔ مولو.......! دوڑتے دوڑتے چاند کی سانس بھول گئی تھی مگر وہ ابھی تک ویسے ہی اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا......مولو.......! یہاں سے بھی آگے جا رہے ہو مولو؟ وہاں تمہارا کون ہے.......؟ آؤ مولو، میں تمہیں بابا اور ماں کے پاس لے چلتا ہوں.........آؤ.........! مولو کی آنکھیں پھر مندنے لگیں۔

سو جاؤ مولو۔ بہت کھیل لیے ہو.......آؤ آ کے سو جاؤ....مولو.......آیا ماں.....وہ اپنے پہلے گھر کے

کچے آنگن سے کوٹھری میں داخل ہو رہا ہے اور چاندنی دبے پاؤں اس کے پیچھے چلی آ رہی ہے اور چند قدم میں ہی اس کے آگے ہو کے اس کی چارپائی پر اچھل آئی ہے اور وہ اسے یہاں بھی پا کر کھل کھلا کر ہنسے جا رہا ہے.......سو جاؤ بیٹے، سویرے اسکول جانا ہے....... ہاں بابا......چادر میں چاندنی کو بھی لیے مولو نے سات بار اوم کا جاپ کرنے کے لیے منہ کھولا ہے مگر چھٹی بار نیند ہی نیند میں ایک اور نیند میں اتر آیا.......ماں.......ماں........ماں اور بابا کہاں کھو گئے؟.......وہ انہیں بابے بیری کے میلے میں ڈھونڈ رہا ہے........ماں..........مولو بے اختیار رونے لگا ہے اور سارے میلے میں رو رو کر گھومتے ہوئے دونوں نیندوں کی سرحدوں سے باہر نکل آیا ہے۔

آنکھ کھلنے پر بھی وہ اپنے معصوم گریہ سے کان نہیں ہٹا پایا۔

اور.........مگر کینیا کا سفیر اسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔''اگلے ویک اینڈ کو میرا کینیا جانے کا پروگرام تھا بوانا مولو مگر میں نے اپنی روانگی صرف اس لیے ملتوی کر دی ہے کہ تمہارے گریٹ گبنز مرحوم کی برتھ اینی ورسری کا گریٹ ڈنر بھی اسی دن ہے۔''

''اٹ از آ ور گریٹ پریولج۔''

مولو گریٹ گبنز مرحوم کا پروٹیجی بھی تھا اور اس کی زندگی میں اس کے ''آل ورلڈ'' کا پارٹنر بھی۔ گریٹ گبنز کی بیوی یہاں امریکہ آنے سے پیشر وہاں کینیا میں ہی ایک جرمن وائٹ ہائی لینڈر کی بیوی تھی اور وہاں مولو سے بھی اس کا افیر چلتا رہا تھا۔ اس کے ذریعے مولو کا گبنز سے رابطہ پیدا ہوا تھا، جس کے بعد دو ایک سال میں ہی وہ اتنے قریب آ گئے کہ گبنز نے اسے اپنی صحافتی سلطنت میں برابر کا حصہ دار بنا لیا تھا۔ گبنز کو شراب کی اتنی لت تھی کہ پیئے بغیر ہوش میں نہ آتا تھا اور ڈاکٹروں کی باتوں میں آ کے کبھی پینے سے ہاتھ کھینچ لیتا تو بیٹھے بیٹھے بھی لڑکھڑا جاتا۔ اپنی بیوی کے مانند اسے بھی مولو سے عشق تھا، شاید اس لیے کہ اس کی ماں بھی ہندوستانی تھی......نہیں........وہ فوراً اپنے آپ کو درست کر کے مولو کو بتانے لگا......دراصل میرا باپ ہندوستانی تھا۔ میرا مطلب ہے کہ میری ماں ہی میرا باپ تھی، کیوں کہ اس نے اپنی نہایت کڑی نگہداشت میں مجھے اونچا کیا........گبنز ہنسنے لگتا.....میرے بگڑنے کا یہی سبب ہے کہ میری ماں مجھے لمحہ بھر بھی اپنے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ جب وہ مر گئی تو خود کو اس کی نظر سے بندھا ہوا نہ پا کر میں بے روک ٹوک اپنے موجودہ جہنم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''تمہارا باپ..''

''میرے امریکی باپ کو پیسہ کمانے سے فرصت ہی کہاں تھی؟ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ میں اس کا بیٹا ہوں یا اس کے پڑوسی کا........اسے چھوڑو مولو، تم مجھے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بتاؤ........نہیں، میری شراب میں پانی مت ملاؤ۔'' گبنز اسے ٹوکتا ''مولو ہندوستانی ماؤں کے بارے میں میری لاعلمی مضحکہ خیز ہے۔ تم اپنی ماں کا کچھ ایسا خاکہ کھینچو کہ میں بھی اپنی ماں کو جاننے پہچاننے لگوں۔''

گبنز اس لیے پیتا تھا کہ ہوش میں رہے، اور مولو اس لیے کہ ہوش کھو بیٹھے، کئی بار ایسا ہوا کہ شراب پی کر مولو خواہ آسمان کی طرف دیکھتا خواہ اپنے ذہن میں، دھند ہی دھند میں کہیں سے وہی چاند نمودار ہوتا......آؤ گے نہیں مولو.........؟ آؤ، ماں تمہاری راہ تک رہی ہے۔

''تم کہاں چلے گئے تھے مولو؟'' گبنز کی بیوی نے ایک دن اس سے کہا تھا ''میں پچھلے دس دن سے تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوں۔''

مگر نشے میں ہوش کھو کر وہ مولو کو اپنی ماں ہی معلوم ہو رہی تھی اور اس کی گود میں سر رکھ کر اس کا رونا تھمنے میں نہیں آ رہا تھا اور گبنز کی بیوی نے جلدی جلدی اس کے اور اپنے کپڑے اتار کر اسے اپنے ساتھ رضائی کی حدت میں لٹا لیتی تھی اور اس سے والہانہ پیار کرنے لگتی تھی، مگر مولو سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے خواب میں ڈوبا جا رہا تھا۔

''مولو تمہارے گریٹ گبنز کی دلچسپ گفتگو کی گونج ابھی تک ویسے ہی کانوں میں محسوس ہوتی ہے۔'' نیوزی لینڈر، جو یہاں ایک مدت سے رہ رہا تھا، مولو کو مخاطب کر کے اس کی توجہ طلب کر رہا تھا۔

''اسی لیے ہمارے ''آل ورلڈ'' نے اس ڈنر میں ایک ایکٹر کی خدمات حاصل کی ہیں۔' مولو نے اسے بتایا۔'' اس ایکٹر کی باتیں سن کر یہی لگتا ہے کہ گبنز ہی راکٹ میں سوار ہو کر جہنم سے آ پہنچا ہے۔''

''کیا امریکی سرکار نے اپنی اسپیس ٹیکنالوجی شیطان کو بھی بیچ دی ہے۔'' پاکستانی سفارت کار سے نہ رہا گیا۔

''میں تو رائے دوں گا کہ جسے بھی ہماری اسپیس ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہے وہ شیطان سے غیر مشروط راہ و ربط پیدا کرے۔''

''نعوذ باللہ!.....'' عرب ریپبلک کے نمائندے نے بے اختیار بہ آواز بلند کہا جسے سن کر مولو کو اچانک گھر لوٹنے کی خواہش ہونے لگی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''چیئریو، ایوری باڈی!''

چند ہی قدم پر ہال کے بیرونی دروازے پر میزبان اور اس کی بیوی جانے والوں کو شب بخیر کہنے کے لیے کھڑے تھے۔

''میں تم سے بہت خفا ہوں مولو۔'' پچھلے ماہ مولو نے اپنے آل ورلڈ'' میں پورے نصف صفحے پر ہوسٹس ڈالی کی تصویر شائع کی تھی جس باعث وہ اس پر خاص مہربان تھی اور اس سے بڑی بے تکلفی سے پیش آنے لگی تھی۔

''ڈالی ڈیئر، کل تک بھی اسی طرح ناراض رہنا۔''

''کیوں؟''

''اس وقت میں نشے میں ہوں۔'' مولو نے اسے جواب دیا۔'' اس وقت کیسے بتا سکتا ہوں کہ خفا ہو کر

تم واقعی زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہو۔''

''ہاؤ ناٹی''

''ٹا.....ٹا''!

مولو آگے بڑھنے لگا تو اس کی چال ڈھال دیکھ کر ڈالی کا شوہر بولا۔ ٹھہرو مولو۔ نشے میں ہو تو ایک ٹاٹ اور چڑھا جاؤ۔'' وہ شاید ''آل ورلڈ'' میں اپنے سن ڈاؤنر کے رائٹ اپ سے متعلق سوچ رہا تھا۔۔۔'' ہوش آجائے گا۔''

''ہوش آجائے گا مائی ڈیر ڈالی، تو کونسا خدا نظر آنے لگے گا۔'' مولو آگے بڑھنے لگا تو ڈالی کے اشارے پر ایک سٹیورڈ اس کے ساتھ ہولیا اور وہ گویا اسی کے پیروں پر چل کر اپنی کار کے پاس آ کھڑا ہوا۔

مولو کو گاڑی چلانے کا ہوش ہی کہاں تھا؟ بس یہی سمجھ لیں کہ اس کی گاڑی آپ ہی آپ چلتی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی کی گاڑی بھی یونہی چلتی آئی، اس لیے تو وہ سیالکوٹ کے چاؤناں محلے سے یہاں نیویارک آ پہنچا، ورنہ اپنی مرضی سے اسے کہیں سے کہیں پہنچنا ہوتا تو محلّہ چاؤناں سے محلّہ ڈھاروال سے آگے قدم نہ رکھتا ڈھاروال میں کیا نام تھا اس کا؟..........جبیں رہا کرتی تھی، ستارہ جبیں مولو کی پہلی محبوبہ تھی اور وہ اسے ابھی تک اس لیے نہیں بھول پایا تھا۔۔۔شاید اس لیے کہ اسے اس کا نام بہت پسند تھا، یا شاید چہرہ.........مولو کو اچانک ستارہ جبیں کا خیال آ گیا تھا اور وہ اس کا چہرہ آنکھوں میں لانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایک اس چہرے کے سوا دنیا بھر کی عورتوں کے چہرے یکے بعد دیگرے اس کے سامنے آ رہے تھے۔ نہیں، وہ اس کی شکل بھولا تو نہیں تھا مگر........اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ مگر پتہ نہیں اس کی کیا شکل تھی۔ بڑی بھلی شکل تھی، اتنی بھلی کہ اس نے جبیں کو بے جھجک بتا دیا تھا، تم میرا آدرش ہو، میرا سب کچھ........نہیں جی ہی جی میں بتایا تھا، سچ مچ تو اس نے اپنی ستارہ جبیں سے بات بھی نہ کی تھی۔ اسے تو شاید معلوم ہی نہ تھا کہ مولو اس سے محبت کرتا ہے۔ مولو نے اپنی محبت کو اپنی ذات کا ایک نہایت مقدس راز سمجھ کر سینے سے لگائے رکھا۔ مولو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مقدس راز!......عمر گنوا کر کھلا تو یہ تھا کہ محبت ایک پبلک افیئر ہے۔ جس سے بھی چاہو محبت کرو مگر اس کی اور اپنی سہولت کے مطابق کرو، اور چاہنے والے بہت زیادہ ہوں تو صبر سے کام لے کے اپنی باری پر کرلو.........اور کیا؟ مولو پر جو ہنسی کا دورہ پڑا تو اس کی گاڑی ذرا غلط پہلو کی طرف کھینچ آئی اور مخالف سمت سے اک برق رفتار کار کے ڈرائیور نے اپنے پھیپھڑوں سے آواز بلند کی۔'' بلڈی فول'' مگر مولو کو اپنی ترنگ میں جو خواہش اٹھی تو اس نے یہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ آئی ایم اے بلڈی فول، آئی ایم......اے بلڈی فول......وہ اپنے سامنے سڑک پر نگاہ جمائے نامعلوم کہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کی گاڑی از خود اُڑی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر وہ گویا اسٹیئرنگ، تھراٹل یا سوئچ بورڈ کے مانند گاڑی کا ہی کوئی حصہ بن جاتا، گاڑی ہی بن جاتا، اور اس پر بھی اپنے آپ کو سوچتے ہوئے پا کر اسے تعجب ہونے لگتا کہ گاڑیاں کیوں کر سوچ سکتی ہیں۔ چند ہی روز پہلے اس نے اپنے ''آل ورلڈ'' میں ہیومن آٹو موبیلز کے موضوع پر ایک مڈل میں اپنے

قارئین کو یہ واقعہ سنایا تھا، پرسوں میں اپنی کار میں ڈیوک آف ایڈنبرا کی آمد پر اس سے انٹرویو کرنے برٹش ایمبیسی جا رہا تھا۔ ایمبیسی سے تھوڑی ہی دور میری کار اچانک پنکچر ہوگئی۔ ڈیوک آف ایڈنبرا سے میری اپوائنٹمنٹ کا وقت گزرا جا رہا تھا اور مجھے گاڑی کا پہیہ تبدیل کرنے کے خیال سے الجھن ہو رہی تھی۔ پانچ سات منٹ گومگو میں ہی گزر گئے اور پھر مجھے ایک دم جیسے اپنی مشکل کا یہ حل سوجھا........ارے........دوسو گز کا فاصلہ ہی تو ہے۔ پیدل ہی کیوں نہ چلا جائے......ارے......ہاں......اس انکشاف پر خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، میں بھول ہی گیا تھا میرے ٹانگیں بھی ہیں.......آئی ایم اے بلڈی فول!

مُڈل یاد آنے پر مولو گویا اپنے سامنے آل ورلڈ کھولے ڈیوک آف ایڈنبرا سے اپنا انٹرویو پڑھنے لگا تھا۔

مجھے زردرُو پا کر ڈیوک آف ایڈنبرا کو شاید خیال گزرا کہ آل ورلڈ نے اپنے جونیئر اسٹاف میں سے کسی کو بھیج دیا ہے۔ پھر بھی اس نے جیسا کہ اس کے تعلق سے مشہور ہے......خوش دلی سے کہا ہیلو! کیا نام ہے تمہارا؟

''یوئر رائل ہائی نیس'' میں تو سوچ کر ہی آیا تھا کہ مجھے اسی طرح انٹرویو کو شروع کرنا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ مجھے ڈیوک آف ایڈنبرا کہا کرتے تھے۔''

''مائی!'' مجھے معلوم تھا کہ ڈیوک آف ایڈنبرا کی مزاح کی رگ اگر پھڑک اٹھے تو وہ اپنی لاگت پر بھی بولنے سے نہیں چوکتا۔ ''کیا تمہاری بیوی بھی کہیں کوئی ملکہ ہے؟''

''ہاں یوئر رائل ہائی نیس۔ آپ کے یہاں تو گروسر کی بیٹی کو پرائم منسٹر کے آفس تک ہی روک دیا جاتا ہے مگر ہمارے یہاں ایسٹ افریقہ میں ہندوستانی گروسروں کی بیٹیاں ملکائیں قرار دی جاتی تھیں اور ہم ہندوستانی درآمد شدہ بھونندو شوہر، آپ کے مانند ڈیوک۔''

ڈیوک آف ایڈنبرا کسی اسکول بوائے کی معصومیت سے ہنسنے لگا تھا۔ ''تو آؤ اپنی اس کامن پرابلم سے ہی انٹرویو کا آغاز کریں۔''

''یوئر رائل ہائی نیس، اگر اپنی بیوی کی بجائے آپ حکمران ہوتے تو........'' میرا پورا جملہ ادا ہونے سے پہلے ہی ڈیوک نے جواب دیا۔ ''تو میں اپنی ساری بے چارگی اور ڈیوک آف ایڈنبرا کا لقب فوری طور پر کوئین کو سونپ دیتا۔''

قہقہہ لگاتے ہوئے مولو کو محسوس ہوا کہ اس کی گاڑی کے پہیئے ٹیڑھے میڑھے پتھروں پر اچھلنے لگے ہیں۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ اگر میں اپنی بیوی کے علاج میں اپنی دعائیں بھی شامل کر لیتا تو شاید.........مگر وہ اپنے آپ کو بتانے لگا کہ کسی نے بھلا شیطان کو بھی دعائیں مانگتے دیکھا ہے۔ شیطان کی شہزادگی تو خدا کا مذاق اڑانے کے دم سے ہے۔ دعا کی صلاحیت کھو کر ہی تو وہ اتنے بڑے امریکی فورتھ اسٹیٹ کو اپنی ملکیت میں لا پایا ہے۔ مسٹر پریزیڈنٹ......اس نے ایک دفعہ اپنے ایڈیٹوریل میں یو۔ ایس۔ اے کے صدر کو راست مخاطب کر کے متنبہ کیا تھا۔ یہ کیا تک ہوئی کہ جہاں تمہاری منطق جواب دے جاتی ہے وہاں تم کانگریس کو خدا کا واسطہ دینے لگتے ہو۔ مولو اپنے واقف کاروں کو بتایا کرتا کہ مجھے جب بے منطق نیکیوں کی تحریک ہوتی ہے تو خواہ مخواہ خدا کو ڈسٹرب کرنے کی

بجائے میں خوب شراب چڑھا کر اپنی گاڑی بے تحاشہ جنگلوں کی طرف ہو لیتا ہوں اور وہاں کسی ٹری ٹاپ ہالی ڈے ان کے محفوظ چبوتروں سے اس وقت تک چوپاؤں کی زندگی کے فطری اسباب کا مطالعہ کرتا ہوں جب تک میری سمجھ میں پوری طرح نہ آ جائے کہ سب سے بڑی نیکی کیوں کر وہی ایک ہے جو ہر ذی جاں اپنے ساتھ برت پاتا ہے، اور نہ برت پائے تو کوئی اور اسی کی نیکی کو برت کر اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ ''تم نیک انسان نہیں۔'' اس کی کینیا کی ہندوستانی بیوی اس سے لڑتے ہوئے اکثر کہا کرتی۔ ''جب تم مجھے اپنی باہوں میں لیتے ہو تو میری کوکھ سکڑ کر بند ہو جاتی ہے اور میں تمہاری چوٹیں برداشت کیے جاتی ہوں اور بس..........''

''سن اے بچ........'' مولو اپنی بیوی کو کوس رہا تھا شاید اس کی گاڑی کے پہیوں تلے رات کا کوئی جانور آ گیا مگر نشے میں کسی کی چیخیں کہاں سنائی دیتی ہیں۔ ساری زندگی مجھ سے نفرت کرنے کے باوجود شکایت کرتی رہی کہ میں اس سے محبت نہیں کرتا۔

''تو کیا کرتا ہوں؟''

''دھندا.......!''

مولو کی موجودہ سفید بیوی بھی اس سے یہی کہا کرتی.......''ڈارلنگ، جب تم میرے بدن پر اچھل کود میں مصروف ہوتے ہو تو مجھے لگتا ہے تمہارے کسی بیوٹی فل لٹل ایڈیٹوریل سے لطف اندوز ہو رہی ہوں اور بس۔''

''سن اے بچ.........'' اس نے اپنی اس بیوی کو بھی گالی بکی۔ ''میرے بے مہر مباشرت کے باعث میرے بچے میرے خون میں ہی بوڑھے ہو کر رہ گئے ہیں اور میں انہی کا بلغم تھوکتا رہتا ہوں''......اس نے شکر ادا کیا کہ اس کی اولاد پیدا ہونے سے رہ گئی ورنہ پیدا ہوتے ہی کھانس کھانس کر اس سے مخاطب ہو کر کہتی۔ ڈیڈ فرماں بردار اپنی اولاد کے احکام کو تولتے نہیں، انہیں بجا لاتے ہیں۔ ہہ ہہ ہا...... ہہ ہا مولو کی ہنسی روکے نہ رک رہی تھی، شاید وہ اپنے خون میں کھانستی اولاد کے کھوسٹ رویوں پر ہنسے جا رہا تھا یا شاید یو این او کے ڈپٹی سکریٹری کے سن ڈاؤنر میں اس بوڑھے ایشیائی پروفیسر رادھا سوامی پر، جس کی باتوں میں گھر کر تین چار حسیناؤں کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ فرار کی کیا صورت کریں۔ لڑکیوں کی بے چارگی کے منظر سے محظوظ ہو کر مولو بھی پروفیسر کے گھیرے میں جا داخل ہوا تھا۔

''بھوک خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے خوب صورت لڑکیو۔'' ایشیائی پروفیسر کی نظر امریکی لڑکوں کو چاٹ چاٹ کر کھا رہی تھی۔

''تمہارے امریکہ کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا رجھا پن ہے۔ اسے بھوک ہی نہیں لگتی، مگر کوئی کھائے نہیں تو جیئے گا کیسے؟ لہٰذا امریکہ موت کے خوف سے بے بھوک کھاتا رہتا ہے۔''

''میں آپ کے کھانے کیلئے کچھ لاتی ہوں۔''

''نہیں'' پروفیسر نے بولنے والی لڑکی کے کندھے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ''پہلے میں تمہیں ایک مہاراجہ کی کہانی سناتا ہوں۔ اس کہانی سے میری ساری بات واضح ہو جائیگی۔''

اس دم بوڑھے پروفیسر کی نوجوان بیوی بھی اسے ڈھونڈتی ہوئی آ پہنچی اوراس کا آخری جملہ سن کر بولی ''تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کررہی ہو لڑکیو۔ میرا شوہر اپنی بات کو کبھی واضح نہیں کر پائے گا۔ اسے سن کر مجھے تو وہ کچھ بھی غیر واضح معلوم ہونے لگتا ہے جو پہلے عین واضح تھا۔''

''کیا واضح تھا؟'' فلسفے کا پروفیسر اپنی بیوی سے پوچھنے لگا جو ماحولیاتی آلودگی کے انسداد پر تحقیق کے کام پر مامور تھی.......''پولیوشن؟''

''ہائی، مولو''، مسز رادھا سوامی مولو کو بھی وہیں پا کر کھل اٹھی۔ ''مائی ڈیئر ہزبینڈ کو سمجھاؤ مولو کہ پولیوشن صرف دھوئیں اور گیس سے نہیں ہوتی، باتونی لوگوں کے شور سے بھی پولیوشن بڑھ رہی ہے۔''

''میں نے سنا ہے لاجی۔'' مولو نے مسز رادھا سوامی کو جواب دیا ''کہ آدمی کے بڑے خیال بھی سانس کے راستے ماحول میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔'' لاجی نے اس کی طرف دیکھ کر کرشن کی گوپی سی بنی اپنی ساؤتھ انڈین پتلی کمر یا کو بل دیا، گویا کہنے کے لیے، کچھ برا بھلا سوچو تو جانوں بھی مولو نہیں تو کیا پتہ کیا ہے؟ ''کیا یہ سچ ہے؟'' حسیناؤں میں سے ایک نے سوال کیا۔'' کہ ہماری پولیوشن سے ہماری دنیا گرین ہاؤس میں منتقل ہوتی جارہی ہے؟''

''گرین ہاؤس کی چھت موٹی ہوتی چلی گئی تو ہمارا گلوب جہنم بن جائے گا۔''

''مولو۔'' مانو اچانک یاد آنے پر مسز رادھا سوامی رک نہ سکی۔ ''میں نے آج تمہارے ''آل ورلڈ'' میں پڑھا ہے کہ چاند کے پہلے ٹرپ کے لیے دھڑا دھڑ بکنگ کی جارہی ہے۔''

مولو......مو.........لو.........مولو کی گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی کہ اسے یک بیک چاند کی مانوس آواز سنائی دی جو آسمان سے اتر کر اس کی متصل نشست کی کھڑکی پر آبیٹھا تھا۔ چلو، مولو، میں تمہیں لینے آیا ہوں ....کہاں کیا؟ آؤ......مولو!

مولو نے سوچ رکھا تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے وہ وہسکی نہیں پیئے گا مگر اپنی خواہش سے مغلوب ہو کر اس نے ڈرائیور کی سیٹ کے پہلو کے ایک تھیلے سے وہسکی کی بوتل نکالی اور ابھی اسے کھول کر منہ سے بھی نہ لگا پایا تھا کہ اس کی گاڑی سڑک کے کنارے اس موڑ پر نیچے وادی میں لڑھک گئی۔

مولو بچ گیا تھا۔

اسے اسپتال میں داخل ہوئے کوئی ہفتہ بھر ہو لیا تو ایک صبح ڈاکٹر نے اس کے زخموں کے معائنے کے بعد تشفی میں سر ہلایا اور اسے بتانے لگا ''جب تمہیں یہاں لایا گیا تھا مسٹر مولو تو ہم دو ڈاکٹروں کی رائے میں تمہاری مکمل موت واقع ہو چکی تھی، مگر پھر کیا ہوا، کہ تم نے یکلخت آنکھیں کھول لیں۔''

''میں آنکھیں کیسے نہ کھولتا ڈاکٹر........؟'' مولو اسے بتانے لگا۔ ''میری روح واقعی اڑان بھر چکی تھی ،مگر کہاں جاتی؟ ذرا سی اوپر گئی تو گرین ہاؤس کی چھت کے نیچے ہی پھڑ پھڑا کر رہ گئی، اور نجات کی کوئی راہ نہ پا کر اپنا جہنم جینے کے لئے لوٹ آئی۔''

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

ایفل ٹاور

میری عمر انتیس برس کی ہے۔ پانچ برسوں سے میں اسی موسم میں یعنی ماہ جنوری کے دوسرے ویکینڈ میں برف سے کچھ نہ کچھ بڑا اور قابلِ دید بنا رہا ہوں۔ اس برس کی خاص بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ نہیں ہے۔ اس کی کمی کو میرے والد اپنی مرضی اور خوشی سے پوری کررہے ہیں۔ ہر سال برف سے ہم جو بھی بناتے ہیں دنیا اس کی تعریف کرتی ہے لیکن موم مسکرا کر یہی کہتی ہے ''وقت کا ضیاع اور کچھ نہیں'' یہ کہ کر وہ میرے کندھے پر ایک تھپکی دیتی ہے تا کہ میں زیادہ بددل نہ ہو جاؤں۔ پچھلے سال چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر میں نے ایک قلعہ بنایا تھا ۔ برف کا بڑا سا آنکھوں میں کھب جانے والا قلعہ۔ وہ کوئی عام سا قلعہ نہیں تھا۔ پہلی نظر میں کسی جن کی کھوپڑی لگتا جس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سوراخ تھے، دوسری نظر میں وہ قلعہ دکھائی دینے لگتا۔ یہ فریبِ نظر قلعے کے پگھل جانے کے بعد بھی دنوں تک لوگوں کا موضوعِ گفتگو بنا رہا۔ میڈیا نے بھی اس کی مناسب تشہیر کی ۔اس سے قبل ہم دونوں بھائیوں نے اسنو مین بنائے تھے، دیو قامت اسنو مین— ہم بھائی جو بھی بناتے دیو قامت بناتے ۔ برف سے چھوٹی موٹی چیزیں تو بچّے بھی بنا لیتے ۔ برف کی تعمیرات میں شکل وصورت کے ساتھ ساتھ قد وقامت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ہماری کوشش کامیاب گئی تھی۔

لوگ ہر سال ہمارے ہنر، فنکاری اور محنت کی داد دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ جب والد صاحب نے اس سال کے لئے پیرس کے ایفل ٹاور کا انتخاب کیا تو میں کچھ دیر کے لئے گنگ رہ گیا تھا۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں نے ایفل ٹاور دیکھا ہی نہیں تھا۔ جب میں نے اس موضوع پر والد صاحب سے بات کی تو ان کا ردِّ عمل مجھے عجیب سا لگا ۔انہوں نے کہا:

''تم نے ایفل ٹاور نہیں دیکھا تو اس کا مطلب تم پیرس ہی نہیں گئے''

''یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں''

''تم آرکیٹیکٹ ہو، ہر آرکیٹیکٹ، آرٹسٹ کو زندگی میں ایک مرتبہ پیرس جانا ہی جانا ہے''

''لیکن ڈیڈ میں تو ابھی تک نہیں گیا— اور''

''اور— کیا— تو پھر کب جا رہے ہو۔میرے خیال میں تم آج ہی نکل چلو پیرس یاترا پر''

''پیرس پلگریمیج—اب آپ آگے بڑھ کر اس کو ہولی پلگریمیج نہ کہہ دیں (زیارتِ مقدّسہ)۔'' یہ کہہ کر میں ہنس پڑا لیکن جب ڈیڈ کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ جذباتی ہو رہے تھے۔بھنویں متحرّک اور آنکھوں کی پتلیاں رقصاں تھیں ،گال اوپر کو اٹھ آئے تھے، ناک ابھرے ہوئے گالوں میں دب کر رہ گئی تھی، ہونٹ اپنے کناروں کو اونچا اٹھا کر قوس سی بنا رہے تھے۔ٹھوڑی کی حسین گولائی اور زیادہ حسین ہو گئی تھی۔اس سے پہلے مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میرے ڈیڈ ایک حسین شخص ہیں— قطعی طور پر ہینڈسم شخص! ایک اور بات جس کو میں نظر انداز نہ کر سکا تھا کہ وہ پیرس کے عاشقوں میں سے تھے۔اس وقت میری سمجھ میں یہ نکتہ آیا کہ ہمارے لونگ روم اور ڈیڈ کی اسٹڈی میں ایفل ٹاور کے چھوٹے بڑے مجسمے کیوں بھرے پڑے ہیں۔سوچ کی اسی موج کے نیچے میرے فیصلے کی ایک زیریں لہر بھی سر اٹھا چکی تھی۔

''ڈیڈ— آپ فکر نہ کریں— میں پیرس گیا یا نہیں گیا میں نے ایفل ٹاور دیکھا یا نہیں دیکھا لیکن اس مرتبہ ہم برف کا ایفل ٹاور بنا کر رہیں گے۔'' میں نے ایک ایک حرف پر زور دے کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

''سوچ لو اس میں بڑی مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' والد مجھ پر ترس کھانے کے موڈ میں آ گئے تھے مگر میں اپنے فیصلے پر اٹل تھا—

'' آپ ہیں نا میرے ساتھ — پھر کیا پریشانی ہے۔آپ تو پیرس جا چکے ہیں— آپ نے تو ایفل ٹاور دیکھا ہے۔میں نے ان کو یاد دلایا۔''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پیرس جا چکا ہوں— سچ تو یہ ہے کہ میں پیرس جا کر آیا ہی کب ہوں— ؟ میں تو اس وقت بھی پیرس میں ہوں۔تم نے کسی گم نام شاعر کا وہ مشہور گیت نہیں سنا— ؟

''پیرس میرے اندر ہے پیرس میرے اندر ہے
اے البیلی دوشیزہ تو اور تیری یہ دنیا
تیرا جیسس، تیرا کلیسا ہے تو لیکن باہر ہے
پیرس میرے اندر ہے پیرس میرے اندر ہے''

والد نے یہ اشعار اتنے لہک لہک کر سنائے کہ تھوڑی دیر کے لئے میں ان کی شخصیت کے اندر اتر گیا۔ایک ایسی شخصیت جس سے شاید میں پہلی مرتبہ متعارف ہو رہا تھا۔میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے والد کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ان میں تارے چمک رہے تھے۔اس ساری رات میں نے ہوم ورک کرتے گزار دی۔ پروجیکٹ سے واقف ہوا۔کاغذی تیّاریاں مکمل کیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اس عام تعلیم کے زمانے میں میری جہالت کا یہ عالم تھا کہ میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ پیرس میں انقلابِ فرانس کی صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں جو بین الاقوامی نمائش ۱۸۸۹ میں منعقد کی گئی تھی اسکی یادگار کے طور پر ایفل ٹاور تعمیر کیا گیا تھا۔اس سلسلے میں سات سو نقشے پیش کئے گئے تھے۔

منصفین نے گستاؤ ایفل کے نقشے کو متفقہ طور پر کامیاب قرار دیا تھا۔اگرچہ اس کے خلاف ۱۳۰۰ اپیلیں دائر کی گئی تھیں۔جن میں بعض اپیل کنندگان دنیائے آرکیٹکچر اور آرٹ کے عظیم نام تھے۔رات بھر کی محنت سے میں ایفل ٹاور سے سر سے پیر تک واقف ہو گیا تھا۔مجھے تو برف کی مدد سے صرف اس کی شبیہ کھڑی کرنی تھی لیکن میں یہ تک جان گیا تھا کہ ایفل ٹاور میں کونسا لوہا یا فولاد اور کتنی مقدار میں استعمال ہوا تھا، اسکو اسٹرکچرل انجینئرنگ کے کن بنیادی اصولوں کے تحت ڈھالا، جوڑا اور کھڑا کیا گیا تھا۔اس پر ۱۸۸۷ میں کام شروع کیا گیا اور مقررہ وقت یعنی ۱۸۸۹ میں مکمل کر دیا گیا تھا۔نقّادوں نے اسے وکٹورین اسٹرکچرل ایکسپریشنسٹ کے تحت رکھا۔جہاں تک اسکی اونچائی کا تعلق ہے یہ ۱۶۵۲ قدمچوں پر مشتمل عمارت ۱۹۳۰ تک دنیا کی بلندترین عمارت کہلائی جاتی رہی ہے۔ اس کو کسی کوہ پیما نے سر بھی کیا اس پر سے پیراشوٹ کے ذریعہ چھلانگ لگانے کا مظاہرہ بھی ہوا۔دور بیٹھے بیٹھے میں ایفل ٹاور کو اچھی طرح دیکھ بھی چکا تھا اور جان بھی چکا تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی دن چڑھ چکا تھا۔والدہ جاب پر جا چکی تھیں۔ پہلے تو میرے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔والدہ کو خوش کرنا۔سرپرائز دینا۔میں یہ جانتا تھا کہ وہ دو مرتبہ پیرس جا چکی تھیں اور مجھے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ وہ ایفل ٹاور پر مرتی تھیں۔یہ جو گھر کے کونے کونے میں ایفل ٹاور کے نمونے کھڑے ہیں، ماں کے ایفل ٹاور سے لگاؤ کے شواہد ہیں۔مگر اب جب کہ میں کام شروع کرنے جا رہا تھا ماں سے بھی زیادہ ڈیڈ میرے خیالوں میں تھے۔ایفل ٹاور تو ڈیڈ کے اندر تھا اس گیت والے گمنام شاعر کے پیرس کی طرح۔

ہم نے نیلے ڈبّوں سے برف کی تہوں کو جمانے کا کام لیا۔یہ سب میں نے رات ہی کو طے کر لیا تھا۔وہ دن اس کام کے لئے بالکل ہی مناسب ثابت ہوا۔سورج غائب تھا۔لیکن بارش کے آثار بھی نہیں تھے اور برف نرم تھی ۔اس برفانی ایفل ٹاور کی تعمیر کے لئے ہمیں کہیں دور جانا نہیں پڑا۔گھر کے سامنے ہی ایک کھلی جگہ موجود تھی وہی موزوں لگی۔سب سے پہلے ہم نے نیلے ڈبّوں کی مدد سے ایفل ٹاور کی بنیاد تعمیر کی۔اس کو ممکن حد تک سخت کیا۔اس پر اپنے نقشوں کے مطابق ایفل ٹاور کھڑا کیا جو سانچے ہم نے تیّار کئے تھے وہ بھی مناسب ثابت ہوئے اس کام میں وقفہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی کہ برف کی فطرت کو ہم خوب سمجھتے تھے۔ وقت کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ برف اور وقت میں ازلی دشمنی تھی اور اگر موسمیات والوں کی پیشین گوئی غلط نکلی اور سورج نے اپنے چہرے پر سے نقاب اٹھا لیا تو دھوپ وقت سے کہیں زیادہ برف دشمن ہے۔لیکن موسمیات والوں کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی، سورج نہیں نکلا اور ہم نے اپنا یہ اہرامِ مصر طرز کا ایفل ٹاور چار گھنٹوں کے اندر کھڑا کر دیا۔

کام ختم کر کے ہم اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ ہمارا یہ ایفل ٹاور ہمارے گھر کی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دس فٹ اونچا یہ مینار ہماری کامیابی پر بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔شاید وہ اس سبب سے بھی خوش تھا کہ جو لوگ اس کی تعمیر کے دوران اکھٹّے ہونے شروع ہوئے تھے اب ایک عظیم مجمعے میں بدل چکے تھے۔ ہمارا ایفل ٹاور اس

ہجوم کے درمیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پیرس والا ایفل ٹاور بھی شاید اس وقت اسی طرح مسکرا رہا ہو۔ دروازے کی بجتی ہوئی گھنٹی نے مجھے میری سوچ سے باہر نکالا۔ دروازے کی دوسری جانب میڈیا کی کوئی خاتون کھڑی تھیں۔ اس کے پیچھے کیمرہ سنبھالے ایک فرنچ داڑھی مونچھ والا فوٹو گرافر کھڑا تھا، جس کی ٹانگیں بدن سے کہیں زیادہ لمبی تھیں۔ میری نظریں اس کی داڑھی پر تھیں۔ اور وہ خاتون اپنا تعارف کراتے ہوئے کسی ٹی وی چینل کا کارڈ میری جانب بڑھا رہی تھیں۔ ایسے تجربات سے میں ہر سال ہی گزرتا تھا۔ میں نے والد کو آواز دی، وہ بھی باہر آ گئے۔ ہم دونوں کی برفانی ایفل ٹاور کے ساتھ تصاویر اتاری گئیں اور دونوں سے بات چیت کی گئی اور پھر — تھینک یو بائی بائی — اس کے بعد اس طرح کے اپی سوڈس کئی مرتبہ ہوئے۔ ٹی وی والے، اخبار والے، ریڈیو والے، یہ والے، وہ والے، آتے گئے جاتے گئے — بونجو — ہائی — بائی بائی ٹاٹا — بڑی سردی ہے تاہم ایک اچّھا دن — آپ باپ بیٹے فرنچ ہیں — فرنچ نہیں۔۔ کیوبک سے تعلق۔۔۔۔۔۔ وہ بھی نہیں تو پھر آپ نے ایفل ٹاور کیوں چنا۔۔۔ بس یونہی۔۔۔۔۔۔ پھر بھی اس انتخاب کی کوئی وجہ۔۔۔ کوئی رومانس وغیرہ۔۔ وہ بھی نہیں۔

اگر میں کہوں ’’والد بول رہے تھے‘‘ — ’’فولاد کو پانی کرنا‘‘۔

’’او — او — کوئی گہری بات — یومین — اوکے۔‘‘

’’کیسی گہری بات‘‘ — والد پھر بولے ’’پیرس کا ایفل فولاد — ہمارا ایفل برف۔۔۔ برف۔۔۔ برف کب تک؟ آخر پانی۔۔؟‘‘

’’فلاسفی۔۔۔ پیور فلاسفی۔۔ کانگریچولیشن ٹو یو — ٹو یور ایفل۔۔ چیرس۔۔۔‘‘

کچھ ہی دیر میں ہم باپ بیٹے تھک گئے۔ اندر جا کر ہم نے ایک نوٹس تیّار کیا ’’ڈونٹ ڈسٹرب‘‘ (براہِ کرم ہمیں پریشان نہ کریں) اور دروازے پر چسپاں کر دیا۔ کچھ عرصے کے لئے دونوں اندر آرام کرنے لگے — میں تو رات بھر کا جاگا ہوا تھا صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور اس وقت اٹھا جب ماں جوب سے لوٹی۔۔۔۔ اس کے لئے شاید والد نے دروازہ کھولا تھا۔۔ میں نے والدہ کو خراب موڈ میں پایا۔ میں نے مسکرا کر ماں کو ’ہائی موم‘ کہا۔ لیکن اس نے میری مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا اور کرخت لہجہ میں پوچھا۔۔’’ یہ ایفل ٹاور کا خیال کس کا تھا —؟‘‘

’’ میرا تھا — آپ دو مرتبہ پیرس گئیں، آپنے وہاں کی تعریفیں کیں — سوچا آپ کو سرپرائز دوں — کیا آپ کو پسند نہیں آیا۔۔؟‘‘ اس تمام دوران وہ سوال تو مجھ سے کر رہی تھیں لیکن دیکھ ڈیڈ کی طرف رہی تھیں — میں نے یہ بھی حیرت سے دیکھا کہ ڈیڈ موم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہے تھے — میرے جواب کا نتیجہ اچھا سامنے آیا — موم کے چہرے کا فولاد کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔

’’ پسند آیا — تم دونوں نے بہت اچّھا بنایا ہے — باہر بھی سب واہ واہ کر رہے ہیں۔ مبارک ہو تم دونوں کو۔‘‘

چونکہ باہر کے دروازے سے نوٹس ہٹا لیا گیا تھا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے کچھ اور لوگ بھی آئے۔ اب

کی مرتبہ میں نے والد کے ساتھ والدہ کو بھی بات چیت اور فوٹو میں شریک کر لیا — جس طرح ایفل ٹاور نے ہمارے گھر کے باہر کے ماحول کو خوشیوں کا گہوارہ بنا رکھا تھا اسی طرح گھر کے اندر کا ماحول بھی اگر خوشگوار نہ بھی ہوا ہو تو نیم خوشگوار ضرور تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ رات کب آئی۔ ڈنر پر گھر کے لوگوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ ایک جوڑے نے رقص بھی کیا۔ دیر رات سونے کا موقعہ ملا۔

ایفل ٹاور کی تعمیر کے پیچھے میرا اوّلین مقصد موم کو سرپرائز دینا تھا، اس میں قطعی ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔ البتہ اگلی صبح ہمارے لئے ایک سرپرائز لے کر چلی آئی تھی اور وہ بھی ایک زبردست المیہ کی صورت میں۔ ابھی صبح پوری طور پر ہوئی بھی نہ تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ دو پولیس افسر باہر کھڑے تھے۔ دو تین پولیس گاڑیاں، اور ایک ایمبولینس۔ آگے آگے میں، میرے پیچھے ڈیڈ اور ان کے پیچھے موم — جلدی میں صرف جیکٹ جسموں پر ڈالے گھر کے دروازے پر پہنچے تھے۔ ہم نے پولیس افسروں کو گھر کے اندر بلا لیا۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے دھما کہ خیز اطلاع سے بات شروع کی۔ رات ایک لیڈی ایفل ٹاور سے لپٹ کر مر گئی تھی۔ ہمیں باہر جا کر اس کی باڈی کو شناخت کرنا تھا۔ ابھی تک اس کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں اسکے مطابق:—

مرنے والی کا نام مارتھا فرامرز تھا۔ اس کی عمر 40، 45 برس کی تھی چند ہی دن ہوئے پیرس سے آئی تھی۔ ہم تینوں نے خاموشی سے یہ سب کچھ سنا۔ پولیس افسروں سے اجازت لے کر سردی کا لباس پہنا۔ باڈی کو ہسپتال لے جانے کی تیّاری ہو رہی تھی۔ ہم تینوں کو ایمبولنس میں چڑھ کر اسے دیکھنا پڑا۔ جب ہم نیچے اترے تو پولس افسر نے ہمارا بیان قلمبند کیا۔ میں نے یہی کہا کہ مرنے والی کو اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی پیرس جانے کا اتفاق ہوا — موم اور ڈیڈ نے کیا لکھوایا یہ مجھے اس وقت معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ اس خاتون کی موت کا سبب میں نے پولس افسر اور موقع ملنے پر پیرا میڈ سے معلوم کرنے کی کوشش کی پولس والے نے کہا ’’سردی — ایکسپوژر‘‘ پیرا میڈ نے بتایا ’’نمونیہ — زبردست نمونیہ‘‘۔ پھر وہ سب ہسپتال چلے گئے۔ یہ سب بہت جلد ہو گزرا — یوں تو پیرا میڈ نے اس کو برقی جھٹکے دے کر حتمی کوششیں کر چھوڑی تھیں لیکن ہسپتال میں بھی پہنچانا ضابطے کے مطابق ضروری تھا۔

جب میں گھر میں داخل ہوا تو ماحول سوگوار ہونا ہی تھا لیکن قدرے ناقابلِ فہم ہو رہا تھا — میں نے دیکھا کہ موم فیملی روم میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہ صوفے پر نیم دراز سی تھیں اور ان کی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔ ایک اپنے آپ کو سکیڑنے اور سمیٹنے والی ہستی — ضابطے کے اندر رہنے والی ہستی اپنے آپ کو پھٹ پڑنے سے روک رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان سے پوچھوں کہیں وہ اس مرنے والی کو جان کر بھی انجان نہ بن رہی ہوں۔ ان سے یہ توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اپنے اندر ان سے سوال کرنے کی ہمّت نہ پا کر میں فیملی روم سے نکل رہا تھا کہ موم کے الفاظ میری سماعت سے ٹکرائے ’’اپنے ڈیڈ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ اس کتیا کو یاد کر کے رو رہا ہوگا۔‘‘

میں نے موم کی تاکید ان سنی کر دی اور زینہ چڑھ کر ڈیڈ کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ میں

نے ناک کیا۔۔۔کوئی جواب نہیں ملا۔دو مرتبہ دروازہ ٹھک ٹھک کرنے کے بعد میں کمرے کے اندر دبے پاؤں داخل ہوا۔میری نیت یہ تھی کہ اگر ڈیڈ کو بستر پر لیٹا پاؤں گا تو چپ چاپ الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤں گا۔لیکن وہ بستر کے بائیں گوشے میں پڑی ہوئی کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے کہ جیسے میز پر جھک کر کچھ لکھ رہے ہوں۔

''تم ہو۔۔۔مجھے پتہ تھا تم ضرور آؤ گے۔تمہاری موم نیچے کیا کر رہی ہے—''؟''میں جانتا ہوں وہ چھت کا مطالعہ کر رہی ہوگی۔ایسے وقتوں میں وہ یہی کرتی ہے؟''میں نے دیکھا موم کے خیال کے عین مطابق ڈیڈا کیلے بیٹھ کر رو رہے تھے۔ان کی آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا۔

''موم اور ڈیڈ دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک جانتے تھے۔ایک دوسرے کے ردِّعمل کے بارے میں دونوں کے اندازے کس قدر درست تھے۔'' میں نے سوچا اور بولا۔۔

'' موم فیملی روم میں بیٹھ کر چھت کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔لیکن آپ۔۔آپ کیا کر رہے ہیں۔۔کیا آپ رو رہے ہیں ڈیڈ؟''

''تم سے کس نے کہا۔۔؟

''موم نے ''

''موم نے اور کیا کہا ۔۔۔؟''

''موم کی بات چھوڑیئے۔۔۔۔یہ بتایئے کیا آپ متوفی کو جانتے تھے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔جانتا تھا۔۔۔ اتنا ہی جتنا میں پیرس کو جانتا تھا۔۔۔بھول گئے وہ گیت'

'' پیرس میرے اندر ہے''۔'' وہ میرے اندر تھی۔۔۔وہی تو تھی میری پیرس۔۔۔پیرس میرا نہیں ہوسکا۔۔۔وہ میری نہ ہوسکی۔۔۔۔ہم سب کے راستے جدا تھے۔''

'' ہم سب کے۔۔۔۔؟''

''ہم سب سے مراد، وہ، میں، پیرس،اور ایفل ٹاور۔۔۔ایفل ٹاور اس کی سائیکی کا ایک حصّہ تھا۔اس نے ایفل ٹاور کے ریسٹوران میں مجھے ڈنر دیا۔۔۔بلِ آیا تو پتہ چلا۔۔۔۔ایفل ٹاور کا وہ ریسٹوراں دنیا کا مہنگا ترین ہو ٹل تھا۔۔۔۔ایک پاگل ہی وہاں ڈنر دے سکتی تھی۔اسے عشق تھا ایفل ٹاور سے۔۔۔ ہر شام وہ سورج ڈھلنے سے کچھ دیر قبل ایفل ٹاور کی چھت پر جا پہنچتی اور پیرس کا نظارہ کرتی۔۔ پیرس کا نظارہ کرنے کا موزوں ترین وقت۔۔۔۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نری پاگل تھی۔۔۔۔اور مری بھی پاگل کی موت۔''

یہ کہہ کر ڈیڈ چیخ چیخ کر رونے لگے۔میں نے ڈبے سے ٹشو نکال کر ڈیڈ کو دیا اور کمرے سے نکلتے ہوئے دروازہ اچّھی طرح سے بند کر دیا۔

☆☆☆

سلطان جمیل نسیم (کراچی)

جانی پہچانی کہانی

جاوید کا شمار ملک کے نہایت بے باک صحافیوں میں ہوتا تھا۔وہ بغیر کسی رُو رعایت، کسی مصلحت اور پس وپیش میں پڑے بغیر حقائق کو من وعن بیان کر دینے میں مشہور تھا۔اس عادت کی وجہ سے ہزار دفعہ ہر طرح کا لالچ بھی دیا گیا متعدد بار دھونس دھمکی اور دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑا،ایک مرتبہ تو اس کو قید و بند کی سزا بھی بھگتنا پڑی تھی مگر اُس کی سچائی سے سب ہی واقف تھے اس لئے پریس کلب کی اِس قرارداد کے بعد کہ اگر جاوید کو فوراً رہا نہیں کیا گیا تو سرکاری خبروں کا بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔صحافی برادری کا یہ اتحاد کارگر ثابت ہوا،اور وہ ہفتہ بھر کے اندر ہی رہا کر دیا گیا....جب افغانستان میں جنگ کی آندھی اُٹھی تو وہ وہاں جا پہنچا،محاذ جنگ پہنچ کر اس نے جو دیکھا وہ اپنے اخبار کو بھیجنا شروع کر دیا..پھر جنگ کا پانسہ پلٹ گیا ایک بڑی طاقت جس راستے سے آئی تھی زک اٹھا کے اسی راستے سے واپس چلی گئی،اُسی دوران جاوید سے ٹیلیفوں پر بات ہوئی تو اُس نے اپنی والدہ کا خیال رکھنے کی تاکید کے ساتھ موجودہ صورتِ حال پر بات کرتے ہوئے بہت واضح طور پر کہا ابھی یہاں کے حالات معمول پر آنے میں دیر لگے گی۔فی الحال تو وہ پاکستانی واپس جا رہے ہیں جن کو بعض مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں نے''جہاد'' کے لئے بھیجا تھا لیکن مجھے اُن لوگوں کی واپسی مشکل نظر آتی ہے جو دوسرے ممالک سے آئے ہیں،افغانیوں کی ایک بڑی تعداد جو متوسط درجے کے تاجر یا شہری تھیاُن کی اکثریت پاکستان چلی گئی ہے اور دس پندرہ لاکھ ایران ہجرت کر گئے ہیں، جو بڑے پیمانے پر منشیات فروشی کرتے تھے اور اپنے اپنے علاقے میں سردار یا وارلارڈ یا War Lords کہلاتے تھے اُن کی اکثریت امریکا یا شرقِ اوسط کی ریاستوں میں اپنے کاروبار کو جمائے بیٹھی ہے جن کی واپسی بظاہر ممکن نہیں لیکن اُن سے چھوٹے سردار اب خود وارلارڈز بن گئے ہیں،ان جنگجو قبائل میں بھی کچھ کی وفاداریاں ایران کے ساتھ ہیں، پڑھے لکھے لوگ آج بھی روس کے حامی ہیں اور پاکستان نے روس کے خلاف اسلام پسند ٹولوں کی امریکی ہتھیاروں سے اور اپنے جوان بھیج کر جو مدد کی ہے اُس کے مخالف ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔اس لئے فی الحال میں یہیں ہوں،تم امی کا دھیان رکھنا میں بھی ان کو فون کرتا رہوں گا۔

جاوید کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ایک طبقہ خالص اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتا تھا۔خواتین کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگادی، سائینس ہی نہیں مغربی علوم کو درسگاہوں سے نکال دیا گیا اور یوں افغانستان کے ایک بڑے حصے پر 'طالبان' کی حکومت چھا گئی لیکن اِس حکومت کے مخالفین مسلسل مزاحمت کرتے رہے۔

افغانستان سے روسی افواج کی واپسی نے جہاں سرد جنگ ختم کی وہاں امریکا نے، خود کو سپر پاور کا خطاب دے کر دنیا بھر میں کھلی مداخلت کا راستہ اختیار کرلیا ہے، پاکستان کے پاس امریکی ہتھیاروں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا، اُسے ٹھکانے لگانے کے لئے 'اوجھڑی کیمپ' میں آگ لگائی گئی۔دراصل پاکستان کی ترقی میں آمرانہ طرزِ حکومت کے ساتھ مولویانہ اندازِ فکر ہمیشہ سے ایک بڑی رکاوٹ رہا ہے، جمہوریت کے لئے جس کھلے ذہن اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے اُس کا رواج تو جناح صاحب اور لیاقت علی خاں کے بعد پنپ ہی نہیں پایا۔اِس وقت بھی امریکا کا ساتھ دے کر افغانستان جیسے ایک ملک میں دو دھڑوں کی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کردی گئی ہے، یہ خانہ جنگی کی ابتداء ہے۔

جاوید اپنے خیال و تجزیے کے مطابق افغانستان اور وہاں برپا ہونے والی خانہ جنگی کے بارے میں بھی بلاکم و کاست لکھتا رہا۔جب امریکا نے 9/11 کو بہانہ بنا کر افغانستان پر باقاعدہ چڑھائی کردی تو وہ اسی طرح ایک ایک خبر کی تفصیل اپنے اخبار کو بھیجتا رہا۔اُس نے امریکا کو مطلوب اسامہ بن لادن سے بھی انٹرویو بھی کیا اور اسامہ کے دست راست جو لوگ تھے اُن سے بھی گفتگو کی، یہ ساری بات چیت اور تمام رپورٹنگ اُس کے اخبار میں شائع ہوتی رہی مگر جب امریکا کی اندھا دھند بمباری نے افغانستان کے ایک حصہ پر قائم طالبان کا نظامِ حکومت بھی تلپٹ کردیا اور اپنے ایک پٹھو کو صدر بنا کے افغانستان کی حکومت سونپ دی تب دہشت گردی کی ہوا چلی اِس ہوا نے جب افغانستان سے پاکستان کا رخ کیا تو جاوید نے جہاں یہ سوال اٹھائے کہ چالیس لاکھ افغانیوں کو پناہ دینے والے ملک میں آخر دہشت گردی کا بازار کیوں گرم کیا جارہا ہے وہاں پاکستانی علاقوں سے پرواز کرنے اور پاکستانی ہی علاقوں پر ڈرون حملہ کرنے کی اجازت دینے والوں کے سامنے بھی سوالات کی قطار رکھڑی کردی....نتیجہ یہی نکلنا چاہئے تھا جو نکلا کہ وہ چند ایسے نادیدہ ہاتھوں کے چنگل میں پھنس گیا جہاں سے اُس کے بارے میں بے خبری ہی ایک بڑی خبر بنی رہی۔جس اخبار نے ایک مرتبہ اُس کی رپورٹنگ شائع نہیں کی تھی اُسی اخبار نے ایک بار نہیں کئی مرتبہ جاوید کی گم شدگی پر شذرے لکھے۔ ٹیلیوژن کے کئی چینل وقفے وقفے سے اس کی خاموشی پر بولتے رہے۔مگر کوئی سن گن نہیں ملی۔جاوید کی طرف سے مسلسل خاموشی کی صداؤں نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ افغانستان میں پھیلی ہوئی انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

جاوید، میرا بے تکلف اور بچپن کا دوست ہے، ہم دونوں یونیورسٹی میں بھی ساتھ رہے ہیں وہ صحافت کے شعبہ میں تھا اور میں شماریات کے، جب تک ہم یونیورسٹی میں رہے میں اسکے سکوٹر پر ہی آتا جاتا رہا۔ملازمت کے سال دو سال بعد میری شادی ہوگئی مگر وہ ابھی اس بندھن سے آزاد تھا۔وہ تھا اور اسکی بیوہ ماں۔شاید اسی لئے وہ جو کچھ

دیکھتا تھا نتائج کی پرواہ کئے بغیر بلاکم و کاست لکھ دیتا تھا۔اردو اور انگریزی کے کئی اخبار اُس کی رپورٹنگ شائع کرتے تھے اور اب اس کے یکایک خاموش ہوجانے پر حکومت کو متوجہ کرتے رہتے تھے۔

اُس کی صحافیانہ زندگی میں ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب اس نے مجھے بھی ملنے جلنے سے منع کردیا۔'یار تو اب گھر گرہستی والا آدمی بن گیا ہے اور میں چوبیس گھنٹے خفیہ پولیس کی نظر میں رہتا ہوں اس لئے فی الحال ملنا جلنا موقوف کر....یہ ایک عارضی وقفہ ہے....چند روز میں آمرانہ حکومت بدل جائے گی اور ہم پھر پہلے کی طرح ملنے لگیں گے۔' اور یہی ہوا صدر مملکت کا جہاز کریش ہونے کے بعد ہر چیز اُلٹ گئی۔قید رہائی میں بدل گئی۔اور اب وہ کئی مہینے سے لاپتہ تھا۔

بڑے شہر کی زندگی معمولی سہولتوں کے حصول کے لیے بھی فاصلوں کی مار کھاتی رہتی ہے چنانچہ اُس کی والدہ کے پاس گئے ہوئے اکثر وقفہ طویل ہو جاتا....اور ٹیلیفون کرتے ہوئے میں بڑی خجالت محسوس کرتا۔ایک دن میرے بجائے جاوید کی والدہ نے مجھے فون کیا۔جب میں گیا تو وہ مجھے پہلے سے زیادہ نحیف و ناتواں نظر آئیں۔اُن کی حالت دیکھ کر مجھے احساسِ ندامت ہوا۔مگر انھوں نے جاوید کے بارے میں کچھ پوچھا نہ کوئی حرفِ شکایت زبان پر لائیں، پہلے جیسی اپنائیت سے اپنے قریب بٹھایا چند باتیں کرنے کے بعد مجھے اُس کا خط دکھایا جو بڑے انتظار کے بعد موصول ہوا تھا اور خاصی مدت پہلے لکھ کر پشاور سے پوسٹ کیا گیا تھا۔اس کے بعد انھوں نے لکھی گئی ہدایت کے مطابق ٹائپ رائٹر سے لیکر کمپیوٹر تک ایک ایسے صحافی دوست کو دینے کے لئے کہا جو اکثر جاوید کے پاس یہی دونوں چیزیں استعمال کرنے آتا تھا۔

جاوید کی والدہ بیٹے کی یہ نشانیاں شاید کبھی کسی کو نہ دیتیں مگر ایک تو وہ عمر کے آخری پڑاؤ تک پہنچ چکی تھیں اور دوسرے اِن کو بھی یقین آچلا تھا کہ شاید اب وہ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھ سکیں گی۔

میں جانتا تھا کہ میرے حصے میں اس کی نوٹ بکس اور کاغذات کا جو لفافہ آیا ہے اس میں سوائے ایسی خبروں، تبصروں اور واقعات کے کچھ نہیں ہوگا جن کے حصول میں اُس نے بڑے جوکھم اُٹھائے ہونگے اور جن کو کسی اخبار نے یا کسی نشریاتی ادارے نے عوام تک پہنچانے سے معذرت کرلی ہوگی۔دوستی اپنی جگہ مگر سچی بات یہ ہے مجھے کبھی اس کے پیشہ ورانہ شوق یا کام سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی، مجھے تو اُسکی دوسروں کے کام آنے کی تڑپ اور مرجانے کی آرزو میں زندہ رہنا بھا گیا تھا۔میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے بھی اُس کی اِن ہی خصوصیات کا تذکرہ بڑے فخر کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

اس کی والدہ سے لایا ہوئے وہ لفافے کئی روز بلکہ کئی ہفتے تک بغیر کھولے میری میز کی دراز میں پڑے رہے۔ .ایک فرصت کے دن جب گھر والے کسی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے میں نے بہت دکھی دل کے ساتھ اس کے کاغذات کا لفافہ اٹھا کے اپنے سامنے رکھ لیا۔ایک لفافے میں چیک بک تھی جس میں اُس کے لکھے ہوئے پانچ چیک تھے رقم کسی میں زیادہ اور کسی میں کم تھی ایک چھوٹی پرچی میرے نام تھی۔جس میں مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ میں یہ چیک اُن پانچوں حضرات کو پہنچا دوں اور یہ کہہ دوں کہ اگر بینک والے چیک کیش کرنے میں کوئی

حجت کریں تو وہ لوگ والدہ کو ساتھ لے جائیں کہ یہ اکاؤنٹ ہم دونوں کے مشترک نام سے ہے۔

دوسرا لفافہ خاصا 'تندرست' تھا۔ میں نے سارے کاغذات نکالے اُن پر بھی ایک چٹ لگی تھی جس میں لکھا تھا۔ میں قندوز میں زخمی ہو گیا تھا تو ایک ہمدرد شہری مجھے علاج کی غرض سے پشاور لے آیا اور ہسپتال میں داخل کرا دیا ساتھ ہی اپنے کسی واقف کار سے میری خیر خبر رکھنے کی تاکید کر گیا۔ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو کر واپس افغانستان جانا چاہتا ہوں اس لئے اپنی شناخت کا ہسپتال میں بھی کسی کو پتا نہیں چلنے دیا۔ میں زیرِ علاج ہی تھا پشاور میں ایک دن میں کئی خودکش دھماکے ہوئے، جو صاحب میری نگہداشت پر مقرر کئے تھے وہ بھی ایک حادثہ سے دو چار ہوئے۔ ہسپتال میں زخمیوں کا تانتا بندھ گیا۔ میں نے رضا کارانہ طور پر اپنا بیڈ مستحق مریضوں کے لئے خالی کر دیا۔ میں نے اُس ایک حقیقی واقعہ کو اپنے انداز میں لکھ دیا ہے۔

جاوید کے خط سے یہ امید تو بندھی کہ وہ آج نہ سہی کل آن ملے گا، اور شاید یہی آس کی والدہ کو بھی ڈھارس دیئے ہوئے تھی۔ اب رہا وہ حقیقی واقعہ.... میں چند الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ بیان کئے دیتا ہوں۔

O

ریڈیو۔ ٹیلیوژن۔ ایک ساتھ چیخ پڑے۔ اخبارات نے عجلت میں ضمیمے نکال ڈالے.... خبر ہی ایسی وحشت انگیز اور الم ناک اور اچانک تھی جس نے آناً فاناً گرد کی گہری چادر کے مانند صرف شہر کے ہر ایک فرد کو ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے سارے ہی باسیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، خوف و ہراس اور اذیت و رنج کی عمر تو لمحہ بھر کی تھی لیکن نفرت اور حقارت نے دہشت گردوں کے خلاف دل پر ایسا گھاؤ لگایا جو شاید ایک عرصہ تک نہ بھر سکے۔ جس شہر میں بم پھٹے تھے وہاں تو سب ہی لوگ موسم کی ٹھنڈک کو روندتے ہوئے اپنے پیاروں کی تلاش میں اُسی طرف چل پڑے تھے جہاں یکے بعد دیگرے تین خودکُش دھماکے ہوئے تھے۔ ٹیلی وژن اور اخبارات میں اس تباہی اور بربادی کا شکار ہونے والوں کی تصویریں دیکھنے والوں کی آنکھیں ہی نہیں چھلکی تھیں دل رو پڑے تھے۔

ہمارے ملک میں ہوسِ زر کے ساتھ اقتدار کے چند بھوکے بھیڑیے بھی ہیں جن کی پیاس انسانی خون سے ہی بجھتی ہے ایسے ہی لوگوں نے، زمین زبان اور مسلکوں کی عصبیت کے شکنجے میں عوام کے معصوم ذہن کو کچھ یوں جکڑا ہے کہ سب ایک دوسرے کے لئے ڈراکولا بن گئے ہیں.... مگر نہیں شاید یہ بات درست نہیں اس لئے کہ جب کرکٹ اور ہاکی کھیلی جائے تو ساری عصبیتیں مٹ جاتی ہیں اپنی ٹیم کی جیت پورے ملک کی جیت سمجھ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح ۲۰۰۵ میں آنے والے زلزلے میں سب یہ بھول گئے تھے کہ زلزلہ کہاں آیا ہے۔ ہر شخص جو کچھ زلزلہ زدگاں کے لئے کر سکتا تھا اُس میں کوئی کسر نہ چھوڑی عورتوں نے اپنے زیورات دان کر دیئے اور مردوں نے اپنی جیبیں جھاڑ دیں، ہر شہر میں خوں کا عطیہ دینے والوں کی قطاریں لگ گئیں.... مگر کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں۔ ممکن ہے بلکہ یقیناً۔ کچھ لوگوں نے اپنی ذات کے لئے فائدہ بھی اٹھایا ہو مگر بات اکثریت کی ہو رہی ہے.... وہی اب بھی ہوا سیکڑوں لوگوں کی موت اور لاکھوں بلکہ کروڑوں کے مالی نقصان پر بھی تخریب کار وہ فائدہ نہ اٹھا سکے جس کے لئے انہوں نے یہ ہولناک کھیل کھیلا تھا۔ وہاں چند لالچی بھی

آنکھ بچا کر پرایا مال اُڑانے کے لئے پہنچ گئے تھے۔

امریکا کی مخالفت کے اظہار میں یا چند مذہبی جنونیوں کے بہکاوے میں آ کر اپنے ہی ملک کے لوگوں کی جان و مال سے کھیلنا اِس سے بڑی احمقانہ حرکت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سنا ہے غریب نادار اور ناسمجھ، زکواۃ و خیرات پر چلنے والے مدرسوں کے طالبِ علموں کو اِس مذموم مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یہ وطن کے ساتھ تو دشمنی ہے ہی لیکن نوعمر لڑکوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر بے قصور لوگوں کی جان لینے والوں سے بڑا قاتل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ملک بھر کے لوگ اسی خیال کے حامی ہیں۔

اِس قاتلانہ کھیل کی ابتداء عراق سے ہوئی تھی جہاں امریکا برسوں پہلے سے نسلوں کی بربادی کے درپئے تھا کہ اسی راستے سے مشرقِ وسطیٰ میں سمٹی ہوئی کالے سونے کی دولت پر قابض ہو سکے اور اپنے آقا و مالک اسرائیل کی بقا کو یقینی بنا سکے۔ حالانکہ مشرقِ وسطیٰ میں بادشاہت وخلافت کے ناسور کو پھلنے پھولنے کا موقع دے کر پہلے ہی اس نے اُن کی دولت پر بہت حد تک قبضہ حاصل کر لیا ہے مگر اسرائیل کے لئے راستہ بالکل صاف کرنے اور کالے سونے کے حصول کے لئے.... اِس گھٹیا، تاجرانہ کھیل کی ابتدا مصر کے جمال ناصر کی قوت کو ختم سے ہوئی جو روسی دوستی اور اسرائیل دشمنی میں پیش پیش تھا۔ جس کو نہر سوئیز کے قومیانے کی سزا دینے کے لئے خود ساختہ سپر پاور نے اپنے حواری برطانیہ اور فرانس کی مدد سے اسرائیل کے ذریعہ صرف ایک رات میں مصر کی ہوائی طاقت کو سوکھے پتوں کے مانند اُڑا دیا۔ مگر سیاست کی بساط پر ابھی تک مشرقِ وسطےٰ کو پوری طرح مات نہیں ہوئی تھی چنانچہ اُس نے عراق اور ایران کو بھڑایا اِس طویل جنگ میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا کر بھی ناکامی ہوئی تو عراق پر معاشی پابندیاں لگائیں بچوں کو دواؤں سے اور بڑوں کو روٹی سے محروم رکھ کر بھی اُس کا پیٹ نہیں بھرا تو عراق کی ڈکٹیٹر شپ کا رخ فوجی دھمّال کے ساتھ کویت کی طرف موڑ دیا، اِن تمام چالوں کے باوجود کامیابی نصیب نہ ہوئی تو اُس نے 9/11 کو اپنے ہی دو بوسیدہ تجارتی ٹاور منہدم کر کے ایک پلاننگ کے ذریعہ نتائج پر نظر رکھے بغیر افغانستان پر دھاوا بول دیا، کاش وہ افغان قوم کی تاریخ سے واقف ہوتا۔ (جیسے آجکل ڈرون حملے ہوتے ہیں کیا اسی طرح اپنے ہی جہاز خالی کرائے گئے Twin Towers پر نہیں ہو سکتے تھے۔؟

روس اور افغان جنگ کے دوران یا ممکن ہے بہت پہلے سے افغانستان سے ملحق روس کے زیرِ انتظام وہ چھوٹے صوبے اپنے معدنی وسائل کے ساتھ نظر میں آ گئے بلکہ نظر میں تو پہلے سے ہی ہونگے لیکن افغانستان کے ذریعہ اُن تک پہنچ آسان نظر آئی اور وہ پاکستان کے احمق سربراہ کو سبز باغ دکھا کر افغانیوں کی مدد کے بہانے روس کے مدِ مقابل لے آیا اور یہ پروپیگنڈا بھی بہت کام آیا کہ برادر اسلامی ملک پر لادینیوں کا حملہ برداشت نہیں کیا جائیگا۔ افغان جنگجو قبیلے جن کے رابطے اور رشتے پاکستان کے سرحدی علاقوں سے بھی تھے وہ سب مل کے ایک ہو گئے پاکستان کے حکمراں نے روس کے خلاف جہاد کا نعرہ لگایا تو نہ صرف کراچی سے خیبر تک نوجوانوں کے بہت سے جتھوں کو اسلام کی نام لیوا سیاسی جماعتوں نے محاذ پر بھیجنا شروع کر دیا۔ اسلام اور جہاد کا نام اِس شدت اور تواتر

کے ساتھ لیا گیا کہ بہت سے مسلمان ملکوں کے لوگ بھی اس جہاد میں شریک ہونے کے لئے افغانستان پہنچنے لگے بلکہ روس میں لگنے والی مذہبی پابندیوں پر ناراض طبقہ اور افریقہ میں امریکی چیرہ دستیوں سے برہم رضا کار، شرقِ اوسط کے سربراہوں کی شہ پر افغانستان پہنچ گئے، نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ملکوں سے آئے ہوئے جہادیوں کے سامنے سوویت یونین کو افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں.... جنگ کھیل نئ ہوندی زنانیاں دی کے مصداق روس اور افغانستان کے ساتھ پاکستان کو بھی معاشی بوجھ اُٹھانا پڑا....روس کے خلاف خلیجی مما لک ،افریقہ میں امریکی حکمتِ عملی سے نالاں انتہا پسند گروپوں اور مذہبی پابندوں سے نالاں روسی ریاستوں کے لوگ بھی آزادی کی اِس جدوجہد شریک ہونے کے لئے افغانستان میں جمع ہوگئے۔اب ’جنگ‘ ختم ہونے کے بعد ایسے لوگوں کی اپنے ملک واپسی اس لئے بھی ممکن نہیں تھی کہ ان کو اپنا ہی ملک قبول کرنے کو تیار نہیں تھا، وہ روس ہو یا عرب ریاستیں‘ دوسرا سبب کہ اسلامی بھائی چارے اور افغانستان کیساتھ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دس گیارہ سال گزارنے کی وجہ سے اِن علاقوں میں اُن غیر ملکیوں کے رشتے ناطے بھی ہو گئے تھے یوں بھائی چارہ کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

اِس دوران میں امریکا نے ایک سیاسی حماقت یہ کی کہ ایک گہری سازش کے ذریعہ 9/11 کا ڈرامہ رچالیا ۔اور موردِ الزام اُن جہادی لیڈروں کو ٹھہرایا جن کو اسلحہ دے کر روس کے مدِ مقابل کھڑا کیا تھا۔ اپنے اِس دوغلے کردار اور نا قابل اعتبار تعلق کی وجہ سے پہلے ہی دنیا بھر میں اعتماد کھو چکا تھا جس ملک کو اناج کی یا مالی امداد دیتا وہاں سے ہی گالیاں زیادہ کھاتا، کیونکہ امداد دینے سے پہلے اپنی پسند کی حکومت قائم کرالیتا تھا۔اب 9/11 کو بنیاد بنا کر اپنے مغربی حواریوں کے ساتھ افغانستان پر فوج کشی کر دی۔کویت میں تو پاؤں گاڑ ہی چکا تھا اور کویت ہی پر کیا منحصر مشرقِ وسطیٰ کے سارے ہی مسلم ملک اُس کے زیرِ نگیں تھے۔اُس کا سچا اور پکا، اور اپنے اشاروں پر امریکا کو نچانے والا ایک ہی ملک تھا اسرائیل....دنیا امریکا سے ڈرتی اور امریکا عزرائیل سے۔لیکن دونوں کو یہ خبر نہیں تھی کہ افغانستان سانپ کے منہ میں چھچھوندر ثابت ہوگا۔ پاکستان کے قبائل اپنے علاقے اور افغانستان کو گھر آنگن سمجھتے تھے، ڈیونڈر لائن ان کے لئے ایک بے حقیقت اور بے خطر لکیر کے سوا کچھ نہ تھی۔ بانیء پاکستان نے قبائلی علاقے کو اپنی سرحد اور وہاں رہنے والوں کو اُس سرحد کا محافظ قرار دیا تھا اور اب تک قبائلی علاقے کے لوگ اِس معاہدے پر قائم تھے۔

لیکن جب ایک فوجی سربراہ نے اس معاہدے کی کہا فغانستان پر چڑھائی کرنے اور وہاں اپنا من پسند سربراہ لا کے بٹھانے سے فتح تو مقدر نہیں بن سکتی تھی، اپنی فوج کے جانی نقصان پر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنی پرانی چال چلتے ہوئے پاکستان کی لولی لنگڑی جمہوری حکومت کی بساط لپیٹ دی۔اور کوششیں یہ شروع کر دیں کہ پاکستانی قبائل، افغانیوں کی مدد نہ کریں جو ایک ناممکن بات تھی۔

پاکستان کے تمام شہری، سب ہی لوگ، عموماً سکون اور اطمینان کے ساتھ وہ زندگی بسر کر رہے تھے جس میں

وقت کا زیادہ حصہ آمدنی اور خرچ کا توازن قائم رکھنے کی تگ و دو میں صرف ہو جاتا ہے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے(اگر شعر صحیح نہ لکھا ہو تو معافی)

اک مشقت چاہتی ہے رات دن ہر تمنائے تن آسانی ہنوز

اب پاکستانیوں کو افغانستان کی جنگ سے (وہ روسی یلغار ہو یا امریکی فوج کشی) یہ مصیبت جھیلنی پڑ رہی تھی کہ ہیروئن اور کلاشن کوف کی وبا پاکستانی عوام میں پھیل گئی۔ پاکستان میں کم ہمت اور بے روزگار نشہ کے عادی ہوتے چلے گئے، صاحبِ استطاعت لوگ اپنے عزیزوں اور بچوں سے یہ کراہت انگیز عادت چھڑانے کے لئے ہسپتالوں میں داخل کرا دیتے تھے باقی نشئی گندے نالوں کے کنارے یا کم آمد و رفت والی جگہوں پر عموماً دیکھے جاتے اِس لت کی وجہ سے جرائم میں بھی اضافہ ہوگیا اِس کے باوجود بھی ہر پاکستانی اپنے پڑوسی یا کسی دوسرے ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی خبریں پڑھتے اور سنتے ہوئے عام شہریوں کے ساتھ ہمدردی اور اخوت کا اظہار کرتا اور دہشت گردوں کے لئے دل میں از خود بڑھ جانے والی نفرت کی لہر کو روک نہ پاتا، لوگ جب کبھی آپس میں اِس موضوع پر بات چیت یا تبصرہ کرتے تو خود کُش دھماکے کرنے والوں کے لئے خواہ وہ کسی افریقی ملک میں ہو یا مشرقِ بعید کے ملک میں اپنے دل میں غیر محسوس طور پر امریکا کے لئے تنافر اور خفگی کا جذبہ پیدا ہو جاتا، ساتھ ہی وہ اِس بات پر بھی شکر گزاری کا احساس اپنے دل میں پاتے کہ یہ انسانیت سوز اور حیوانیت کے پروردہ یہ دہشت گرد ہمارے شہر اور ہمارے ملک سے دور ہیں۔حالانکہ خاموش اکثریت اِس کرب میں مبتلا رہتی تھی کہ امریکی گرفت ہمارے برسرِ اقتدار طبقہ پر جتنی سخت ہوتی جارہی ہے اتنی ہی تیزی سے کرپشن اوپر کی سطح سے نیچے کی طرف تیزی سے آرہا ہے، اشیائے خورد و نوش روز بروز عوام کی دسترس سے دور ہوتی جارہی ہیں پھر اِس بات پر بھی شُکر ادا کرتے کہ کڑی محنت کرنے کے بعد بھوکا تو نہیں سونا پڑتا، خالی پیٹ وہی سوتا ہے جو محنت سے جی چراتا ہے۔مگر پُر امن رہنے اور امریکا کے منافقانہ طرزِ عمل سے واقف ہوتے ہوئے بھی پڑھے لکھے طبقے کی اکثریت کسی نہ کسی بہانے امریکا اور یورپ جانے کے لئے ویزا کی لمبی قطاروں میں جا کر کھڑے ہو جاتی کہ اپنے ملک میں روزگار کی سہولتیں کم سے کم تر ہوتی جارہی تھیں۔جب پاکستان کے سرحدی علاقوں میں بھی مہینے دو مہینے بعد دو چار دھماکوں کی خبریں آنے لگیں اور، رفتہ رفتہ ان دھماکوں کا دائرہ بڑھنے لگا تو امریکا سے نفرت کا گراف بھی اوپر جانے لگا۔جس طرح بے پڑھا لکھا طبقہ محنت مزدوری کے لئے مشرقِ وسطیٰ جانے کے لئے دھوکہ بازوں کے ہاتھوں اِس حد تک پریشانی اُٹھاتا کہ کبھی کبھی جان بھی گنوانا پڑ جاتی تھی پھر تو یہ ہوا کہ نوجوان اور نوعمر جاہل لڑکوں کی برین واشنگ کرنے کے بعد کراچی سے پشاور تک خود کُش دھماکے آئے دن کا معمول بننے لگے جہاں ایک طرف اُن فاتر العقل لوگوں سے نفرت دل میں گھر کرنے لگی جو نوجوانوں سے یہ گھناؤنا کام کراتے تھے وہاں دینی طبقے نے بھی خود کُش حملہ کرنے اور اِس کی ترغیب دینے والوں کو مسلمان ماننے سے انکار کر دیا ساتھ ہی ساتھ سب یہ بھی مانتے تھے کہ خود کش حملہ آوروں کی تربیت کا مرکز مدرسے ہیں مگر سیاست سے وابستہ مذہبی لیڈر کھل کر اعتراف کوئی نہیں کرتے تھے اور امریکا کو جہاں ڈرون حملوں کا مجرم گردانتے تھے وہاں خود کُش حملوں کا محرک بھی قرار دیتے.... پاکستان کے

لوگ جانی و مالی نقصان پر رو پیٹ کر صبر کر لیتے تھے لیکن جب ایک ہی شہر میں ایک ساتھ چار پانچ دھماکے ہوئے.... وڈیو کی دوکان، حجام کی دوکان، تعلیم گاہ، مسجد اور شہر کی سب سے بڑی تجارتی منڈی سے لیکر ایک بھرے پُرے بازار تک میں... جہاں عموماً چھوٹے بڑے تاجروں سے لے کر طالب علموں اور مزدوروں' روزمرہ کی خریداری کرنے والے عورت اور مرد سب ہی موجود ہوتے تھے، جہاں سورج کی پہلی کرن سے غروبِ آفتاب تک تجارتی لین دین کی سرگرمیاں عروج پر رہتی ہیں....اسکول میں جہاں مستقبل کی مائیں اور اتنی چھوٹی معصوم بچیاں ابھی جن کو پوری طرح بستہ سنبھالنا بھی نہیں آیا ہے وہاں اتنے شدید بم دھماکے....عمارتیں کھنڈر بن کے رہ گئیں اور ایک جگہ نہیں شہر بھر میں تابڑ توڑ چار پانچ دھماکے، فجر کی نماز سے طلوع آفتاب تک ....آخر اُن کا دشمن کون ہے جس کو مارنے کے لئے انہوں نے سارے شہر پر لرز طاری کر دیا ہے۔

عام شہری ان دھماکوں کے توڑ کے لئے کیا کر سکتے تھے۔! جیسا کہ ہوتا آیا ہے اسپتالوں کی ایمبولینس، رفاحی اداروں کی گاڑیاں، رضا کاروں کا ہجوم اور مدد کے لئے دوڑ کر پہنچنے والے لوگ.....اور کچھ تماش بین....کچھ لچّے لفنگے جو موقع پاتے ہیں ہاتھ لگی چیز کو لے بھاگنے کے تیار، پھر حادثے کی جگہ جمع ہو جانے والی بھیڑ.... پھر یہ خبر سنتے ہی چند ڈاکٹر جو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر پہنچ گئے تھے انہوں نے واپس ہسپتال کا رُخ کیا اور دو چار ڈاکٹر ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے فون تک بند کر دیئے کہ اچانک بلاوا نہ آ جائے۔ ایک شہر میں ایک ساتھ کئی دھماکوں کو دیکھتے ہوئے اپنا فرض سمجھ کر سرکار کی جانب سے ڈاکٹروں اور فوجیوں کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئیں۔ عوام سے خون کے عطیات دینے کی اپیل سب اداروں کی جانب سے نشر کی جانے لگی۔

عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ کوئی یقین سے نہیں بتا سکتا تھا کہ کتنے لوگ زخمی ہوئے ہیں، کتنے اپنی جان سے گئے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو ابھی ملبے میں دبے ہوئے ہیں۔ ایک عمارت ہو تو اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے ایک بڑی مارکیٹ اور ایک لڑکیوں کا اسکول۔ ایک بازار۔ ایک مسجد۔ ایک دوکان وڈیو کیسٹ کی اور ایک دوکان حجام کی یہ بھی دونوں ایک دوسرے بازار کے بیچوں بیچ.....ایسے مواقع پر فوج کی نفری بھی طلب کرنا کچھ غلط نہیں تھا۔ اُس سے پہلے پولیس کی مدد کے لئے رینجرز کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ تباہ شدہ عمارتوں کے آس پاس روتے دھوتے۔ بے بسی کے ساتھ اپنے زانو پیٹتے، سینہ کوبی کرتے وہ لوگ بھی جمع ہوتے جا رہے تھے جن کی زندگی بھر کا مال و متاع اِس بازار میں لگا تھا اور وہ لوگ بھی جن کے عزیز و اقربا یہاں کام کرتے تھے، اور اُن کے رشتے دار بھی جو نماز ادا کرنے آئے تھے۔ ...لیکن خدا کا کرم یہ ہوا کہ اسکول میں دھماکے اتنے سویرے ہوئے کہ ابھی پڑھنے پڑھانے والوں میں سے کوئی نہیں پہنچا تھا سوائے چوکیدار کے۔

صبح سے شام ہو گئی زخمیوں کے لئے اسپتالوں میں اور مرنے والوں کے لئے مردہ خانوں میں جگہ نہ رہی تو ایسے بہت سے زخمیوں کو گھر جانے کی اجازت دیدی گئی جن کو نگہداشت کی بہت زیادہ ضرورت نہیں رہی تھی یا رضا کاروں سے یہ کہا گیا کہ اِن کو دوسرے قریبی شہروں کے اسپتالوں تک پہنچا دیا جائے۔
یہ سارا کام شہر کے رضا کار اور حکومت کے ارباب و کشاد فوجی اور نیم فوجی دستوں کی مدد سے انجام دے رہے تھے۔

O

شہر میں ہونے والے اس حادثاتی سانحہ پر نصیب گل' یہ وہ صاحب ہیں جن کو افغانی ہمدرد میرا خیال رکھنے کی تاکید کر گیا تھا، پریشان بھی تھا اور مطمئن بھی، اُس کی بھی دوکان تباہ ہوئی تھی، مالی طور پر یہ اتنا بڑا جھٹکا تھا کہ سنتے ہی اُس کا دل ڈوبنے لگا پھر دوسرا سانحہ یہ کہ دوکان میں کام کرنے والے اس کے دونوں ملازم عمارت کے ملبے میں زندہ دفن ہو گئے یا بم کا کوئی ٹکڑا لگنے سے وہیں مر گئے اور اُن پر پوری عمارت آن پڑی، برسوں کا ساتھ تھا، اُن کی موت کا خیال ہی وجود کو ہلا دینے والا تھا۔ آس پاس کی دکانوں کا بھی یہی حال تھا۔ اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا مگر اِس الم انگیز واقعہ کے باوجود جس بات نے اُس کے اندر صبر اور استقامت بھر دی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ایک اطمینانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اُس کا سبب صرف یہ تھا کہ....، نصیب گل اپنے دکھ اور پریشانی کا تو برملا اظہار کر رہا تھا لیکن اپنے صبر و سکون کو ظاہر کرنے کے لئے اُس نے اپنے کمرے میں شکرانے کی نماز ادا کی تھی کہ آج اس نے اپنے ارادے کے مطابق بیٹے کو دوکان نہیں بھیجا، ورنہ کل رات ہی کو بیٹے گل زماں سے کہہ دیا تھا کہ جب تک پڑھائی کا نتیجہ نہ آئے دوستوں کے ساتھ مٹر گشت کرنے کے بجائے صبح سے دوکان سنبھالو' اس فیصلے پر نوجوان بیٹے نے منہ تو بنایا تھا مگر باپ کے سامنے لب کھولنے کی ہمت نہیں تھی اس لئے گردن جھکا کے اقرار کر لیا تھا، دوسری اور اہم بات یہ تھی کسی وجہ سے اُس کی ساتویں جماعت میں پڑھنے والی بیٹی ابھی اسکول جانے کی تیاری بھی نہ کر سکی تھی کہ یہ اندوہناک خبر آ گئی۔

اب وہ دکان اور مال تباہ ہونے کا افسوس کرے یا بیٹے اور بیٹی کے بچ جانے پر اپنے مالک کا شکر ادا کرے....رہے دوکان میں کام کرنے والے دونوں ملازم تو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں کون دخل دے سکتا ہے....مگر نصیب گل نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دوکان پر کام کرنے والے دونوں آدمیوں کے گھر ہر مہینے اتنی رقم بھیجتا رہے گا جتنی اُن کی تنخواہ تھی، ان باتوں کے ساتھ ساتھ اُس کے دماغ میں یہ سوال بھی گردش کر رہا تھا کہ یہ اپنے ہی لوگ اپنے ہی لوگوں کی جان کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں...؟

O

اِس حادثے کی خبر سننے کے بعد نصیب گل کے بیٹے کو اُس کے دوستوں نے فون کیا اور بتایا کہ وہ خون کا عطیہ دینے کے لئے جا رہے ہیں، تو بیٹا باپ سے اجازت لے کر دوستوں کے ساتھ اِس کارِ خیر میں حصہ لینے کے لئے چلا گیا۔ بیٹی پر بھی اس ناگہانی آفت نے اتنا اثر ڈالا تھا اور وہ گھائل ہرنی کی طرح اپنے کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گئی تھی حادثے کی تفصیل معلوم ہونے پر پہلے ماں سے گلے مل کر اتنا روئی کہ ماں کو شبہ ہونے لگا کہیں حواس نہ کھو دے۔ کتنی مشکل سے بھائی کے مسلسل سمجھانے اور ماں کے مستقل اصرار کے بعد ابا نے اسکول میں داخلہ کی اجازت دی تھی حالانکہ وہ لڑکیوں کی پڑھائی کے خلاف تھے۔ 'ام پوچھتا ہے کوئی نوکری وو کرنی کرنا ہے جو اسکول جانے کے لئے تم لوگ سفارش کرتا ہے؟' آخر بھائی کی دلیلیں اور ماں کی سفارش کام آئی اور وہ اسکول جانے لگی، پہلے دن ہی

اُسے محسوس ہوا کہ پنجرے کے باہر کی فضا کیا ہوتی ہے اور وہ جی جان سے پڑھائی میں لگ گئی چار برس میں دو مرتبہ پروموشن ملے تھے اور اب وہ ساتویں کلاس میں پہنچی تھی۔خبروں کے مطابق اب اُس کا وہی اسکول مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا....اُس کا غم بے وجہ تو نہیں تھا۔

آج کے دل خراش واقعہ پر سارا ملک ہی مغموم اور افسردہ تھا،لیکن جس شہر میں یہ حادثہ ہوا تھا۔اور جو لوگ کسی نہ کسی انداز میں 'متاثرین' میں شمار کئے جا سکتے تھے اُن کے دل و دماغ چوطرفہ خیالات کی آماجگاہ بن گئے تھے۔یہ کیوں ہوا۔اب کیا ہوگا۔کیسے ہوگا۔؟؟؟

سوالات کا بھنور تھا۔ڈوبتے ابھرتے خیالات تھے اور قدرت کے علاوہ کوئی مددگار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

O

نصیب گل نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور ماں ہر آنسو کے ساتھ بیٹی کو سینے سے لگا کر دلاسہ دینے کے سوا کیا کر سکتی تھی!

کسی ایک گھر میں نہیں شہر کے سارے گھروں میں' پورے ملک کے تمام شہروں میں سوگ کی فضا قائم رہی۔

نصیب گل سارا دن حجرے میں بیٹھا اپنے دوستوں رشتہ داروں کے ساتھ اس مسئلہ پر باتیں کرتا رہا اور چبائے ہوئے نوالوں کی طرح دن بھر میں ہزار مرتبہ سنے اور کہے ہوئے فقروں کی جگالی کرتا رہا کہ یہ خانہ خراب بم پھوڑنے والے کیا یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح وہ اپنے ہی وطن، اپنے ہی مذہب کے لوگوں کی جان و مال سے کھیل رہے ہیں اپنے ہی بھائی بندوں کی املاک تباہ کر رہے ہیں۔اُس کے دوست حضرت شاہ نے کہا، یہ خدائی خوار آخر چاہتے کیا ہیں۔ام نماز کو جانا چھوڑ دے۔؟ ام خط بنوانا ترک کر دے۔؟ام اپنا لوک گیت نہ سنے....کاروبار بند کر دے....کچھ بتائے تو سہی....آخر بم پھوڑنے کا مقصد کیا ہے۔؟اوئے امریکا کی مخالفت میں اپنے لوگ کو کیوں مارتا ہے۔

لوگ صبر کے ساتھ وقت بھی سمیٹتے رہے۔ایسی ہی باتوں میں ایک دن گزرا، دوسرے دن کا سورج غم کو ہلکا کرتا ہوا طلوع ہوا اور بہت ساری تکلیفیں، دکھ اور پریشانیوں کا احساس لے کر غروب ہوگیا۔

وہ دھماکے کا تیسرا روز تھا جب وہ سب دوست حجرے میں بیٹھے تھے اور حسبِ معمول موضوعِ گفتگو شہر میں ہونے والے دھماکے' ان کے نتیجے میں ہونے والے نقصان تھے اور حکومت کا یہ اعلان بھی کہ مرنے والوں کو پانچ لاکھ اور زخمی ہونے والوں کو ایک لاکھ معاوضہ دیا جائے گا۔اس پر ایک دوست نے زہرخند کے ساتھ کہا، ہر شے گراں ہوگئی ہے پہلے بلوے میں مارے جانے والوں کے لئے دس ہزار قیمت مقرر ہوتی تھی اب پانچ لاکھ ہوگئی ہے۔' حضرت شاہ نے کہا مجھے کوئی ایک وارث ایسا بتاؤ جس نے مرنے والے کی قیمت وصول کی ہو۔یاراں یہ ساری امدادی باتیں ہوائی ہوتی ہیں گون منٹ کی طرے۔صرف تسلی کے لئے۔

جب حجرے میں اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اُسی وقت نصیب گل کا بیٹا آیا۔سب نے اس کی جانب دیکھا مگر اُس نے دبے لہجہ میں باپ کو ذرا دیر کے لئے گھر چلنے کو کہا۔اگر کوئی اور ہوتا تو نصیب گل ٹال جاتا مگر بیٹے کے چہرے پر چھائی ہوئی گمبھیرتا دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا، ساتھ چلتے ہوئے پوچھا، سب خیر ہے نا۔؟

بیٹے نے جواب دینے سے پہلے چاروں طرف نظر ڈالی اور آہستہ سے اپنی بہن کا نام لے کر کہا، اماں بتاتی ہے وہ کئی گھنٹے سے گھر میں نہیں ہے۔نصیب گل کو یہ تو خبر تھی کہ جب سے حادثے کا سنا ہے رہ رہ کر روئے جا رہی ہے۔

پہلے دن تو اُس پر سکتے کی سی حالت طاری ہوگئی تھی۔مگر اپنے اسکول کی ساتھیوں سے باتیں کرنے کے بعد ذرا سنبھلی تھی اور رونا دھونا کم ہوا تھا مگر چہرے سے سوگواری کے اثرات کم نہیں ہوئے ہیں، دوسری بات جو نصیب گل کو اس کی بیوی نے بتائی تھی کہ دھماکے والے دن سے اب تک اسکول کی ساتھیوں کو جتنے فون کئے ہیں اور جسقدر فون آئی ہیں ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔نصیب گل نے یہ کہہ کر اپنی گھر والی کو تسلی دیدی تھی، حادثہ بڑا تھا لوگ اپنے نقصان کے صدمے سے باہر نہیں نکل پائے ہیں اور وہ خود اپنے زیان کو بھلانے کیلئے جتنی دیر حجرے میں بیٹھتا ہے کیا اب سے پہلے کبھی اتنی دیر تک بیٹھا ہے؟ بیٹی کی درس گاہ اجڑی ہے سوگ منا لینے دو۔

اب بیٹے کی بات سن کر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے۔

گھر پہنچا تو دیکھا بیوی کا بھی برا حال ہو چکا ہے آنکھ سے آنسو تھمتے ہی نہیں ہیں۔ بیوی نے روتے ہوئے تفصیل بتائی کہ جب سے اسکول کے انہدام کا سنا تھا کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔حالانکہ اس کو سمجھایا بھی تھا کہ شہر میں یہی ایک اسکول تو نہیں تھا جس کلاس میں تم ہو اسی درجہ میں دوسرے اسکول میں داخلہ کرا دیا جائے گا۔مگر اُس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکول نہیں ڈھا ہے بلکہ اس کی ماں مر گئی ہے اور میں دوسرے اسکول میں داخل کرانے کا نہیں کہہ رہی ہوں اُس کے لئے سوتیلی ماں لانے کی بات کر رہی ہوں....میرے سمجھانے پر تو اور رونے لگی....ایک عمارت کے گر جانے پر اتنا اور اتنے عرصہ روتے ہوئے تو میں نے کسی کو نہیں دیکھا....پھر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی میں سمجھی کہ سوگ مناتے مناتے ہلکان ہوگئی ہے اپنے کمرے میں جا کر سو جائے گی۔مگر جب بیٹی کی آواز سنی تو یہ دیکھنے کو اُس کے کمرے کے پاس رک گئی کہ سونے کے بجایے اِس ناوقت وہ ٹیلیفون پر کس سے باتیں کرنے لگی ہے، اور یہی بات جب پوچھی تو اُس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھکے کہا کہ اپنی کلاس فیلو مرجانہ سے باتیں کر رہی جو حضرت شاہ کی بیٹی ہے۔ لمحہ دو لمحہ وہاں رکی اور جب موضوع ڈھے جانے والے اسکول کی تعزیت ہی کو پایا تو کمرے سے باہر آ گئی۔

گھر والی کی اتنی باتیں سن کر نصیب گل نے کہا، حضرت شاہ تو ہمارے ساتھ حجرے میں بیٹھا ہے۔

اب بیٹا سامنے آ گیا اور باپ کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ حضرت شاہ کو اُس کے گھر بھیجے تا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ہماری بہن اپنے اسکول کا نوحہ اپنی کلاس میٹ کے ساتھ پڑھنے کے لئے اُن کے یہاں تو نہیں چلی گئی ہے۔

نصیب گل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ مہمان کو کیا کہہ کر اپنے حجرے سے رخصت کرے۔
یہ سوال بھی بیٹے نے حل کر دیا۔ باپ کو ساتھ لیکر پھر حجرے تک گیا اور وہاں جا کر حضرت شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔ چا چا آپ کے گھر سے فون آیا ہے اور آپ کو بلایا ہے۔
حضرت شاہ کے اٹھتے ہی باقی دو تین دوست بھی اٹھ گئے محفل برخواست ہوگئی۔
نصیب گل نے بیٹے سے پوچھا۔ اِس کا کیا مطلب ہے اور اب کیا ہوگا،؟
بیٹے نے کہا۔ اُن کا گھر یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے اب ہم اتنی دیر صبر کریں گے کہ حضرت شاہ چا چا اپنے گھر پہنچ جائیں پھر آپ ان سے بات کریں گے۔ اگر بہن وہاں ہوگی تو وہ خود بتا دیں گے ورنہ ہم پوچھ لیں گے۔
بیٹے کی اس ہشیاری پر نصیب گل دل ہی دل میں خوش ہوا، دونوں اسی انداز کی باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچے ماں اپنی بیٹی کی گم شدگی سے نڈھال ہو رہی تھی، بیٹے کی تجویز اُس کی سمجھ میں نہیں آئی یا اُس کو بیٹی کے خیال کے سوا کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

ابھی نصیب گل ماتھا پکڑ کے چارپائی پر بیٹھنے کے بعد بیٹی جو گھر کی غیرت و ناموس ہوتی ہے' اس کے یکا یک، بغیر بتائے گھر سے چلے جانے کے بارے میں اپنا کوئی خیال کوئی ردِعمل ظاہر کرنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے کی کنڈی بجنے کی آواز نے سب کو چونکا دیا اور اس سے پہلے کہ نصیب گل اُٹھ کے دروازہ کھولے ایک بار پھر دستک سنائی دی۔ نصیب گل کے ساتھ اس کا بیٹا بھی گیا۔

دروازہ کھولا تو سامنے حضرت شاہ کو پایا۔ جس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ میں جب گھر پہنچا تو بی بی نے پوچھا کہاں سے آ رہا ہوں، میں نے تمہارا نام لیا تو اُس نے کہا، جب آ رہے تھے تو بیٹی کو بھی ساتھ لیتے آتے جو دو ڈھائی گھنٹے سے بھائی نصیب گل کی بیٹی سے ملنے گئی ہے۔

اب تو درد مشترک نکلا۔ دونوں نے اس کے بعد دروازے پر ہی کھڑے کھڑے اپنی اپنی فکر و پریشانی کا ایک دوسرے کے سامنے اظہار کیا۔ حجرے میں آ کر بیٹھے اور ایک دوسرے کی تسلی کے لئے یہ طے پایا کہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بچیوں کے اسکول کی جتنی دوست ہیں ان کے یہاں جا کر معلوم کیا جائے۔ کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گی۔ نصیب گل مسلسل اپنے بیٹے کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا جس کے کہنے بلکہ اصرار کرنے پر اس نے بیٹی کو اسکول میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔

بیٹے کے اندر بھی لمحہ بھر کے لئے باپ کا لہو دوڑتا مگر پھر عقل غالب آ جاتی.... حجرے میں بیٹھنے کے باوجود کوئی ادھر اُدھر کی بات کرنے کے بجائے تینوں خاموش تھے پھر نصیب گل نے اپنے بیٹے کے ذمہ یہ کام لگایا کہ اسکول کی ماسٹرانی کے گھر کا پتا کرے بیٹے کو اِس مشن پر لگا کر دونوں دوست بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے اِس دوران میں جب ایک دوسرے سے نظریں ملتیں تو اُن میں یہی سوال ہوتا کہ ہماری بیٹیاں کہاں ہونگی اور کب تک

آ جائیں گی۔ وقت کے پاؤں گھڑی کی سوئیوں نے تھام لئے تھے۔ وہ اپنی رفتار سے گذر رہا تھا مگر حجرے میں بیٹھے دونوں دوستوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید تھم گیا ہے یا رینگ رینگ کر گزر رہا ہے۔
جب مسجد سے عصر کی اذان سنی تو اور بے چینی بڑھی اب تک کہیں سے کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ نصیب گل اور حضرت شاہ دونوں اس ارادے سے اُٹھے کہ نماز کے بعد ماسٹرانی کا پتا معلوم ہو چکا ہوگا اس لئے وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر اسکول ٹیچر کے گھر جائیں گے اور ان تمام بچیوں کے پتے حاصل کریں گے جو ہماری بیٹیوں کے ساتھ پڑھتی ہیں۔ بے شک رسوائی اور بدنامی کا داغ تو لگ جائے گا لیکن بیٹیاں تو مل جائیں گی۔
نصیب گل کو نماز میں بھی یکسوئی حاصل نہیں ہوسکی دھیان بیٹی کی طرف ہی لگا رہا۔ نماز کے بعد آج بھی پیش امام نے دھماکوں میں مرنے والوں کی مغفرت اور زخمی ہونے والوں کی جلد صحت یابی کے لئے اجتماعی دعا کرائی کہ آج سرکاری طور پر سوگ کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ نصیب گل یہ دعا مانگتا رہا کہ 'پرور دگارا مارا بیٹی جلدی گھر آ جائے'... مسجد سے نکل کر وہ حضرت شاہ کے ساتھ پروگرام کے مطابق بیٹی کی استانی کے پاس جانا چاہتا تھا مگر حضرت شاہ نے مشورہ دیا کہ رسوائی کو گھر گھر پہنچانے سے پہلے ایک دفعہ اور اپنے گھر جا کر دیکھ لیں۔ شاید آ ہی گئی ہوں۔

نصیب گل کو بیٹی کی گمشدگی کے ساتھ اب یہ فکر بھی ستانے لگی تھی کہ بات پھیل گئی تو برادری میں بلکہ سارے قبیلے میں کیا عزت رہ جائے گی، مال کا نقصان تو دیر سویر پورا ہو جائے گا مگر عزت جو پامال ہوئی ہے، وہ کیسے بحال ہوگی۔؟؟ وہ سر نہوڑائے ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے حضرت شاہ کے ساتھ چل رہا تھا کہ بیٹا تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ بیٹے کی تیز رفتاری دیکھ کر نصیب گل یہ سمجھا کہ بیٹی گھر آ گئی ہے اور حضرت شاہ نے جانا کہ اسکول کی ماسٹرانی کے گھر کا پتا معلوم ہو گیا ہے۔ جس تیزی سے بیٹا اِن کی طرف آ رہا تھا اُسی تیزی سے دونوں قدم بڑھاتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے اور اِس سے پہلے کہ کوئی سوال کیا جائے اُس نے کہا۔
'چار استانیاں اور بہت سی لڑکیاں مسمار شدہ اسکول کو دیکھنے گئی ہیں'
کیا اُن میں ہماری بیٹیاں بھی شامل ہیں۔؟ یہ سوال کئے بغیر نصیب گل اور حضرت شاہ بھی اسکول کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چل پڑے..... جب وہ تباہ شدہ اسکول کی عمارت کے قریب پہنچے تو نصیب گل اور حضرت شاہ نے اپنی بیٹیوں کو پہچان لیا.... پہلے تو چاہا بے اختیار ہو کر انھیں آواز دیں مگر جب یہ دیکھا کہ وہاں موجود اور بھی لڑکیاں نہایت انہماک اور تندھی کے ساتھ ایک ایک اینٹ اُٹھا کر چار دیواری کے آثار پر اِس طرح رکھ رہی ہیں جیسے کتاب کے ورق اُلٹ رہی ہوں یا کوئی فریضہ ادا کر رہی ہوں.... تو نصیب گل کو ایسا لگا جیسے یہ بچیاں اینٹیں نہیں چن رہی ہیں بلکہ دہشت گردی کا جواب دے رہی ہیں۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

عورت

بارش بے حد تیز ہوچکی تھی وہ لحاف میں دبکی ہوئی لیٹی تھی اسے نہ موسلا دھار بارش کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ بادلوں کی گرج ۔ ہاں کبھی کبھی آسمانی بجلی کی چمک اس کے کمرے کے ٹوٹے ہوئے روشندان سے اندر داخل ہوکر پورے کمرے کو جگمگا دیتی اور اسکی روشنی لحاف کے ان حصّوں سے جہاں جہاں سے روئی ہٹ کر صرف کپڑا رہ گیا تھا ایک لحظہ کے لئے اندر آجاتی تو وہ چونک سی جاتی ۔

اس کے کانوں میں تو اس کے باپ کی آوازیں آرہی تھیں جو اسکی ماں کو روئی کی طرح دُھن رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔ ''یہ روز کا معمول تھا جب تک ابّا کو پان، سگریٹ اور جوئے کے لئے پیسے ملتے رہتے سب کچھ ٹھیک رہتا اور جب ماں پیسے دینے کو منع کرتی تو یہی سب ہوتا...... ''اس نے لحاف کے اندر لیٹے لیٹے سوچا۔ اس کا دل چاہتا باپ کو گھر سے نکال دے ۔ اس کو اپنے باپ سے نفرت سی ہونے لگی تھی ۔ ایک دفعہ وہ اس کی ماں کو مار رہا تھا۔ اس سے دیکھا نہیں گیا تھا وہ بیچ میں آگئی اور رو رو کر کہنے لگی تھی ۔

''ابّا مت مارو میری ماں کو'' تو باپ نے ماں کو چھوڑ کر اسکو مارنا شروع کر دیا تھا۔

اس دن ماں نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور سختی سے بولی تھی ''دیکھ ارشد میں تجھے سمجھائے دیتی ہوں ۔ میرے دونوں بچّوں کی طرف کبھی نظر مت ڈالنا ، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' اور ابّا بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔''

اس نے لحاف سے منہ باہر نکالا ، ماں اپنے آنسو پونچھتی جا رہی تھی کمرے کی چھت جہاں جہاں سے ٹپک رہی تھی اس کے نیچے بالٹی رکھ رہی تھی ۔ وہ آہستہ سے لحاف کے اندر ہوگئی.....تھوڑی دیر بعد ماں چپ چاپ سے آکر اسکے اور بھائی کے بیچ میں لیٹ گئی ۔

صبح جب آنکھ کھلی ، بارش تھم چکی تھی ، ٹوٹے ہوئے روشندان سے اندر آتی ہوئی سنہری دھوپ کی کرنیں کمرے میں روشنی پھیلا رہی تھیں صغرا جلدی جلدی ناشتہ بنا رہی تھی ۔ صغرا کو دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے رات کچھ ہوا ہی نہ تھا زینی اسکول جانے کے لئے اٹھی اور بھائی کو کندھے سے ہلاتے ہوئے بولی:

''ثاقب ۔ اٹھ جلدی اسکول کو دیر ہو رہی'' ۔ ثاقب آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''زینی بیٹا آج سارے اسکول بند ہیں، پورا شہر تالاب بنا ہوا ہے'' ماں بولی۔

زینب کو پیار سے سب زینی بلاتے تھے بلکہ بہت سے لوگ تو اسکے ''زینب'' نام سے واقف ہی نہیں تھے۔

'' تو ماں آج تم بھی کام پر نہیں جاؤ گی ۔؟'' زینی نے خوشی سے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

''غزالہ بیگم صاحبہ میرا انتظار کر رہی ہونگی ، دوسرے گھروں میں جاؤں یا نہ جاؤں انکے گھر ضرور جاؤنگی ۔ وہ ہمیشہ وقت بے وقت میری مدد کرتی ہیں، تمہاری اسکول کی فیس یا کتابوں وغیرہ کے لئے جب بھی میں نے ان سے پیسے مانگے کبھی انہوں نے منع نہیں کیا..............وہ میرا انتظار کر رہی ہونگی ۔ مجھے جانا ہوگا۔'' صغرا نے کہا

غزالہ بیگم کے نام کے ساتھ ہی زینی کی نگاہوں کے سامنے ان کا بڑا سا گھر آگیا اور خاص طور پر ان کا ڈرائنگ روم ۔۔۔۔۔۔ بڑا سا ہال اس میں سرخ ، ہرے ، پیلے بیل بوٹے والا قالین ، دبیز صوفے ، ریشمی سر سراتے ہوئے پردے ، قیمتی گل دان ، دیواروں پر آویزاں بڑی بڑی پینٹنگز ۔۔۔ اس دن اس کے اسکول کی چھٹّی تھی ، وہ ماں کے ساتھ غزالہ بیگم کے گھر چلی گئی تھی غزالہ بیگم کے پاس مہمان آئے ہوئے تھے ۔ ماں نے چائے کی ٹرے دے کر اسے بھیجا تھا۔ وہ جیسے ہی چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی اسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نرم و گداز چیز کے اندر اس کا پیر دھنس گیا ہو پھر اس کی نظر خوبصورت سجے سجائے بڑے سے ہال نما کمرے پر پڑی تھوڑی دیر کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی جنّت میں آگئی ہو۔''

''زینی کیا سوچ رہی ہے'' ماں اسے دیکھتے ہوئے بولی ۔ ماں کی آواز کے ساتھ ہی اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی ۔

'' ماں ہمارا گھر غزالہ بیگم صاحبہ کی طرح کیوں نہیں ہے'' اس نے بڑی معصومیت سے ماں سے پوچھا۔

''ارے پگلی ! وہ امیر لوگ ہیں ۔ غزالہ بیگم صاحبہ کے شوہر ایک امریکی کمپنی میں بہت بڑے افسر ہیں ہم کہاں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں'' ماں نے پیار سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔ اور مزید ہدایت دیتے ہوئے بولی۔

''اچھّا سنو! تم اور ثاقب ناشتہ کر کے پڑھنے بیٹھ جانا۔ اندر سے کنڈی بند رکھنا۔ کسی کے لئے بھی نہیں کھولنا'' وہ جب بھی باہر جاتی اسی طرح تاکید کر کے جاتی ۔ زینی نے دروازے کی کنڈی لگائی اور خیالات میں کھو گئی ۔

''کتنی ہمّت اور صبر والی ہے میری ماں ۔۔۔ رات کو اس پر کیا کچھ گزرا لیکن صبح اٹھ کر وہ اس طرح کام میں لگ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ناشتہ تیار کیا۔ ابّا کو ناشتہ کرایا اور اب خود کام پر جا رہی ہے ۔ اور ابّا کمرے میں بستر پر لیٹا سگریٹ کے کش لگا رہا ہے۔ ۔۔۔ آخر ابّا کوئی کام کاج کیوں نہیں کرتا ۔؟ سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے ۔ سگریٹ پیتا رہتا ہے ، پان چباتا رہتا ہے اور جیسے ہی شام کے پانچ بجے وہ میاں جی کے ہوٹل ، جوئے خانے کا رخ کرتا ہے ۔ اور اگر اس کو جانے میں دیر ہو جاتی ہے تو اکرم چاچا بلانے آجاتے ہیں ۔ اور وہ ان کے ساتھ چلا جاتا ہے ۔ آدھی رات تک جوا کھیلتا رہتا ہے ۔ ابّا جوئے میں ہار کر آتا ، تب بھی ماں کو مارتا ، اور جوا کھیلنے کے لئے پیسے چاہئے ہوتے اور ماں نہ دیتی تب بھی ماں کی شامت آتی اور ماں سے خدمت الگ لیتا۔''

وہ یہ بھی سوچتی ''کہ اگر میاں جی کا ہوٹل ہمارے گھر کے پاس نہ ہوتا تو شاید ابّا بھی کوئی کام کاج کر لیتا۔ کم از کم اس کو جوئے کی لت تو نہ پڑتی ۔ میاں جی دیکھنے میں تو بڑے شریف نظر آتے ہیں ۔ لوگوں میں بھی ان کی بڑی عزّت ہے ۔ اللہ والے بھی بہت ہیں ، اذان ہوتے ہی سامنے مسجد میں نماز پڑھنے پہنچ جاتے ہیں پھر۔۔۔

انہوں نے یہ جوئے کا اڈّہ کیوں کھول رکھا ہے۔اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔۔۔اور ماں۔۔۔۔ابّا کے کتنے ظلم وستم سہتی ہے مگر ابّا کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتی۔۔۔کہتی ہے مرد تو سر کی چھت ہوتا ہے کیا ہوا جو مارتا ہے، محبت بھی تو کرتا ہے۔''

''آپی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' ثاقب کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔ وہ اٹھی خود بھی ناشتہ کیا اور ثاقب کو بھی ناشتہ کرایا ۔اور پھر اپنے کورس کی کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔زینی بہت محنت کرتی تھی، ہمیشہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔فرسٹ وہ اس لئے نہیں آسکتی تھی کہ فرسٹ تو ارم کو ہی آنا ہوتا تھا۔وہ امیر ماں باپ کی بیٹی جو تھی۔اور پھر اس کے پاپا اسکول کے سر پرستِ اعلیٰ بھی تھے۔زینی اور ارم کے نمبروں میں اکثر ایک دو نمبر کا ہی فرق ہوتا تھا زینی اپنے بھائی ثاقب کو بھی بہت محنت سے پڑھاتی تھی۔ثاقب خود بھی بہت محنت کرتا تھا۔دونوں بھائی بہن زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی لگن میں مصروف تھے۔

آج کا سورج زینی کے لئے خوشی کا پیغام لے کر آیا تھا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جس میں میٹرک کا نتیجہ درج تھا۔زینی کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔۔۔اور صغرا۔۔۔وہ تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔۔۔۔بار بار زینی کو لپٹاتی ،اس کی پیشانی چومتی۔صغرا نے مٹھائی لا کر اپنے خاص خاص لوگوں میں تقسیم کی اور میاں جی کے پاس تو وہ خود لے کر گئی تھی۔وہ محلّے کے مُکھیا جو تھے۔میاں جی نے زینی کو بڑی شاباش بھجوائی اور صغرا کی بہت تعریف کی کہ یہ سب اس کی محنت اور تربیت کا نتیجہ ہے۔صغرا نے ہوٹل کے دونوں ملازموں فیضو اور امیر علی کو بھی مٹھائی دی۔

اس بستی کی یہ پہلی لڑکی تھی جس نے میٹرک پاس کیا تھا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ورنہ بستی میں تو اب تک کسی لڑکے نے بھی میٹرک تک نہیں پڑھا تھا۔

''صغرا بی بی اب زینی کے ہاتھ پیلے کر دو'' میاں جی نے لڈّو منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''میاں جی میرا ارادہ زینی کو آگے پڑھانے کا ہے ، وہ بھی آگے پڑھنا چاہتی ہے ،آپ ہمارے لئے دعا کریں،آپ اللہ والے ہیں''

صغرا بولی۔

زینی چار پائی پر بیٹھی بڑے شوق وانہماک سے فرسٹ ایئر کی کتابیں دیکھ رہی تھی جو اس نے کسی سے مستعار لی تھیں۔ارشد نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا ''یہ اب کیا پڑھنے لگی ہے۔میٹرک کر لیا کافی ہے۔اب کچھ گھر گرہستی سیکھ لے۔'' زینی خاموش رہی۔مگر صغرا بولی۔''ابھی سے پڑھائی شروع کرے گی تب ہی تو اچّھے نمبر حاصل کرے گی۔''

''بس بس بہت ہو گئی پڑھائی وڑھائی اب اس کا بیاہ کرنا ہے۔وہ چکّی والا سیٹھ ہے نا اس نے مانگا ہے تیری بیٹی کو۔'' ارشد بولا

''وہ۔۔۔وہ کرم دین'' ۔صغرا کے منہ سے ایک دم نکلا۔

''ہاں ہاں وہی سیٹھ کرم دین۔نکڑ پر جس کی چکّی ہے۔'' ارشد نے جواب دیا

''اس کو شرم نہیں آتی۔۔۔۔دو بیویاں پہلے سے موجود ہیں اب تیسری کرنے جا رہا ہے اور اس کی عمر دیکھی ہے تم نے۔'' صغرا غصہ سے سرخ ہو گئی۔''

''مرد کی صورت اور عمر کون دیکھتا ہے۔اور تجھے اس سے کیا۔تیری بیٹی کو عیش سے رکھے گا۔یہ دیکھ اس نے پہلے ہی پچیس ہزار روپئے دیئے ہیں تاکہ ہم شادی کا انتظام کر سکیں۔'' ارشد نے صغرا کو نوٹوں کی گڈیاں دکھاتے ہوئے کہا صغرا نے ہاتھ بڑھا کر وہ نوٹوں کی گڈیاں لینے کی کوشش کی مگر ارشد نے صغرا کو دھکا دیا،نوٹوں کی گڈّیاں واسکوٹ کی جیب میں رکھیں اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

زینی بظاہر اپنی کورس کی کتابیں الٹ پلٹ کر رہی تھی مگر اس کا دل اور کان ماں باپ کی گفتگو کی جانب لگے ہوئے تھے۔۔۔ وہ تیزی سے اٹھی اور فرش پر گری ہوئی ماں کو اٹھایا جو باپ کے دھکّا دینے سے گر پڑی تھی۔

صغرا تھوڑی دیر تک گم سم بیٹھی رہی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔؟غم وغصّہ کی اس کیفیت کے دوران اچانک اس کو غزالہ بیگم کے الفاظ یاد آئے۔

''صغرا کبھی کوئی پریشانی ہو تو سیدھی میرے پاس آجانا۔میرا تعلق ''خواتین کے حقوق کی تنظیم'' سے ہے۔میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گی۔ یہ سوسائٹی عورتوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔کسی بھی عورت کیساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہو تو یہ تنظیم اس کی مدد کرتی ہے۔'' غزالہ بیگم نے صغرا کو سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ صغرا کا شوہر اسے مارتا پیٹتا رہتا ہے اگر چہ وہ منہ سے کبھی کچھ نہیں کہتی ۔انہوں نے یہ بات اس لئے بھی کہی تھی کہ صغرا اپنے آپ کو بے بس اور بے سہارا نہ سمجھے۔

صغرا خاموشی سے اٹھی اور برقعہ اوڑھ کر باہر چلی گئی۔جاتے جاتے ہمیشہ کی طرح تاکید کر کے گئی''دروازہ اندر سے بند کر لینا۔''

غزالہ بیگم کے بنگلے سے واپس آنے والی صغرا اس قدر بدلی ہوئی تھی کہ اس کی اس تبدیلی کو اس کے بچوں نے بھی محسوس کر لیا۔اسکا چہرہ زبردست قوتِ ارادی کا آئینہ بنا ہوا تھا۔اس نے اپنے شوہر یا بچوں سے بھی کوئی خاص بات نہیں کی۔

رات گزر گئی، اگلا دن طلوع ہوا ، صغرا نے حسبِ معمول روز کے کام نمٹائے ، ناشتہ بنایا ، لیکن بات چیت کسی سے نہیں کی۔۔۔ ناشتے کے دوران ارشد بہت خوش تھا۔سیٹھ کرم دین کے پیسوں سے رات اس نے خوب جوا کھیلا تھا اور جوئے میں ہارا بھی تھا لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔؟ رقم خاصی تھی۔۔۔بچے ہوئے پیسوں سے وہ زینی کے ہاتھ پیلے کر سکتا تھا ،کچھ کمی بیشی ہوئی تو اس کی ماں قرض لے کر بھگتا دے گی۔

اچانک خلافِ معمول دروازے کی زنجیر زور زور سے بجنے لگی۔باہر کوئی ارشد کے نام کی آوازیں لگا رہا تھا۔ارشد نے چائے کی پیالی پاس بیٹھی ہوئی صغرا کے ہاتھ میں تھمائی اور دروازے کی طرف دوڑ گیا۔باہر کچھ لوگ کھڑے تھے ان کے درمیان سیٹھ کرم دین بھی موجود تھا۔ لیکن کچھ ڈرا ڈرا سا اور خفیف خفیف مجرموں کی طرح کھڑا تھا ۔ارشد ابھی کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''تمہارا نام ارشد ہے۔۔۔؟''

''ہاں مگر آپ لوگ ۔۔؟ ''ارشد نے حیرت اور تعجب کے ملے جلے لہجے میں سوال کیا۔

''ہم لوگ ' خواتین کے حقوق کی تنظیم' سے آئے ہیں۔تم اپنی بیٹی کو اس آدمی کے ہاتھ بیچ رہے ہو ،وہ بھی اس کی اور اس کی ماں کی مرضی کے خلاف۔'' اس نے کرم دین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''خواتین کے حقوق کا تحفظ ہمارا فرض ہے۔ہم لوگ تمہیں اور اس سیٹھ کو جیل بھی بھجوا سکتے ہیں ۔'' وہ ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کچی آبادی کے بہت سارے لوگ اکٹھا ہو گئے ۔ میاں جی کو اطلاع ملی تو وہ بھی پہنچ گئے ۔ویسے بھی اس بستی کے چھوٹے بڑے تمام جھگڑے میاں جی ہی نمٹاتے تھے۔سب ان کے فیصلوں کو مانتے بھی تھے۔میاں جی نے 'خواتین کے حقوق کی تنظیم'' کی طرف سے آئے ہوئے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔۔۔؟ مگر ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ معاملے کا تعلق جس سے ہے صرف اسی سے بات کرنا ہے۔

ارشد سر جھکائے کھڑا تھا۔

''سیٹھ کے پیسے واپس کرو۔'' وہی آدمی ارشد سے مخاطب ہوا۔

ارشد اندر گیا اور نوٹوں کی گڈی لا کر اسی آدمی کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

'' یہ تو بیس ہزار ہیں۔''اس نے نوٹ گننے کے بعد کہا۔

''پانچ ہزار خرچ ہو گئے ہیں۔''ارشد آہستگی سے بولا۔

''خرچ ہوئے ہیں یا جوئے میں اڑا دیئے ہیں۔بیٹی کو بیچتے شرم نہیں آئی۔۔۔۔''

اگرچہ ''خواتین کے حقوق کی تنظیم'' کی طرف سے آنے والے تقریباً آٹھ لوگ تھے مگر بات صرف ایک آدمی ہی کر رہا تھا۔اس نے سیٹھ کرم دین کو پیسے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ رکھو، بیس ہزار ہیں، پانچ ہزار تمہیں بعد میں مل جائیں گے ۔'' اور پھر ارشد کی طرف دیکھ کر بولا

''یہ پانچ ہزار جلد ادا کرنے کی کوشش کرنا۔اور اگر آئندہ اپنی بیٹی کی شادی اس کی یا اس کی ماں کی مرضی کے خلاف کرنے کی کوشش کی تو سیدھی جیل کی ہوا کھاؤ گے۔''

''خواتین کے حقوق کی تنظیم'' کے لوگوں کے جانے کے بعد میاں جی نے ارشد اور سیٹھ کرم دین کو اپنے ہوٹل بلوا بھیجا۔دونوں کو خوب ڈانٹا پھٹکارا۔۔۔ اور کرم دین کو اس کی چکی پر پولیس کا چھاپہ پڑوانے تک کی دھمکی دی۔ دونوں نے بہت معافی مانگی اور بڑی مِنت سماجت کی کہ آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔کوئی بھی معاملہ آپ کے علم میں لائے بغیر نہیں ہوگا۔

ارشد نے پھر کبھی شادی کی بات نہیں کی۔صغرا کو مارنا چھوڑا تو نہیں لیکن کم ضرور کر دیا۔یہ اور بات تھی کہ جب کبھی اس کا جوا کھیلنے کو جی چاہتا اور پیسے نہ ہوتے ،صغرا مانگنے پر بھی پیسے نہ دیتی تو وہ اپنے آپ پر قابو بونہ رکھ پاتا اور اسی پرانے ڈھرے پر آ جاتا۔

''ثاقب آٹھویں کلاس میں آ گیا ہے اور زینی کالج کے پہلے سال میں دونوں کی تعلیم کا خرچ اور اوپر سے یہ پانچ ہزار کا قرض کیسے ادا کرونگی۔۔۔۔؟''صغرا پہلے تو دل میں سوچتی رہی پھر بلند آواز میں خود سے مخاطب ہوگئی ۔

'' سوچا تھا کمیٹی نکلے گی تو بچوں کے کپڑے بنواؤنگی اور کچھ پیسے ان کی پڑھائی کے لئے اٹھا کر رکھ لونگی مگر اب یہ پانچ ہزار کا قرضہ بھی سر پر آن پڑا ہے۔۔۔۔غزالہ بیگم سے اب پیسے مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔انہوں نے دونوں بچوں کی پڑھائی کے سلسلے میں میری بہت مدد کی ہے۔''

زینی پاس ہی بیٹھی تھی ۔ صغرا کی ساری باتیں سن رہی تھی جو وہ سرگوشی جیسے انداز میں خود سے کہہ رہی تھی۔

''ماں تم فکر مت کرو۔میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹیوشن بھی کرونگی تمہیں اب کسی سے پیسے لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی'' زینی نے صغرا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر واقعی زینی نے جو کہا تھا کر دکھایا۔۔۔۔وہ صبح کالج جاتی۔کالج سے آنے کے بعد ٹیوشن میں جُٹ جاتی۔ اور پھر رات دیر تک اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی۔

وقت کا پرندہ پرّ پھیلائے اپنی اُڑان میں مصروف تھا۔لیکن وقت کیسے گزر رہا تھا یہ تو صغرا اور زینی ہی جانتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ زینی نے بی۔اے بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا تھا۔سلطانہ بیگم نے اپنے شوہر کی سفارش سے زینی کو ایک بینک میں ملازمت دلوادی۔کچھ عرصے بعد زینی نے بینک سے لون لے کر شہر میں ایک اچھی جگہ چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا۔اور اس میں ضرورت کی کچھ چیزیں خرید کر ڈال دیں تا کہ اس میں رہا جا سکے ۔ثاقب بی۔کام کرنے میں مصروف تھا۔دونوں بھائی بہنوں میں زبردست ذہنی رفاقت تھی۔دونوں ہی زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔دونوں بھائی بہن اس آبادی کے ماحول سے نکلنا چاہتے تھے۔

ایک دن زینی نے ماں کا اچھا موڈ دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ماں کیوں نہ ہم اپنے فلیٹ میں چل کر رہیں۔''

''یہ جگہ ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں ساری برادری یہیں پر ہے۔''صغرا نے کہا۔

''ماں چھوڑنے کو کون کہہ رہا ہے۔ہم لوگ آتے جاتے رہیں گے۔'' ثاقب نے ماں کو راضی کرنے کی کوشش کی۔

کافی دنوں تک صغرا اس بات پر راضی نہیں ہوئی کہ وہ یہ بستی چھوڑ کر کہیں اور بسّ جائے۔لیکن آہستہ آہستہ دونوں بھائی بہنوں نے مل کر صغرا کو راضی کر ہی لیا۔

''ماں ٹیکسی آ گئی ہے '' ثاقب نے کہا۔

سارا سامان ٹیکسی میں رکھا گیا۔سب لوگ چلنے کے لئے تیار ہو گئے ۔ارشد بھی اپنا بیگ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے آ گیا۔

''ماں یہ ابّا کہاں جا رہے ہیں۔'' زینی باپ کی طرف دیکھ کر بولی۔

''جہاں ہم جا رہے ہیں۔''صغرا نے جواب دیا۔

'' ابّا ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے۔یہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے۔'' زینی نے پہلی مرتبہ باپ کے لئے ایسے

الفاظ استعمال کئے۔

’’کیا کہا۔۔۔؟ یہ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے۔۔۔۔۔؟ یہ تیرا باپ ہے۔اس کے نام کے ساتھ تیرا نام جڑا ہوا ہے۔یہ ہمارے سر کی چھت ہے۔‘‘صغرا نے پہلی مرتبہ اپنی ناز و نعم میں پالی ہوئی لڑکی پر تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔

ارشد نے صغرا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا’’ یہ ٹھیک کہتی ہے ۔‘‘ اور سر جھکائے ہوئے اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔اس نے محسوس کیا اس کی بیوی زینی اور ثاقب سے جھگڑ رہی ہے۔ آوازوں نے یہ بتا دیا تھا کہ بچے اسکو ساتھ نہ لے جانے پر اٹل تھے۔وہ شاید یہی کہہ رہے تھے۔

’’ابا نے ہمارے لئے کیا ہی کیا ہے۔۔۔ان کو ہم سے کوئی مطلب نہیں۔ان کو اپنے دوستوں سے۔۔۔اپنے جوئے سے مطلب ہے۔۔۔ ہم بھی ابا سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔۔۔۔ماں۔۔تم ہمارے ساتھ چلو۔‘‘

بالآخر آوازیں بند ہو گئیں۔۔۔۔تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی کے روانہ ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔۔۔۔۔پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ سنّاٹے نے ارشد کے پورے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اکیلا پڑ گیا تھا۔۔۔ بالکل اکیلا۔۔۔۔اکیلا پڑنا کیا ہوتا ہے اس کا انکشاف آج اس کے پورے وجود کو ہلائے دے رہا تھا۔۔۔میاں جی کا ہوٹل ۔۔۔میاں جی ۔۔۔فیضو اور کرم دین۔۔۔اسکا دوست اکرم ۔۔۔اس کے دوسرے دوست جن کے ساتھ وہ جوا کھیلتا تھا۔۔۔یہ اس کے کوئی نہ تھے۔اس کے اپنے بچے۔۔۔ اس کی بیوی ۔۔۔جو اس کی طویل زندگی میں اسکی ساتھی تھی۔۔۔اس کی بیوی۔۔۔جو اس کی حاجت روا تھی۔۔۔اسکے ہر اچھے برے حکم کے آگے سر جھکانے والی۔۔۔گھر گھر چاکری کر کے اسکا اور بچوں کا پیٹ پالنے والی۔۔۔جوا کھیلنے کے لئے پیسے مہیّا کرنے والی۔۔۔اور ۔۔۔اور اس کی مار کھا کر بھی اس کی خدمت کرنے والی۔۔۔وہ بھی اس کی کوئی نہ تھی۔۔۔اس کا کوئی نہ تھا آسمان کے نیچے، زمین کے اوپر وہ اکیلا تھا۔۔۔ اس اکیلے پن پر اسے رونا آ گیا ۔۔۔پہلے آنکھوں میں آنسو آئے۔۔۔پھر گریہ اندر سے ابھرا۔۔۔۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔ اس کا سارا وجود رونے میں اس طرح مصروف تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ صغرا کب بچوں کو رخصت کر کے گھر کے اندر آئی۔۔۔دونوں بچوں کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر ان کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہوئی۔۔۔۔گھر کے اندر داخل ہو کر اس نے دروازے کی کنڈی لگائی ، اپنے روتے، سسکیاں لیتے شوہر کو دیکھا، کچھ دیر کھڑی رہی، پھر جھکی۔۔۔ جھک کر اپنے شوہر کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔۔۔اس کے شوہر کا بدن کانپا۔۔۔وہ تھوڑا سا اوپر اٹھ کر اس کی بانہوں میں سمٹ گیا۔۔۔ جیسے بچہ اپنی ماں کی گود میں سما جاتا ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال (کینڈا)

خوشبو کا سفر

پھر کچھ ہی دیر میں وہ لمحہ آ گیا جب وقت فنا ہو کر محض ایک کسیلی یاد کی شکل میں تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہونے والا تھا، بس ایک مسلے ہوئے پھول کی خوشبو تھی جو زمین و آسمان کے درمیان پھنسے ہوئے اُس بھاری بھرکم لمحے سے جان چھڑا کر بادلوں کے اوٹ آ چھپی تھی اور اب ایک انجان سی خواہش لیے آخری بار بغداد کی گلیوں اور بازاروں پر نظر ڈال رہی تھی جہاں ایک فاقہ زدہ صوفی کو سولی پر چڑھایا جانے والا تھا۔

بغداد کی گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کے ہجوم وحشتوں کی عبائیں پہنے جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔اُن کے ذہن خالی اور سینے نفرتوں سے بھرے ہوئے تھے ۔اُن کے ہاتھوں میں نوکیلے پتھر اور ہونٹوں پر منصور الحلاج کا نام تھا۔زخم خوردہ منصور الحلاج، جس کا بدن تلوار کے دستوں کی ضربوں سے خون آلود تھا، جس کی بے ہنگم کٹی ہوئی داڑھی کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے پر چانٹوں کے نشان تھے۔جو کئی دنوں کا فاقہ زدہ تھا اور جس کی پسلیوں پر جلد کی جگہ محض ایک جھلی سی رہ گئی تھی۔جوں جوں وہ ایک شکنجے میں جکڑ کر بیچ بازار میں لایا جانے لگا عشق الٰہی سے منور فضاء اُس کے کلام سے مہکنے لگی۔۔

یکسو کر دیا مجھے اس (ذات) واحد نے سچی توحید کے زریعے
سالک کے لیے اُس تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں
میں حق ہوں اور حق، حق کے ساتھ حق ہے
اس کی ذات سے منسلک ہونے کے بعد فراق ممکن نہیں۔۔

اور پھر نوکدار پتھروں کی ضربوں سے منصور کا بدن لہولہان کیا جانے لگا مگر وہ دیوانگی عشق میں سرمست صوفی، تختہ دار کو دیکھ کر مسکرانے لگا مگر اس سے قبل کہ اُس کے لہو سے دار کی لکڑی سُرخ ہو جاتی، ایک پھول شبلی کی دبی ہوئی مُٹھی سے نکلا اور منصور الحلاج کے ذخم خوردہ بدن کو معطر کرتا ہوا ہجوم کے قدموں تلے رُندتا چلا گیا۔ پھر جونہی منصور الحلاج کا سر قطع کر کے جسم کو نظر آتش کیا گیا اور اُس کی راکھ راس المنارہ سے ہوا میں بکھیری گئی تو وہ بغداد کی گلی کوچوں میں سوگوار سی اُڑتی ہوئی چند لمحوں کے لیے جنید بغدادی کی قبر کی دھول سے آملی اور پھر وہاں موجود بایزید بسطامی اور ابوسعید ابوالخیر کے چڑھائے ہوئے پھولوں کی خوشبوؤں کو اپنے اندر بسا کر زمین و آسمان کے اُس مشکل لمحے سے دامن چھڑانے لگی مگر پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے بادلوں کے اوٹ چھپی خوشبو سے

آ کر مل گئی اور پھر وقت کے طویل مگر انجانے سفر میں شامل ہوگئی۔

لاہور کی پُر رونق گلیوں اور بازاروں میں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھی۔ بلاول گنج مارکیٹ کی گلیوں میں صوفیانہ کلام کی مہک کسی انجانے اندیشے سے اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ شام کا وقت آنے والی صبح کی سلامتی کے لیے بابا داتا گنج بخش کے مزار پر نذرانوں کے پھول چڑھانے کو بے تاب تھا۔ دیوانگیِ عشق میں سرمست صوفی فقیر اللہ ہو اللہ ہو کا وِرد کرتے ہوئے گلیوں میں ناچ رہے تھے اور فضاء حضرت محی الدین چشتی کے کلام سے مہک رہی تھی۔۔

گنج بخش فیض عالم، مظہر نورِ خدا　　ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را راہنما

پھولوں سے لدے ٹھیلوں و خوانچوں اور مزار پر چڑھانے والی چادروں کی دوکانوں پر زائرین کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بابا داتا گنج بخش کے مزار کا طویل کشادہ صحن صوفیانہ کلام کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں، مرد، امیر، فقیر سبھی فرش پر زانوں ہوئے عبادت الٰہی میں مشغول تھے۔ لمحہ بہ لمحہ کلام الٰہی کا وِرد جاری و ساری تھا، دربار میں اجتماعی دُعا کی خاطر لوگ اپنی صفیں درست کر رہے تھے کہ اچانک مزار کے سبز گنبد اور صحن میں پھرتے پر سکون کبوتر کسی نادیدہ اندیشے کو پا کر خوفزدہ ہو کر ایک ساتھ پھڑ پھڑا کر اُڑنے لگے۔

اور پھر بلاول گنج مارکیٹ کی گلیوں میں تین سائے وحشتوں کی عبائیں پہنے جنگلی جانوروں کی طرح انسانی لہو سے اپنی پیاس بجھانے نمودار ہوئے۔ اُن کے ذہن خالی اور سینوں میں نفرتیں تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں گرنیڈ اور خودکُش دھماکوں کی جیکٹس اور ہونٹوں پر حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کا نام تھا۔ کچھ ہی دیر میں اللہ کے ذکر میں مصروف عبادت گزار اجتمائی دُعا کے خاطر قطار در قطار صف بندی کرنے لگے اور دربار میں جمعرات کی جمعرات حاضری لگانے والا محمد منشاء خود کے لیے دُعائیں مانگنے کے بجائے ذکر اذکار میں مشغول زائرین پر عطر اور خوشبو پھینکنے لگا کہ اچانک اُس کے ہاتھوں میں دبے عطردان سے نکلی خوشبو زندہ انسانوں کے بجائے مردہ انسانی گوشت کے لوتھڑوں کو معطر کرنے لگی۔ داتا دربار کے پہلو میں دھماکے سے اُنکے سرہانے درج مرکز تجلیات انسانی لہو سے بھیگ کر رنگین ہونے لگا اور مزار شریف کا سبز گنبد کبوتروں اور انسانی خون کے لوتھڑوں میں رنگ کر سُرخ گنبد میں بدلنے لگا۔ مزار کے فرش پر عبادت گزاروں کا خون اور اعضاء ہر طرف بکھرنے لگے اور پھر کلام الٰہی کا وِرد اور صوفیانہ کلام کی مہک دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی آوازوں میں بدلتی چلی گئی۔

محمد منشاء کے ہاتھوں میں دبے عطردان کی خوشبو انسانی گوشت کے لوتھڑوں اور بکھرے ہوئے اعضاء کو معطر کر کے کچھ دیر تو یونہی لاہور کے گلی کوچوں میں سوگوار اڑتی رہی اور پھر کچھ ہی لمحوں میں مزار شریف پر خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت معین الدین چشتی اور بابا فرید الدین شکر گنج کے چڑھائے ہوئے پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر بسا کر زمین و آسمان کے اُس مشکل لمحے سے دامن چھڑانے لگی جہاں وقت بارود کے دھماکوں سے فنا ہو کر پھر سے ایک کڑوی کسیلی یاد کی شکل میں تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہو گیا تھا، مگر پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے بادلوں کے اوٹ چھپی خوشبو سے آ کر مل گئی اور ایک بار پھر وقت کے طویل مگر انجانے سفر میں شامل ہوگئی۔

ڈاکٹر بلند اقبال

ملاپ

علی کی پلکوں پر ٹھہرا ہوا آنسو کچھ دیر تک تو لرزتا اور کانپتا رہا مگر پھر جونہی فاطمہ کی نمکین مسکراہٹ اُس سے بہہ کر علی کے دل میں جذب ہوئی تو پھر وہ اپنا وجود اُس کی پلکوں پر مزید نہ سمیٹ سکا اور بے بس و مجبور ہو کر اُس کے سامنے پڑی ہوئی مرمت طلب گھڑی پر بکھرتا چلا گیا اور پل بھر میں اُس میں جڑے ہوئے گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیوں کو کچھ اس طرح بھگو گیا کہ وہ اپنے مرکز پر اُلٹے رخ میں گھومنے لگیں۔۔۔ دھیمے دھیمے گھڑی کی ٹِک ٹِک علی کی دھڑکنوں کی دَھک دَھک سے ہم آہنگ ہونے لگیں اور وقت چند سال پیچھے تیرتا چلا گیا۔

'چاندنی چوک میں اُس رات علی کی آنکھوں میں پورا چاند اُتر آیا تھا جس رات فاطمہ اُس کی دوکان پر اپنی پُرانی گھڑی کی مرمت کے خاطر آئی تھی۔ سیاہ اُوڑھنی میں ٹکے ہوئے گوٹے کناروں کے ستارے فاطمہ کے چاند جیسے مکھڑے کو گھیرے ہوئے آسمان کے تاروں سے زیادہ اِترا رہے تھے۔ فاطمہ کے گلابی رخسار اُس کی آوارہ زُلف کی چھیڑ خانی سے ڈوبتے اُفق سے زیادہ دہک رہے تھے۔ فاطمہ کے کالے کالے نینوں میں اُترتا علی کا عکس بے اختیار اُس کے دل کی دھڑکن بن کر علی کے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ فاطمہ کے گالوں کے ڈمپل بھی علی کی بے بس صورت کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا رہے تھے کہ اچانک فاطمہ نے شوق نگاہوں سے علی کی کھوئی کھوئی آنکھوں کے سامنے اپنی چوڑیوں بھری کلائی ہلا کر کہا تھا۔ ''سنیئے زرا ہماری گھڑی ٹھیک کر دیجیے، یہ چلتے چلتے رُک جاتی ہے'' اور پھر علی کے ایک لفظ 'جی' کو اُس کے دل سے ہونٹوں تک آنے میں صدیوں کا فاصلہ طے کرنا پڑ گیا تھا۔ اُسے لمحے بھر کے لیے یوں لگا تھا جیسے اُس کے دل کی دھڑکنیں جو فاطمہ کی گھڑی کی رُکی ہوئی سویوں سے ملتے ہی رُک گئی تھیں اُس کی چوڑیوں کی جھنکار سُن کر گہری نیند سے یکا یک جاگ کر سرپٹ دوڑنے لگی ہو۔۔ فاطمہ کے دوکان سے جاتے ہی علی دیر تک آسمان پر چاند کو تکتا رہا اور کچھ دیر تک تو اندر ہی اندر اپنی بے چارگی پر روتا رہا تھا مگر پھر جونہی مدینہ مسجد کی محرابوں سے نکل کر عشاء کی آذان کی آواز جو علی کی دوکان میں گونجنے لگی تو علی نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کچھ اس طرح صدقِ دل سے اپنے رب کے حضور دُعا کی کہ اُس کی دُعا قبولیت کی اعلیٰ منزلوں کو چھوتے ہوئے فاطمہ کے دل میں علی کا پیار بن کر دھڑکنے لگی اور پھر فاطمہ کو بھی گھر جاتے جاتے کچھ لمحوں میں یوں لگا جیسے آج وہ گھڑی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا سارا وقت بھی علی کو دے آئی ہے۔'

پھر علی نے دونوں پلکوں کو دھیمے سے پپوٹوں پر بھینچا اور اپنی بھیگی ہوئی پلکوں کو جھپک کر میز پر پڑی فاطمہ کی گھڑی کو تکنے لگا جس کی گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں واپس اپنے مدار کے گرد گھوم کر اپنی اصلی

حالت کی طرف لوٹ گئی تھیں۔علی نے چارمنہ کے پیچ کش کے سرے کو آہستگی سے مرکزی پیچ میں پھنسایا اور اسکرو کو دھیمے دھیمے اُلٹے رک پر گھمانے لگا۔کچھ ہی دیر میں گھڑی کی سوئیاں متحرک ہونے لگی مگر باوجود کوشش کے وہ اپنے مرکز پر گھومنے کے بجائے ،بس چپ چاپ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کانپتی رہی۔علی کو یوں لگا جیسے وقت، اپنی تمام توانائیاں خرچ کر کے بھی آگے بڑھنے سے قاصر ہے۔۔علی نے پپوٹوں کو دوبارہ بھینچ کر پتلیوں کو سمیٹا اور گھڑی کی کانپتی ہوئی سوئیوں کے پیچھے اپنے اور فاطمہ کے دھندلے سے امیج کو دیکھنے لگا جو بڑی ہی عاجزی سے دونوں ہاتھ باندھے سارے سنسار سے اپنے ملن کی بھیک مانگ رہے تھے۔۔۔

'چاندنی چوک میں اُس رات علی کی دوکان پر اُس کا اور فاطمہ کا سارا کنبہ جمع تھا۔علی مجرموں کی طرح سر جھکائے زمین کو تک رہا تھا اور فاطمہ سرخ انگارہ آنکھوں سے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔غروبِ مغرب کا وقت مدینہ مسجد کی مہرابوں کی ختم ہوتی ہوئی سُنی آذان کی گونج اور امام بارگاہ سے شروع ہونے والی شیعہ آذان کی آواز کے درمیانے وقفے میں پھنسا ہوا کانپ رہا تھا۔علی اور فاطمہ کے باپ بیک وقت ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے علی و فاطمہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔۔'سُنی شیعہ فرقوں کا یہ فرق محض آذانوں کی گونجوں کے درمیان کے منٹ اور سیکنڈ کا فرق نہیں ہے بلکہ صدیوں کے فاصلے کا فرق ہے'۔علی نے بھرائی آنکھوں کے ساتھ زمین سے نظریں اُٹھا کر اپنی گھڑی پر ڈالی مگر پتلیوں کے سامنے آئے ہوئے آنسوؤں کی وجہ سے اُسے یوں لگا جیسے گھڑی کی تینوں سوئیاں اُس کے آنسوؤں میں تیر کر صدیوں پرانے رُکے ہوئے وقت پر آ کر ٹھیر گئی ہیں۔پھر علی نے جونہی گھڑی سے نظریں اُٹھا کر آس پاس دیکھا تو اُسے لگا جیسے چاندنی چوک کا پر رونق بازار اچانک کچی پکی اینٹوں کے بنے چبوتروں اور دیواروں میں ڈھل گیا ہو جس میں چاروں جانب عرب کی ریگستانی دھول اُڑ رہی ہو اور اُس کے کنبہ کے سارے لوگ لمبی لمبی عبائیں پہنے ایک دوسرے پر تلواریں تانے خونخوار نظروں سے اُسے اور ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔علی کو یوں لگا جیسے چاندنی چوک اچانک چودہ سو سال پرانے مدینہ کے بازار میں بدل گیا ہو اور اُسکی دوکان سقیفہ بنی ساعدہ والی وہ بیٹھک بن گئی ہو جہاں اُس کی شادی کی بات کی جگہ شائد خلافت کے حصول کا پہلا جھگڑا ہونے والا ہے۔علی نے ڈوبتے دل کے ساتھ اپنی دونوں آنکھوں سے آنسو پونچھ دیے اور ایک بار پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا مگر اُس کی گھڑی کی سوئیاں ابھی بھی اُسی جگہ ٹھیری ہوئی تھیں۔علی نے بے بس نگاہوں سے اپنے کنبہ کے لوگوں کو دیکھا اور پھر فاطمہ کی طرف ایک ڈوبتی امید سے نظر ڈالی۔اچانک فاطمہ کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ اپنی جگہ سے دھیرے سے اُٹھی اور میز پر دھری ہوئی اپنی رُکی ہوئی گھڑی اُٹھا کر لائی اور علی کی گود میں ڈال دی۔علی نے پلک جھپک کر گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی اور حیران نگاہوں سے گھنٹے منٹ اور سیکنڈ کی سوئیوں کو دیکھنے لگا جس کا رُکا ہوا وقت اُس کی گھڑی کے ٹھیرے ہوئے وقت سے پہلے کا تھا۔اچانک علی اپنی جگہ سے اُٹھا اور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے اور فاطمہ کے کنبہ سے مخاطب ہو کر کہا ۔۔تم لوگوں کو پتہ ہے محمد ﷺ نے علی اور فاطمہ کی شادی کیوں کی تھی؟ تا کہ اُن کی امت کے درمیاں کبھی بھی دراڑ نہ آئے۔۔کیا تم لوگ اُن کی خواہش پوری نہ کرو گے؟

اقبال حسن آزاد (مونگیر)

بندوبست

چشم زدن میں اس نے اپنا بوسیدہ جمپر اتارا اور اپنی دونوں ٹانگوں کو پھیلا کر جمپر کو ران کے بیچوں بیچ رکھ کر یوں رگڑا جیسے کچھ پونچھ رہی ہو۔ پھر اس نے جمپر کو الگنی پر ٹانگ دیا اور پیڑ کی طرح سیدھی کھڑی ہوگئی۔ وہ مادر زاد برہنہ تھی۔آنگن میں بلب روشن تھا جس کی روشنی میں اس کا آبنوسی بدن چمک رہا تھا۔شوکت کی نگاہیں اس کے ننگے بدن پر الجھ کر رہ گئیں۔اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔اس کا پائجامہ کہاں گیا؟ فلیٹ میں اس وقت اور کون ہے؟ گلبدن کہاں گئی؟ جمال کہاں ہے؟ طرح طرح کے سوالات شوکت کے ذہن میں ڈنک مارنے لگے ۔پھر اسے خیال آیا......اس کے پستان اتنے بھاری کیونکر ہو گئے؟ کیا اس میں دودھ بھر گیا ہے؟ اور اس کا پیٹ آگے کو نکلتا ہوا کیوں دکھائی دے رہا ہے؟ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ کل تک تو چڈی پہن کر سڑک پر دوڑتی پھرتی تھی۔دکان سے سودا سلف لاتی رہتی تھی یا اپنے فلیٹ کے دروازے پر بیٹھ کر اپنی کالی سوکھی ٹانگوں کو بار بار کھجلاتی جاتی اور اپنے میلے الجھے بالوں میں جوئیں تلاش کرتی پھرتی تھی۔

شوکت کی نگاہیں اس کے چمچماتے سیاہ بدن پر پڑیں جس سے پسینہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ اسے نہیں دیکھ پائے گی کیونکہ وہ اجالے میں تھی اور یہ اندھیرے میں۔ وہ نیچے تھی یہ اوپر تھا۔اس کی نگاہیں اپنے جسم کو نہار رہی تھیں اور اِس کی نگاہیں اُس کے جسم کو۔

وہ ہینڈ پمپ سے پانی بھر رہی تھی۔کیا وہ اس وقت نہائے گی؟ رات کے نو بجے اسے غسل کی حاجت کیوں ہوئی؟ کیا اسے بہت زیادہ گرمی لگ رہی ہے؟ یا کوئی اور بات ہے؟ کیا اس وقت فلیٹ میں گلبدن کا شوہر جمال موجود ہے؟ اس نے پھر سوچا۔گلبدن کہاں ہے؟ کہیں گھومنے گئی ہے؟ پکچر یا کہیں اور؟ کیا گلبدن کو یہ سب دکھائی نہیں دیتا؟ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی لڑکی کو شوہر کے ساتھ گھر میں اکیلا چھوڑ کر اکثر غائب رہتی ہے۔ نوکری کرتی ہے، گھر کا خرچ چلاتی ہے اور جمال پڑا پڑا عیش کرتا ہے۔شادی کو دس سال ہو چکے تھے مگر گلبدن کی گود اب تک سونی تھی۔اس نے اپنے پیسوں سے ایک جنرل اسٹور کھولا تھا مگر جمال اپنی آرام طلبی کے باعث اسے چلا نہیں پایا۔گلبدن کی نظر میں اس کی قیمت دو کوڑی بھر بھی نہیں تھی۔ اکثر وہ جمال کو زور زور سے ڈانٹتی۔شوکت اپنے برآمدے کی کھڑکی سے اس کے آنگن میں جھانکا کرتا۔اس کھڑکی پر ایک دبیز پردہ پڑا تھا مگر جب کبھی ہوا بند

ہو جاتی یا مخالف سمت میں چلنے لگتی تو اس پردے کو کنارے کر دیا جاتا۔ جب تک اس کی بیوی زہرہ جبیں گھر میں موجود رہتی وہ نیچے آنگن میں کھلنے والی کھڑکی کی جانب سے بے نیاز رہتا، مگر جیوں ہی زہرہ کسی کام سے باہر جاتی، وہ موقع پا کر گلبدن کے آنگن میں جھانکنے لگتا۔ اکثر اسے گلبدن دکھائی دے جاتی۔ کبھی وہ غسل خانے سے نکل رہی ہوتی۔ کبھی کچن میں مشغول ہوتی یا پھر آفس جانے کی تیاری کر رہی ہوتی اور جمال کسی زر خرید غلام کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا اور یہ لونڈیا، جس کا نام سبزہ تھا، کوئی سات آٹھ برس کی تھی جب پہلے پہل اس گھر میں آئی تھی۔ وحشت زدہ سی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھتی پھرتی۔ چلا چلا کر بات کرتی۔ اسے باتھ روم سے وحشت ہوتی تھی۔ صبح سویرے گھر کے پاس والے میدان میں فارغ ہو آتی۔ کبھی کبھی صرف فراک پہنے ہوتی۔ بار بار چڈی اتارنے کی زحمت کون مول لے؟ مگر جب گلی کے لونڈے اس کے گھر کا چکر لگانے لگے تو گلبدن نے ٹھوک ٹھاک کر اسے قاعدے کا بنایا اور اس کا باہر نکلنا بند کر دیا۔

آنگن سے ملحق باتھ روم تھا مگر سبزہ کو آنگن میں بیٹھ کر ننگے بدن نہانا پسند تھا اور اسے اس کی آزادی بھی حاصل تھی۔ گلبدن تو آفس چلی جاتی اور جمال کہیں اور نکل جاتا۔ وہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کرتی اور آرام سے آنگن میں بیٹھ کر اپنے کالے بدن کو رگڑ رگڑ کر اجلا کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اس حقیقت سے بے نیاز کہ کوئی اسے مسلسل گھورے جا رہا ہے اور اس کے بدن کے تمام زاویوں کو اپنی نگاہوں کے فیتے سے ناپ رہا ہے۔

یہ دو منزلہ مکان شوکت کا تھا۔ فرسٹ فلور پر وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور گراؤنڈ فلور پر گلبدن کرایہ دار تھی۔ گراؤنڈ فلور پر ہی اگلے حصے میں شوکت نے ایک سائبر کیفے کھول رکھا تھا جس میں کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر بھی تھا۔ اس سائبر کیفے میں پانچ ملازم تھے، ایک منیجر بھی تھا۔ شوکت بیشتر اوقات کاؤنٹر پر بیٹھتا مگر گاہے گاہے اوپر فلیٹ میں آ جاتا۔ ایک دن گرمی سے پریشان ہو کر اس نے پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ وہ نہ صرف عریاں ہو کر نہا رہی تھی بلکہ اپنے نو خیز بدن سے کھیل بھی رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر مگن تھی کہ شوکت کی جلتی ہوئی نگاہوں کو وہ محسوس ہی نہ کر سکی۔ پہلے پہل تو اسے حیرت ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بچی کو اپنے جسم کا گیان کیونکر حاصل ہو گیا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ خود لذیت ایک آفاقی سچ ہے۔ پیدا ہونے والے ہر بچے میں تجسس کا مادہ ہوتا ہے۔ اور اس کا تجسس جسم کی بھول بھلیوں سے شروع ہو کر جسم کے چکر ویو میں ختم ہو جاتا ہے۔

شوکت نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بجنے جا رہے تھے۔ زہرہ بچوں کو لے کر گرمی کی چھٹیاں منانے میکے گئی تھی۔ کاش! یہ لڑکی جمال کے بجائے اس کی نوکرانی ہوتی اور پھر..... اس خیال کے آتے ہی اس کے سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ مگر زہرہ نے آج تک کسی Maid Servant کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ وہ اس قدر سگھڑ تھی کہ گھر کی ایک ایک ضرورت کو خود سمیٹ لیتی۔ وہ زہرہ کا موازنہ گلبدن سے کرتا تو اسے یک گونہ خوشی حاصل ہوتی۔ مگر اس وقت زہرہ گھر پر نہ تھی۔ ایسے میں اگر چھم سے وہ آ جائے تو کیا ہو؟ مگر سبزہ کا خیال آتے ہی اس کا تیزی کے ساتھ اُبھرتا ہوا بدن بھی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس نے چپکے سے آنگن میں جھانک کر دیکھا۔ وہ نہا کر جا چکی تھی مگر اس کا جمپر الگنی پر ٹنگا ہلکی ہلکی ہوا میں ہلکورے بھر رہا تھا۔ شوکت کے جسم میں چنگاریاں دوڑ رہی تھیں۔ اگر اس

وقت زہرہ گھر پر ہوتی تو..... وہ روز اسے فون کرتا، اسے جلد از جلد واپس آنے کو کہتا مگر اس کا ایک جواب ہوتا۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہوں۔ بچوں کا بھی دل لگ رہا ہے۔'' پھر وہ دھیرے دھیرے سے ہنس دیتی۔ شوکت کو اس کی ہنسی سن کر جلترنگ بجنے کا احساس ہوتا۔ زہرہ کا بدن ابھی تک وینا کے تاروں کی طرح کسا ہوا تھا۔ وہ رسیور کا بوسہ لیتا ادھر سے آواز آتی۔

''اگر اتنی ہی بے چینی ہو رہی ہے تو انٹرنیٹ پر 'کچھ' دیکھ کر دل بہلا لیجئے' یا پھر 'جے سنتوشی ماں' کا سی ڈی' وہ جھنجھلا جاتا اور رسیور کو کریڈل پر پٹک دیتا۔

جمال سے اس کے تعلقات نہیں کے برابر تھے، البتہ گلبدن اس سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آتی اور اسے نوشے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی مگر جب زہرہ موجود ہوتی تو تو بس آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کر کے چلی جاتی، لیکن اس وقت تو سبزہ اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ اگر جمال نے اسے راستے پر لگا دیا ہے تو پھر اسے راہ پر لانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ مگر اس بے وقوف نے احتیاط کیوں نہ برتی؟ آج کل تو فیملی پلاننگ کے بے شمار طریقے رائج ہیں۔ لگتا ہے سب کچھ اچانک ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں فلیٹ میں ہوں، گلبدن آفس گئی ہو۔ دوپہر کا وقت ہو اور وہ بغیر چڈی پہنے سو رہی ہو۔ نیند کے عالم میں اس کی فراک جگہ سے ہٹ گئی ہو۔ جمال کی نظر اس پر پڑی ہو اور وہ پھر خود پر قابو نہ رکھ سکا ہو۔ ایسے ہیجانی مرحلے میں سوچنے سمجھنے اور احتیاط برتنے کا موقع کہاں ملتا ہے اور وہ بے چاری بن ماں کی بچی...... اپنے گاؤں سے دور..... اس فلیٹ کی چہار دیواری میں قید.... جمال نے اسے دھمکایا ہو کہ یہ بات کسی کو نہ بتانا اور وہ مارے ڈر کے چپ رہ گئی ہو اور پھر یہ کھیل روز کا معمول بن گیا ہو۔ مگر گلبدن کی نگاہیں اس کے بدن میں ہو رہی تبدیلیوں کو کیوں نہیں محسوس کر رہی ہیں؟ کیا وہ اپنے جاب میں اس قدر مشغول ہے کہ اسے ان سب باتوں کی جانب دھیان کا موقع ہی نہیں ملتا؟ وہ اکثر جمال کو دیکھتا۔ نماز کے وقت سر پر ٹوپی ڈالے مسجد کی طرف جا رہا ہوتا۔ کیا جمال پر اس کا شک بے جا ہے؟ دیکھنے میں تو بہت سیدھا سادہ، شریف اور بے ضرر سا انسان معلوم ہوتا ہے۔ بیوی کی کمائی کھانے والے یوں بھی دبّو ہوتے ہیں۔ اس کے اندر اتنی ہمت کہاں سے پیدا ہو گئی۔ اگر گلبدن کو اس کی بھنک بھی مل گئی تو شاید وہ جمال کو دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دے۔ تو پھر وہ کون ہو سکتا ہے؟ سبزہ تو اب فلیٹ سے باہر نکلتی نہیں ہے اور اگر کبھی باہر جاتی بھی ہے تو گلبدن کے ساتھ اور پھر یہ بھی ہے کہ باہر کا کوئی شخص شاذ و نادر ہی ان کے یہاں آتا ہے۔ تو کیا اسے کوئی مرض لاحق ہو گیا ہے؟ کوئی ایسا مرض جس میں پیٹ پھول جاتا ہو۔ لیکن اس کے پستان؟

اس نے فلیٹ کو تالا لگایا اور نیچے اتر آیا۔ سڑک پر چہل پہل کم ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ جمال اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے صرف لنگی اور گنجی پہن رکھی تھی۔ شوکت نے سوچا۔ کیا اس نے ابھی سبزہ کے ساتھ قربت فرمائی ہے؟ کیا وہ ابھی غسل نہیں کرے گا؟ وہ اس وقت دروازے پر کھڑا کس کا انتظار کر رہا ہے؟ جمال کی نظر اس پر پڑی تو وہ جلدی سے گھر کے اندر گھس گیا اور دروازہ بھی اس نے اندر سے بند کر لیا۔ اسے لگا جیسے جمال اس سے نظریں چرا رہا ہو۔ پھر وہ اپنے سائبر کیفے میں داخل ہوا اور دن بھر کے حساب کتاب میں منہمک ہو گیا۔

ملازم ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ حساب کتاب کرنے کے بعد اس نے شٹر گرایا اور تالا لگا کر سیدھا کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک رکشہ آ کر رکا اور اس سے گلبدن اترتی دکھائی دی۔ چماچم کپڑوں میں ملبوس، خوشبوؤں میں بسی ہوئی، ایک ہاتھ میں بیگ جھلاتی ہوئی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو گلبدن نے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ وہ پوچھ بیٹھا۔

''کہاں سے آرہی ہیں؟''

''ایک کولیگ کے بیٹے کا Reception تھا۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور ایک قاتل نگاہ اس پر ڈالی۔

''جمال کو ساتھ لے کر نہیں گئیں؟''

''نہیں اگر انہیں لے جاتی تو پھر سبزہ کو بھی لے جانا پڑتا۔ میز بان کیا سوچتا کہ دعوت تو ایک کو دی اور یہاں پورا کا پورا گھر اٹھ کر چلا آیا۔'' وہ اٹھلا کر بولی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے کے اندر قلابازی کھا گیا ہو۔ ہے ہے کیا انداز ہے، کیا ادا ہے، دل کرتا ہے کے دل میں بسا کر رکھ لیں۔ اس نے چاہا کہ گلبدن کو لڈ ڈرنک کی دعوت دے اور اپنے فلیٹ پر لے جا کر......مگر وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہ جٹا سکا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس پر اپنے شک کا اظہار کر دے اور کہہ دے کہ اپنے سیدھے سادے نظر آنے والے شوہر پر نگاہ رکھے۔ اور اس فتنہ ساماں کے جسم میں ہو رہی تبدیلیوں کو محسوس کرے۔ مگر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کبھی کسی کی شکایت اس کے اپنوں سے نہیں کرنی چاہئے....خواہ بات سچ ہی کیوں نہ ہو اور اگر کہیں جمال بے قصور نکلا تو......؟ دونوں کی بظاہر ٹھیک ٹھاک زندگی میں طوفان آ جائے گا۔ اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پالتو شوہر کو تو کچھ نہ کہے مگر اس بے سائبان لڑکی کو گھر سے نکال کر زمانے کی سونامی لہروں کے حوالے کر دے۔

گلبدن نے جاتے جاتے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں بھی کمپیوٹر سیکھنا چاہتی ہوں''

''شوق سے....میں خود سکھاؤں گا۔''

''نہیں آپ سے نہیں سیکھوں گی۔''

''کیوں؟'' شوکت کا سوال سن کر وہ دھیرے سے ہنسی۔ پھر اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''آپ بہت بدمعاش ہیں۔'' اور اس کی جانب پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ شوکت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سوچا کہ گلبدن ٹھیک ہی کہتی ہے۔ جب تک کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ بدمعاشی نہیں کرتا وہ اسے بدمعاش ہی سمجھتی ہے۔

گلبدن جا چکی تھی، مگر اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی خوشبو اب بھی اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھی۔ اسے جمال کی قسمت پر رشک آیا۔ گورا بند، کالا بدن، پختہ بدن، نوخیز بدن، گداز بدن، چھریرا بدن، راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ اس نے بے خیالی میں اپنی قسمت ٹھونکی اور مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ رات اس نے تلپھٹے میں کاٹی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو گلبدن کی ٹانگوں ک درمیان پاتا۔ کبھی اپنے آپ کو سبزہ کے پستانوں پر ٹکا ہوا پاتا اور کبھی زہرہ کا مرمریں جسم اسے اپنے بدن سے لپٹا ہوا محسوس ہوتا۔ پھر اسے لگا کہ

اس کا سارا جسم پگھلتا جا رہا ہے اور وہ سرتاپا سیال میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اسے بڑی گرمی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے وہ دودھ سے بھری کوئی کیتلی ہو اور تیز آنچ پر کھولتے کھولتے دودھ اچانک پتیلی سے باہر ابل پڑا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بجلی گل تھی اور چہار جانب تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے شدت کے ساتھ اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر برآمدے میں نکل پڑا اور گلبدن کے آنگن میں کھلنے والی کھڑکی پر سے پردہ ہٹایا تا کہ ہوا آ سکے۔ اسے آنگن میں روشنی دکھائی دی اور ساتھ ساتھ کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دیں گویا کوئی قے کر رہا ہو۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آنگن کے ایک کونے میں لالٹین رکھی تھی اور نالی کے کنارے سبزہ اپنا سینہ تھامے بیٹھی تھی۔ اس کا پورا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ شوکت کے دل میں بیک وقت ہمدردی اور افسوس کے جذبات پیدا ہوئے۔ وہ بے سہارا لڑکی اس وقت اسے بہت مظلوم دکھائی دے رہی تھی۔ سبزہ کو ایک زور کی ابکائی آئی اور شوکت کا دل کانپ اُٹھا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس کا دل الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور بستر پر جا کر لیٹ رہا مگر اب نینداس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی لیٹا رہا۔ کوئی تین بجے کے قریب بجلی آئی تو اس کی آنکھ جھپک گئی۔ پھر اس نے ایک عجیب سا خواب خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہے مگر آئینے میں اس کے عکس کی جگہ ایک لومڑی دکھائی دے رہی تھی جس کے منہ سے لار ٹپک رہی تھی۔ اس کا جی متلانے لگا، پھر وہ لومڑی زور سے ہنسی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے آپ کو بری طرح گھبرایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

چند روز یوں ہی گزر گئے۔ زہری جبیں اب تک لوٹی نہ تھی۔ گلبدن بھی کئی روز سے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اس نے کئی بار اس کے آنگن میں جھانک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے صرف سناٹا نظر آیا۔ البتہ کچھ آوازیں سنائی دے جاتیں جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ گھر میں لوگ ہیں۔ انہی دنوں اسے اپنے آپ میں عجیب سے تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ گلبدن کے آنگن میں جھانکنے والی اپنی عادت پر اسے خفت ہونے لگی اور اس نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ شوکت دن کے دس بجے کسی کام کے سلسلے میں اپنے دوست ساحل کے پاس جا رہا تھا۔ راستے میں اسے سگریٹ کی طلب ہوئی تو اس نے ایک اسٹال کے پاس اپنا اسکوٹر روک دیا۔ اسٹال کے سامنے ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کی پیشانی پر سوریا کلینک، کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ اس کلینک میں فیملی پلاننگ کے جملہ طریقوں کے ساتھ ساتھ Safe Abortion کی بھی سہولت تھی۔ وہ سگریٹ سلگا کر مڑا تو کلینک سے گلبدن نکلتی دکھائی دی۔ وہ سبزہ کا ہاتھ تھامے ہوئی تھی۔ سبزہ کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی عذاب میں مبتلا ہو۔ گلبدن اسے سہارا دے کر پاس کھڑے رکشے تک لے گئی اور بدقت تمام اسے رکشے پر سوار کر کے خود بھی اس پر بیٹھ گئی۔ شوکت سمجھ گیا کہ بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ اسی لمحے گلبدن کی نظر شوکت پر پڑی۔ گلبدن نے نظریں چرالیں۔ اس رات بھی شوکت کو ٹھیک طور پر نیند نہ آ سکی۔ ذرا سی آنکھ لگتی تو اسے سبزہ کا بھیانک چہرہ نظر آتا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ خون کا قے کرتی نظر آتی۔ پھر اسے سبزہ کے قریب ایک سایہ نظر آیا۔ سبزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے خون آلود قے کو سمیٹا اور اس سائے کے چہرے پر مل دیا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک نہ گلبدن نظر آئی نہ سبزہ۔ جمال کو اکثر وہ اسی ہوٹل میں دیکھتا جہاں آجکل وہ خود کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے جمال سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلبدن سبزہ کو لے کر کہیں چلی گئی ہے۔

چند روز اور گزر گئے۔ ایک دن شام سات بجے وہ اپنی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ گلبدن رکشے سے اترتی دکھائی دی۔ بجلی حسب معمول غائب تھی۔ اور آس پاس کے گھروں کی دیواروں پر جنریٹر کی روشنی سے جلنے والے Indicator فضا میں پھیلی ہوئی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ گلبدن ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ گیارہ بارہ سال کی بڑی بڑی آنکھوں والی ایک معصوم سی لڑکی بھی تھی جو حیران حیران سی چاروں طرف نظریں گھما کر نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک پھول دار جمپر پہن رکھا تھا جس پر ہلکا سا اُبھار دکھائی دے رہا تھا۔ شوکت کو دیکھ کر گلبدن نے اسے سلام کیا۔ شوکت پوچھ بیٹھا۔

''کہاں گئی تھیں؟''

''گاؤں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی خاص بات؟''

''ہاں...سبزہ کا بندوبست کرنے گئی تھی۔''

'''کیسا بندوبست؟''

''سیانی ہوگئی ہے۔ اسے اس کے ماموں کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ کچھ روپے بھی دے دیئے ہیں کہ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔''

''اوہ!'' شوکت کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی۔ چڑیا جمال کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

''اور یہ کون ہے؟'' اس نے گلبدن کے ساتھ آئی ہوئی نئی فاختہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

سبزہ کے ماموں کی لڑکی ہے۔ اب یہ یہیں رہے گی۔ کچھ یہاں کا بھی تو بندوبست کرنا تھا۔ اس کا باپ تو اسے یہاں بھیجنے پر راضی نہ ہو رہا تھا۔ جب میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی شادی کا بندوبست بھی میں ہی کر دوں گی، تب تیار ہوا۔''

اچانک جنریٹر بند ہو گیا اور ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ یہ سمجھ پانے سے قاصر تھا کہ چہار جانب پھیلی ہوئی تاریکی زیادہ گہری ہے یا گناہوں کی سیاہی۔ اسے گلبدن کے خوبصورت چہرے پر خون آلود قے کے چھینٹے دکھائی دے گئے۔ اس کا جی متلانے لگا اور قے کرنے کی شدید خواہش سے اس کے اعصاب تن گئے۔ مگر وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ قے کس کے منہ پر کرے....کس کے منہ پر؟

☆☆☆

طالب کشمیری (جموں)

آگ

''اوہو!......امتحان سر پر آ گئے ہیں اور یہ لوگ سکون سے پڑھنے بھی نہیں دیتے۔ اِدھر پتا جی بیمار ہیں اور اس شور وغل کی وجہ سے آرام بھی نہیں کر پا رہے ہیں اور اُدھر بھگوان کے یہ بھکت رات دن اتنی اونچی آواز سے لاؤڈ سپیکر چلاتے ہیں کہ کان پھٹنے کی نوبت آ جاتی ہے......اب ان لوگوں کو کون سمجھائے.....'' شنکر اپنے آپ سے بڑبڑایا اور اسکا برملا نا بجا بھی تھا، کیونکہ اسنے اور اسکے والد چرن داس نے کئی مرتبہ انکے گھر کے بالکل ملحق شِو مندر کے پجاری مہنت گوپال ترپاٹھی جی سے گذارش کی تھی کہ مندر کا لاؤڈ سپیکر روز صبح شام ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک ہی چلایا کریں تاکہ باقی وقت عام لوگوں کی معمول کی زندگی میں کوئی خلل نہ ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ہر بار مہنت جی کی جانب سے یہ روکھا جواب کہ ''تم لوگ کیا جانو بھجن، کیرتن کی مہما......ارچنا، آرادھنا کا مولیہ'' وغیرہ سنکر معاملہ ہمیشہ ٹلتا ہی گیا اور نہ صرف شنکر داس گھنٹوں بلکہ کبھی کبھی جگراتوں کے روز رات بھر اپنی پڑھائی پر توجہ مرکوز کرنے سے محروم رہا، اور اسکا والد کئی قسم کے امراض کے علاوہ اب Insomania یعنی نیند نہ آنے کی بیماری کا بھی شکار ہوا جسے اسکی حالت مزید ابتر ہوتی گئی۔

شنکر داس جو چرن داس کی چار اولاد میں اکلوتا بیٹا بڑی منتیں مانگ مانگ کے اور چادریں چڑھا چڑھا کر پیدا ہوا تھا، بہت ہی فرمانبردار، ہونہار اور سوجھ بوجھ والا لڑکا تھا اور دو برس قبل میٹرک کے امتحان میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہو کر پڑھائی کے میدان کئی مہارتھیوں کو پچھاڑ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ قابلیت پیدائشی سرمایہ ہوتی ہے نہ کہ پیدائش قابلیت کا سرچشمہ۔ اسے پوری امید تھی کہ بھگوان کی کرپا، ماں باپ کی دعاؤں اور سرکار کی جانب سے خصوصی مراعات.....ان تینوں کے طفیل وہ میڈیکل کالج میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ مندر کے لاؤڈ سپیکر پر سے وقت بے وقت سنائی دینے والی آواز اسکی پڑھائی میں یقیناً حائل ہو رہی تھی۔ چنانچہ اسی کا سد باب کرنے کی خاطر وہ محلے کے سب سے ذی وقار شخصیت بھگت صاحب سے رجوع ہونے انکی کوٹھی کی جانب چل دیا۔

دھیان چند بھگت اپنی پارٹی دِلت پیوپلز سنگھ کے امیدوار کی حیثیت سے ریاستی قانون سازیہ کے رکن کئی بار

رہ چکے تھے اور انکے حلقۂ انتخاب میں درگا واہنی دل کے برہم دت شرما ہی ایک ایسی شخصیت تھے جنہیں انکا واحد مد مقابل کہنے کا شرف حاصل تھا۔سیاسی داؤ پیچ کھیلنا بی۔ڈی۔شرما اور ڈی۔سی۔بھگت دونوں کا من پسند مشغلہ تھا اور چونکہ پچھلے چناؤ سے قبل تیس سال کے دوران انکے اس سیاسی کھیل میں اور کوئی مقامی باشندہ شامل نہیں ہوسکا تھا اسلئے اس حلقہ کے رائے دہندگان بڑی باقائدگی سے کبھی اِس کو تو کبھی اُس کو ایم۔ایل۔اے کی کرسی کیلئے چنتے رہتے تھے۔لیکن پچھلے الیکشن میں ایک نوجوان آزاد امیدوار چندر کرن نے ان دونوں آزمودہ سیاسی پہلوانوں کو چناؤ کے میدان میں کراری مات دیکر نہ صرف اس حلقہ میں ایک نئی تاریخ لکھ دی بلکہ انکے درمیان آپسی خفیہ گٹھ جوڑ کیلئے بھی راہ ہموار کی۔پر چندر کرن نے آنکڑوں کی جمع تفریق کا گہرا مطالع کیا اور زبردست سیاسی ''سوجھ بوجھ'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقتدار میں آنے والی جنتا جناردھن پارٹی سے ناطہ جوڑ کر یہ ثابت کر دیا کہ ''آزاد'' امیدوار کی حیثیت سے اسکا کامیاب ہونا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ چناؤ کے بعد وہ اپنی مرضی کے مطابق آزادی کے ساتھ کسی بھی سیاسی پارٹی میں شامل ہوسکتا ہے۔

تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد پرسنل سیکرٹری نے شنکر داس کو بھگت صاحب سے ملنے کی اجازت دیدی اور داخل ہوتے ہی اس نے نمستے کے ساتھ ساتھ انکے پیر چھوئے اور اپنا وہ مسئلہ بیان کر کے آخر میں التجا کی،

''جناب میری چھوٹی سی گذارش ہے کہ اگر آپ مندر کی انتظامیہ کمیٹی پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ہمیں اس مشکل سے نجات دلا دیں تو آپکی بہت مہربانی ہوگی......آپ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔''

''چھوٹی سی گذارش......؟؟ ارے یہ تو مذہب کی آزادی کا سوال ہے......تمہیں معلوم نہیں یہ ہمارے آئین کے بنیادی حقوق میں شامل ہے......اور پھر تو وہ بھگوان کا ہی نام لے رہے ہیں، شیطان کا تو نہیں......کون انہیں منع کر سکتا ہے۔تمہیں معلوم نہیں حزب اختلاف و اقتدار دونوں کے رہنما.....میرا مطلب وہی ڈی۔وی۔ڈی اور جنتا جناردھن پارٹی والے اس مسئلے کو کتنا اُچھال سکتے ہیں اور ہماری پارٹی یعنی ڈی۔پی۔ایس عوام کی سیوا کرنے کیلئے جس کرسی کو حاصل کرنے کی جی توڑ کر رہی ہے وہ ہم سے کوسوں دور بھاگ سکتی ہے......نا نا......ہم سے یہ کام نہیں ہوسکتا،'' بھگت صاحب نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جناب، آپ ہمارے لئے اتنا جوکھم کیوں اُٹھائیں گے جبکہ اگلا الیکشن ہونے تک بھی ابھی دو سال کا عرصہ ہے......خیر، میری روئداد سننے کیلئے آپکے قیمتی وقت میں سے جو پانچ منٹ برباد ہوئے اس کیلئے معافی چاہوں گا،'' اور شنکر جانے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا یہ سوچتے سوچتے کہ اب تک اس نے DVD کو Digital Video Disc اور DPS کو Delhi Public School کے نام سے ہی جانا تھا، پر یہ برہم دت کی درگا واہنی دل اور دھیان چند بھگت کی دِلت پیوپلز سنگھ اس معاملے میں کہاں سے آٹپک پڑے تھے، کیونکہ چناؤ ہوں یا نہ ہوں اسے سیاست میں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔بھگت صاحب شنکر کے طرزِ کلام اور بیبا کی سے متاثر ہوئے بِنا نہ رہ

سکے اور اسے دروازے سے ہی واپس بلالیا،''ارے او بچوا ! تنِک اِدھر تو آؤ.....ناراض ہو گئے کیا؟ تم بڑے کام کے آدمی لگتے ہو......تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''جی، انیس برس......بارہویں کلاس کا امتحان دینا ہے مجھے اب،'' شنکر نے سادگی سے جواب دیا۔

''کسی سیاسی پارٹی کے ممبر وغیرہ ہو کیا؟'' نیتا جی نے پوچھا۔

''نہیں جناب، ابھی تک تو پڑھائی ہی کرتا ہوں،'' شنکر بولا۔

''تو کیا ہوا.....ہمارے جتنے بھی بڑے بڑے نیتا ہوئے ہیں انہوں نے اسکول ، کالج کے دنوں سے ہی راج نیتی میں قدم رکھا تھا اور وہ دیکھو کیسے شکھر تک پہنچ گئے......سارا دیش، ساری دنیا انہیں یاد کرتی ہے۔تم بھی شکھر تک پہنچ سکتے ہو......تم ایک کام کرلو، تم ہماری پارٹی میں شامل ہو جاؤ.....ہاں، ہاں......مین پارٹی میں نہیں.....یوا دل میں،'' بھگت صاحب نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا۔

مرتا کیا نہ کرتا......سیاسی میدان میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود شنکر نے یہ سوچکر حامی بھر دی کہ چلو اگر لاؤڈ سپیکر کی مشکل سے چھٹکارا حاصل ہو تو کوئی برا سودا نہیں، پھر بھلے ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں ، نہ لیں کون کسے پوچھتا ہے۔

''ٹھیک ہے تو اب بتاؤ تمہاری سمسیا کیا ہے،'' بھگت صاحب نے ایسے پوچھا جیسے ابھی تک شنکر نے جو کچھ کہا وہ دیواروں کو سنایا تھا۔

''جناب وہی لاؤڈ سپیکر والی بات ،'' شنکر نے دہرایا۔

''اوہو!!.......یاد آیا۔میری ذہن میں ایک ترکیب ہے جس میں نہ کوئی جوکھم.....نہ کوئی جھنجھٹ......نہ کوئی جھمیلا۔نہ کسی کے پیر پکڑنے........نہ کسی کی منت سر پر لینی ،'' بھگت صاحب نے عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو بدقسمتی سے شنکر کی سمجھ میں نہ آیا۔

''کون سی ترکیب، جناب؟'' شنکر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''دیکھو تم ایک نوجوان ہو......تم میں ہمت ہے......حوصلہ ہے......ہے کہ نہیں؟ تم کسی بھی وقت جب موقعہ ملے خود مندر کے شکھر پر چڑھکر لاؤڈ سپیکر کا منہہ تھوڑا سا دوسری جانب گھماؤ اور معاملہ ختم۔اگر فی المثل کوئی اعتراض بھی کرے جسکے امکانات بہت کم ہیں تو ہم کس لئے بیٹھے ہیں یہاں......ہم سنبھالیں گے......آخر ساری عمر ہم نے جَن سیوا میں ہی تو بِتائی ہے،'' بھگت صاحب نے کہا۔

''مجھے لگ رہا ہے سر مجھ میں اتنی ہمت نہیں اور پھر وہاں پہنچنا بھی تو مشکل ہے،'' شنکر نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بچوا اس میں کوئی مشکل نہیں......وہ جو ساتھ میں پیپل کے پیڑ کی ایک مضبوط شاخ اسکے کلش تک

لٹکی ہوئی ہے اسی کے سہارے تم وہاں بڑی آسانی سے پہنچ سکتے ہو۔رہی ہمت کی بات ،تو تم نے نہیں سنا ہے......جہاں چاہ وہاں راہ.....راہ تو میں نے بتائی اب یہ تمہاری چاہ پر منحصر ہے ،'' بھگت صاحب نے کہا ، جس پر شنکر نے اپنی آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ،'' ٹھیک ہے جناب میں آج رات ہی کوشش کرتا ہوں...... لیکن اپنا وعدہ نہیں بھولئے گا.......کہیں کوئی بوال کھڑا ہوا تو سنبھال لیجئے گا۔''

اسکے رخصت ہونے کے بعد بھگت صاحب نے اکٹھے دو عدد چٹکیاں تمبا کو وکھینی کی دانتوں اور جبڑوں کے بیچ ٹھونس کر فون گھمایا،'' ہیلو.....کون؟..... بی۔ڈی جی؟..... ہاں، ہاں.....سب کشل منگل ہے......بس کرپا آپکی ہونی چاہئے۔بس کچھ نہیں.....ایک سوچنا آپکو دینا چاہتا تھا......نہیں نہیں، اس میں میرا ہی نہیں، ہم دونوں کا ہت ہوسکتا ہے......بس آپ پر دارومدار ہے آپ اپنی ڈی۔وی۔ڈی کا استعمال کس طرح سے کرسکیں گے۔ ہاں، ہاں......اصلی موضوع پر ہی آرہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ آج رات کسی بھی وقت کوئی سماج دشمن عنصر شومندر کے کلش پر سے سونے کا قیمتی چھتر چرانے کی کوشش کرے گا......کون ہوگا وہ شخص مجھے معلوم نہیں، لیکن سوچنا پکی ہے.......آگے کی رن نیتی آپ طے کیجئے۔وقت آنے پر میرا اور میری پارٹی کی طرف سے مکمل تعاون ملیگا، کیونکہ ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے........چندر کرن اور منزل بھی ایک ہی ہے........کرسی یعنی اقتدار۔''

فون رکھتے ہی برہم دت شرما نے جو پہلا کام کیا، وہ تھا اپنے چند نہایت ہی بھروسے دار اور جسمانی طور طاقتور کارکنوں کو طلب کرنا اور انہیں خفیہ طور سے مندر کے آس پاس چوکسی برتنے کی ہدایت کی۔ایک دو اُتاولے کارکن تو بانس کے لٹھ لے کے چل دئے۔رات کے آخری پہر پیپل کے پتوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی تو گھنشیام گرج کر بولا،'' ابے او.......! کون ہے تو؟ چھتر چرانے آیا ہے کیا......اترتا ہے یا میں تجھے اتار دوں، کمبخت.......''

دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آئی بلکہ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ٹہنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گر کر سیدھے ایک کارکن کے سر پر جا لگا جسے وہ گھبرا گیا اور چلانے لگا ،'' سالا......کتا کہیں کا.....پتھر مارتا ہے......ابھی مزہ چکھاتا ہوں تجھے، حرامزادے،'' اور اسی کے ساتھ ان سبھی نے بیچارے شنکر پر پتھروں کی بارش شروع کردی اور آناً فاناً اس مہم میں محلے کے کچھ باقی لوگ بھی شامل ہوگئے۔ چند شر پسند عناصر نے محلے کے گنے چنے گھروں کو ہی کیوں اور کس کی ایما پر نشانہ بنایا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا، لیکن پتھر بازی کا جواب پتھر بازی سے ہی دیا گیا۔ بڑے بوڑھوں اور ادھیڑ عمر کی عورتوں نے گالی گلوچ پر ہی اکتفا کیا۔ پیڑ پر تنہا اور نہتا شنکر چلاتا گیا،'' میں شنکر ہوں.....شنکر داس......چرن داس کا بیٹا.......میں کوئی چور نہیں.......میں لاؤڈ سپیکر.....،'' لیکن اس شوروغل میں اسکی کون سنتا۔ سبھی جیسے پاگل ہوگئے تھے اور ایسے پتھر برسا رہے تھے جیسے کسی بستی میں کوئی خونخوار جانور گھس آیا ہو۔اپنے حواریوں کی جانب سے اطلاع ملنے پر برہم دت شرما نے تھانیدار کو فون کیا اور اس پر برستے ہوئے بولا،'' کیوں داروغہ جی، سوئے ہیں کیا......ذرا جاگ جایئے۔ہم تو ہم رہے کسی گنتی میں نہیں، یہ لوگ اب بھگوان کے گھر کو بھی

نہیں بخش رہے ہیں اور آپکے منتری جی...... ہاں ہاں وہی چندر کرن جی اپنی روزانہ کی راس لیلا سے کل رات تھک کر ابھی خراٹے بھر رہے ہونگے۔انہیں بھی جگایئے اور جا کر دیکھئے وہاں کیا تانڈو ہو رہا ہے۔''

تھانیدار جگل کشور جو سچ مچ چندر کرن کا خاص آدمی تھا، نے بہت ساری غیر ضروری پوچھ تاچھ کے بعد تھانے سے موقعہ واردات پر کچھ نفری بھیج دی اور خود بھی جیپ میں سوار وہاں پہنچ گیا۔غصے سے بھڑکی بھیڑ کے تیور دیکھ کر تھانیدار نے جھٹ سے پستول نکال کر درخت کی اس جانب نشانہ تانا جہاں بیچارہ شنکر لہولہان کسی شاخ کی آڑ میں چھپا تھا، اور دو چار خطرناک قسم کی گالیاں دے کر اسے نیچے اترنے کو کہا۔ پولیس کے آدمی دیکھ کر شنکر گھبرا تو گیا، پر اپنے اندر ایک ہمت بھی محسوس کر کے نیچے اترنے لگا، لیکن ہڑبڑاہٹ میں اسکا پیر پھسل گیا اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑا اور سر پر زبردست چوٹ کے باعث وہیں دم توڑ گیا۔

اب سارے معاملے کی نوعیت ہی بدل گئی اور ڈی۔وی۔ڈی کے جوشیلے کارکن جو لٹھ لے کے آئے تھے ایکدم کھسک گئے اور انکے حامیوں نے بھی ایک ایک کر کے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔بھگت صاحب جو اپنے چند معتمد کارکنوں کے ذریعے حالات پر مکمل نگاہ رکھے ہوئے تھے کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنی پارٹی ورکروں کی اچھی خاصی تعداد کے ساتھ وہاں آپہنچے اور تھانیدار و پولیس والوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے غرایا،'' تو یہ ہے حال پچھڑی جاتیوں کا جنتا جناردھن پارٹی کی اس گلی سڑی سرکار میں.....نردوش لوگوں کی ہتیا صرف اسلئے کہ وہ بھی بھگوان کے گھر ماتھا ٹیکنے کیلئے جانا چاہتے ہیں۔ چلاتے جایئے گولیاں.....کتنی چلائیں گے......مہاویر کے بندوقوں میں گولیاں کم ہونگی اور ہمارے سینے زیادہ۔ بھائیو، کیوں ہماری آجکل کی پردیش سرکار پچھڑے ورگ کے لوگوں کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑی ہے.......ہم نے بہت شوشن سہا ہے اب اور نہیں.......اور نہیں،'' اور اسطرح کے اشتعال انگیز بھاشن کے ساتھ ہی لوگوں نے زبردست نعرے بازی شروع کی اور جب چرن داس، اسکی پتنی اور بہنیں وہاں روتی بلکتی پہنچ گئیں تو مشتعل ہجوم نے پولیس پر پتھراؤ شروع کیا جو آنکھ جھپکتے ہی ایک فرقہ وارانہ فساد میں تبدیل ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا محلّہ اور پھر سارا شہر تشدد کی چپیٹ میں آگیا.....آگ زنی، لوٹ مار اور چھرے بازی کی کئی وارداتیں رونما ہوئیں......بے گناہ لوگوں کو مارا پیٹا گیا اور سرکاری و غیر سرکاری املاک کو نذر آتش کر دیا گیا۔

وزیر اعلےٰ نے کابینہ کی ہنگامی بیٹھک طلب کی جس میں نظم ونسق کی بگڑتی صورت حال پر غور وخوض کیا گیا اور شہر کے حساس علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔لیکن مرض بڑھتا ہی گیا جوں جوں دوائی کی اور تشدد کی لہر ریاست کے کئی اور شہروں تک پھیل گئی۔ ہر طرف آگ ہی آگ نظر آرہی تھی، پر آگ بجھانے والوں کا کہیں نام ونشان ہی نہیں اور لوگوں کے سر پر جیسے مرنے مارنے کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ پورے تین دن تک قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا اور انتظامیہ مشینری سیاسی پشت پناہی پر پنپ رہے بے قابو غنڈہ عناصر کی سرکوبی میں مکمل طور ناکام

ہوگئی۔ سرکار نے حالات مزید ابتر ہونے سے بچانے کیلئے جتنے بھی اقدامات کئے سبھی بے اثر ثابت ہو رہے تھے اور سیاسی حلقوں میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ جنتا جناردھن سرکار اب گرنے والی ہی ہے اور ان افواہوں کو مزید تقویت تب ملی جب مرکزی سرکار نے ریاست کے گورنر سے اس بارے میں مفصل رپورٹ طلب کی۔

ان حالات کے پیشِ نظر تمام سیاسی پارٹیاں ایکدم متحرک ہوئیں اور سیاسی پارٹیوں و رہنماؤں کی تجوریوں کے منہہ کھلنے کے امکانات روشن ہونے لگے۔ ڈی۔وی۔ڈی جسکے کہ ۱۰۰ ممبران کی قانون ساز اسمبلی میں ۳۶ اراکین تھے، کے صدر رما کانت جو پچھلی کئی دہائیوں سے مکھیہ منتری کی کرسی کے متلاشی تھے نے اپنے چند قریب ترین پارٹی رہنماؤں کی ایک خفیہ میٹنگ گھر پر بلائی جن میں برہم دت شرما بھی شامل تھے اور باقی سیاسی پارٹیوں کے اشتراک سے سرکار بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ جب ڈی۔پی۔ایس جسکے کہ نچلے ایوان میں کُل ۱۲ ممبران تھے اور جو ماضی میں 'نظریاتی بنیادُ' پر ہمیشہ ہی ڈی۔وی۔ڈی کی حریف رہی تھی، کے ساتھ تال میل کرنے کا معاملہ زیرِ غور آیا تو بہ اتفاق رائے طے پایا گیا کہ انکا تعاون حاصل کرنے کیلئے سنجیدہ کوششیں کی جائیں اور اس سلسلے میں برہم دت شرما نے یہ ذمہ واری اس شرط پر قبول کر لی کہ انکی مخلوط سرکار اگر برسرِ اقتدار آتی ہے تو اسے محکمہ تعمیر عامہ کا وزیر بنایا جائیگا۔ چنانچہ بیٹھک ختم ہوتے ہی برہم دت نے ڈی۔پی۔ایس کے صدر دھیان چند بھگت سے رابطہ قائم کیا اور رات کے بارہ بجے تک نوٹوں سے بھرے کئی بریف کیسوں کے لین دین اور آپسی اشتراک کیلئے ضروری شرائط جن میں وزارتوں ومحکمہ جات کی تقسیم کے علاوہ آٹھ آزاد امیدواروں (جس میں لازماً چندر کرن کا اخراج یقینی بنایا گیا تھا) کی امنگوں کا خاص خیال رکھا گیا تھا، طے کرنے کے بعد سبھی ۵۲ ممبران قانون ساز یہ خوشی خوشی گورنر ہاؤس کی جانب روانہ ہوئے اور صبح سویرے جتنے بھی اخبار اور ٹی۔وی چینلوں کے خصوصی نیوز بلیٹن تھے ان سب کی سرخیاں کچھ اس طرح سے تھیں......''جنتا جناردھن پارٹی سرکار برخاست''......، ''ہچکولیا سرکار آخری ہچکولے کے ساتھ لڑھک گئی''......، ''مہاویر سرکار ویرگتی کو پراپت''......، ''کرسی کے رنگ.....دوشتر وسنگ......مہاویر دھنگ''......وغیرہ وغیرہ۔

اگلے روز نئی سرکار کی حلف برداری کے بعد شومندر محلے میں بھی شام کو مٹھائیاں بٹنے لگیں اور سارے محلے کے سبھی گھروں اور مندر کے اونچے شکھر کا خصوصی طور برقی قمقموں سے چراغاں کیا گیا.....ڈول، باجے اور تاشوں پر لوگ پی کر رقص کرنے میں مست تھے......اونچی و پچھڑی جاتیوں کے اشخاص آپس میں ایسے بغلگیر ہو رہے تھے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے آپس میں ملتے ہیں اور ہوتے بھی نہ کیوں......آخر انکا یہ ملن اب سرکاری سطح پر ہو چکا تھا جسکی زندہ مثال برہم دت شرما ودھیان چند بھگت کا انکے ایک مشترکہ اور قابلِ اعتماد ساتھی کے ذاتی فارم ہاؤس میں ٹکراتے جاموں سے اور زیادہ کیا ہو سکتی تھی جس دوران بھگت جی نے شرما صاحب کی تعریف کرتے ہوئے کہا، ''منتری جی، آپ بھی سچ مچ کمال کے آدمی ہیں......آگ لگانا کوئی آپ سے سیکھے'' اور شرما جی جواب

میں بولے ، '' اُپ مکھیہ منتری جی، آپ بھی تو کچھ کم نہیں، چنگاری لگانے میں آپ جیسی مہارت کس میں ہے۔''

اُدھر محلے میں گلی کی دوسری جانب شراب میں دھت دو نوجوانوں میں سے چندو نے مکانوں کی قطار میں اس اکیلے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی بنسی سے پوچھا ، ''ارررررے دوست......یہ تو بتاؤ اُس مکان میں......اااااندھیرا کیوں ہے......انہوں نے بتی کیوں......نہ نہ نہ نہیں جلائی ہے......کہ کہ کہ کیا وہ خوش نہیں ہیں......؟؟؟''

''ارررررے یار......تہ تم بھی بدھو ہی ہو۔ یہ اسی چہ چہ چرن داس کا گھہ گھہ گھر ہے جسکا بہ بہ بیٹا پچھلے ہفتے ......مہ مہ مہ مندر سے گر کر مر گیا تھا اور یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہوا تھا۔ یہ کہ کہ کمبخت تو رہے گا کنگلے کا کنگلا......ررررہنے دو ،'' بنسی نے جواب دیا۔

''اچھا ،اچھا......وہ چور ، جو بھگوان جی کا......چھ چھ چھتر چرانے آیا تھا...... چہ چہ چلو......اچھا ہوا......ہمیں آج اسی بہانے انگریزی پینے کو ملی......نہ نہ نہیں تو ہم جیسے لہ لہ لہ لوگوں کو کون پوچھتا ہے......بھہ بھہ بھگوان اسے......شہ شہ شانتی ملے،'' چندو بوتل سے ہی گھونٹ پہ گھونٹ چڑھاتے ہوئے دُعا کے ساتھ بولا۔

اگلے روز صبح سویرے شومندر کے منتظمین نے ایک خصوصی تقریب اور پوجا، ارچنا کا اہتمام کیا جس میں نئے نائب وزیرِ اعلیٰ اور تعمیر عامہ کے وزیر کے علاوہ کئی اور وزراء اور اعلیٰ افسران کو مدعو کیا گیا۔ اپنی پُرجوش تقاریر میں انہوں نے عوام اور عوامی نمائندوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جنہوں نے پچھلی 'نااہل اور عوام دشمن' سرکار کو نامنظور کر کے سیاسی بیداری اور پختہ سوچ کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس موقعہ پر تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان شہید شنکر داس کے لواحقین کو اسکی عظیم قربانی کے عوض دو لاکھ روپئے کا چیک پیش کیا گیا جس کے بعد محکمہ فائر بریگیڈ کے ایک سپیشل کرین ، جو آگ زنی کے دنوں لاپتہ تھا، کے ذریعے ان دونوں مہمانان ذی وقار نے مندر کے شکھر پر گل باری کی اور پھولوں کی بڑی بڑی مالائیں ارپن کیں اور نیچے کھلے آنگن میں لوگ ایک جنونی کیفیت میں تالیاں بجاتے گئے، ......اور کل رات گلی کے دو شرابیوں جنکا خمار اب بہت حد تک اتر چکا تھا، میں سے ایک نے کہا ،''ارے چندو ، یہ کیا......!!!! بھگت صاحب نے لاؤڈ سپیکر کو مالا پہنائی جبکہ شرما صاحب نے چھتر پر پھولوں کا ہار چڑھایا اور وہ جو بھگوان جی کی مورتی ہے اس پر کسی بھی نے مالا نہیں چڑھائی......بڑی حیرانی کی بات ہے......ابھی ابھی کرسی ملی ہے اور ابھی سے غلطیاں کرنے بیٹھ گئے۔'' اس پر اسکے ساتھ نے اسکے گال پر ہلکا سا تھپڑ مارتے ہوئے کہا ،''چپ رہ بنسی......چپ رہ پگلے کہیں کے......اور تالی بجاتے جاؤ......کل رات کا نشہ ابھی اترا نہیں تمہارا......یہ بڑے لوگ ہیں......نیتا ہیں، یہ ہماری تمہاری طرح بیوقوف نہیں......یہ غلط کام کرتے ہیں، پر غلطی نہیں کرتے، ''......اور پھر وہ دونوں بھی باقی لوگوں کے ہمراہ زور زور سے تالیاں بجاتے گئے۔

☆☆☆

مسعود علی تماپوری (گلبرگہ، کرناٹک)

بھوک اپنی اپنی

بس، اسٹانڈ کے احاطے میں داخل ہوئی اس کے رکنے کے بعد چند مسافر یہاں اتر گئے شاید یہی مقام ان کی مطلوبہ منزل ہو۔ یہاں سے جتنے مسافر بس میں سوار ہوئے وہ تعداد میں اُن مسافرانِ ہمکنارِ منزل سے کم ہی تھے۔ کنڈ یکٹر نے سیٹی بجا کر بس ڈرائیور کو یہاں سے روانگی کی اجازت دے دی۔ اچانک ایک جواں لڑکی بس میں سوار ہوگئی۔ بس، اسٹانڈ سے نکل کر باہری سڑک پر جانبِ منزل رواں تھی۔ لڑکی بس کے دروازہ میں اوپری پہلے زینے پر کھڑی مسافروں کا جائزہ لینے لگی۔ بشمول ڈرائیور و کنڈ یکٹر کل مسافرین کی تعداد بہ آسانی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ جوں ہی لڑکی بس میں سوار ہوئی وہ مجھے میری پہلی ہی نظر میں بے حد حسین لگی۔ لڑکی کا گورا رنگ اُس کے خوبصورت چہرے سے نمایاں تھا، چہرہ پونم کے چاند کی طرح پورا گول، آنکھیں بڑی بڑی کالی اور گہری تھیں ان خوبصورت آنکھوں نے اس کے چہرے کو مزید جاذبِ نظر اور پرکشش بنا دیا تھا۔ لڑکی نے جس لباس کا انتخاب کر اُسے پہنا تھا اُس میں وہ سراپا مجسمہ حسن لگی رہی تھی۔ کالے رنگ کی شرٹ اور پیلے رنگ کی شلوار اُس کے گورے بدن پر خوب بچ رہی تھی اس لباس نے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ لڑکی نے سر پر لال رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اُس نے دوپٹے کو کچھ اس انداز میں سر سے ہو کر گردن کے گرد یوں اوڑھ لیا تھا جس سے اُس کا گول چہرہ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا چاند لگ رہا تھا۔ لال رنگ کی چھوٹی سی تھیلی اس کی کمر کے بائیں خمیدہ حصے پر جھول رہی تھی جس کے بند دائیں شانے سے ہو کر اس کے سینہ کے فراز سے کمر کی نشیبی سمت جھولتی تھیلی سے جڑے تھے۔ میں نے اپنی دوسری نظر کے لیے لڑکی کے دیگر حسین پہلوؤں کو بچا نہیں رکھا تقریباً پہلی ہی نظر نے نظارہ حسن سے سیر یابی حاصل کر لی تھی۔ لڑکی کے بس کے اندرونی حصے کی طرف بڑھی اور میری عقب والی نشست پر براجمان ہوگئی جو نشست پچھلے اسٹیشنوں سے بس کے گذرنے یا رکنے کے باوجود یوں ہی خالی رہ گئی تھی۔ لڑکی کو عقبی نشست پر براجمان دیکھ کر میری نگاہیں بے اختیار بار بار اس کی جانب مڑنے لگیں۔ چند ثانیوں بعد لڑکی نے اُس لال رنگ والی چھوٹی سی تھیلی سے چند سفید کاغذ کے پرچے باہر نکالے پھر تیزی سے اُس نے ایک پرچہ فی مسافر تقسیم کر دیئے پرچہ کے ایک جانب سیاہ تحریر نمایاں تھی۔ لڑکی نے میرے اور ڈرائیور و کنڈ یکٹر کے علاوہ سب مسافروں کو پرچے تقسیم کر دیئے میں ڈرائیور اور کنڈ یکٹر کو پرچہ نہ ملنے پر کم سوچ رہا تھا خود کو نہ ملنے پر زیادہ۔ کاغذ کے اُن پرچوں کو مسافروں میں بانٹنے کے بعد لڑکی ڈرائیور کے عقب والی سیٹ کا سہارا لے کر اپنا خوبصورت چہرہ مسافروں کی جانب کیے کھڑی رہی۔ وہ مسافروں کے چہروں کا جائزہ کچھ اس انداز میں لینے لگی جیسے کسی اسکول کے امتحان حال

میں مدرس امتحانی سوالی و جوابی پرچے طلباء میں تقسیم کر کے اُن کے چہروں پر اُبھرنے والے تاثراتِ ذہن میں نہاں جوابات اور چھپی ہوئی نقل کی چھٹیوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ میری بغل والی نشست پر کوئی محترم مسافر نے لڑکی کا دیا ہوا پرچہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی نشست ہی سے میں نے ذرا سی نظر اونچی کر بغل والے اس مسافر کے ہاتھ میں تھمے پرچے کو پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

''کاغذ کا یہ چھوٹا سا پرزہ دراصل ایک صداقت نامہ ہے۔ جو اس لڑکی کے مجبور اور بے بس حالت کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لڑکی یتیم ہے اس کا کوئی اس دنیا میں سہارا نہیں ہے اور یہ بول نہیں سکتی کیوں کہ یہ پیدائشی گونگی ہے۔ اس کے علاوہ تین اور بہنیں بھی اس کی طرح گونگی ہیں جو اسی طرح مختلف مقامات پر لوگوں سے اپنے گذر بسر کا انتظام کر لیتی ہیں۔ آپ بھی اس کی حالت پر رحم فرمائیں آپ سے جو بن پڑے اس کی مدد کریں۔ مہربانی کر کے اس پرچے کو مت پھاڑیئے پڑھنے کے بعد لڑکی کو واپس کر دیجئے۔''

یہ صداقت نامہ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی تحریر تھا جسے کسی ڈاکٹر نے اپنے نام اور ڈگری کے علاوہ مع پتہ درج کر کے صداقت نامے پر گویا سچائی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ میں ہنوز لڑکی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی طالبِ علم امتحان حال میں موقع نقل کی تلاش میں بار بار مدرسِ امتحان حال کا چہرہ دیکھتا ہو۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر ہر اس مسافر سے وہ پرچہ واپس لے لیا جسے وہ کچھ دیر پہلے دے گئی تھی اس کا یہ خاموش فعل بہ حسن و خوبی مجھے متاثر کر گیا۔ لیکن اب بھی میں اُسی سوچ میں ڈوبا رہا لڑکی نے مجھے وہ پرچی کیوں نہیں دی؟؟ جس کسی مسافر نے بھلے وہ لڑکی کے دیئے گئے پرچی کو پڑھا یا نہیں اگر پڑھا بھی ہو تو اس لڑکی کے تئیں کس ہمدردانہ ردِ عمل کا اظہار کیا مجھے اُس سے کوئی دلچسپی اس لیے بھی نہیں تھی کہ لڑکی نے اپنی مجبوری کو تحریری استفسار بہ شکل کاغذی پرچی دیگر مسافروں میں بانٹنے کے بعد مجھے کیوں نظر انداز کر گئی۔ اسی خیال نے مجھے لڑکی کی طرف بار بار نگاہیں اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اچانک بس رک گئی شاید یہ کسی بس اسٹانڈ کا علاقہ ہو جہاں کوئی مسافر اترنا چاہتا ہو۔ لڑکی نے وہ ساری کاغذی پرچیاں اُسی تھیلی میں رکھ لیے اور پھرتی سے وہ بس سے اتر گئی۔ میں بھی بس سے اتر گیا میرے قدم اس لڑکی کے تعاقب میں بے اختیار اٹھنے لگے میرے تعاقبی اقدام نے ہم دونوں کے باہمی فاصلے کو مختصر کر دیا میں نے اُسے آواز دی۔ ''ہیلو......اے لڑکی سنو تو ذرا......رکو''! لڑکی بدستور تیز گام آگے بڑھتی جا رہی تھی جیسے میری یہ آواز اس کی سماعت تک نہ پہنچی ہو۔ میری اس آواز کے باوجود اس کا بے نیاز انداز مجھے اس شک میں مبتلا کر دیا کہ لڑکی گونگی ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں قوتِ سمعیٔ سے محروم تو نہیں لہٰذا دوبارہ میں نے پر زور آواز میں لڑکی کو میری جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی اچانک وہ پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی تب میں نے اپنا سلسلہ گام جاری رکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا

''بس میں تم نے مجھے پرچی کیوں نہیں دی جو سارے مسافروں کو دیدی تھی......؟؟''

''بابو جی میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک پرچی پڑھی ہے جس سے مجھے ڈر لگا!!'' لڑکی کے اس جملے کی ادائیگی نے گویا میری قوتِ گویائی مجھ سے چھین لی اور میں گونگا بنا مبہوت صرف اُسے دیکھتا رہا۔ لڑکی تیزی سے مڑ کر واپس چلی گئی۔ اچانک بس کنڈ یکٹر نے سیٹی بجائی اور میں چونک کر بس کی جانب دوڑا چلا آیا۔ ☆☆☆

پاکستان میں آنے والے حالیہ ہولناک سیلاب کے حوالے سے ایوب خاور کی دو خاص نظمیں

ایوب خاور (لاہور)

مگر کوئی گروہِ منکراں تو ہے!!

زمیں پیاسی نہیں ہوتی
زمیں اتنی کبھی پیاسی نہیں ہوتی
زمیں تو سال بھر کے موسموں کا بیج
اپنی زرخیزی کی پہنائی میں تخمِ آرزو کی طرح رکھتی ہے
اور پھر
کچھ اس انداز سے سرسبز اور شاداب ہوتی ہے کہ جس کو دیکھ کر
خالق بھی اپنے حسنِ خلاّقی پہ گویا ناز کرتا ہے
زمیں پیاسی نہیں ہوتی
مگر وہ لوگ جن کے نام سے پٹواریوں کے دفتروں میں درج ہوتی ہے زمیں
وہ پیاس سے لب ریز ہوتے ہیں
کہ جن کی پیاس اپنوں کے لہو سے بھی نہیں بجھتی
بساطِ سلطنت پر اپنے اپنے فیل، پیادے
اپنی ہی سوچی ہوئی چالوں کے بل پر دوسروں کے فیل پیادوں کے نشانے پر
خود اپنے ہاتھ سے رکھتے ہیں
اور پھر خون بہتا ہے
زمیں پھر اپنے سینے پر اچھلتا اُن کا خوں جب چاٹتی ہے
تب پھر اُس کو پیاس لگتی ہے

کہ خوں مٹی کے اندر جذب ہوتا ہی نہیں ہے
اُس کے ہونٹوں پر ہی جم جاتا ہے
تب پھر اس کی پپڑیوں سے پیاس اُگتی ہے
اور پھر یہ پیاس پانی مانگتی ہے
آسماں اُس پیاس کے دکھ میں کچھ اس شدّت سے روتا گڑگڑاتا ہے کہ اونچی
چوٹیوں والے پہاڑوں پر جمی یخ برف بھی اندر ہی
اندر سے چٹختی اور دریاؤں میں گرتی ہے
خدا کا قہر بن کر پھر یہ دریا اپنی اپنی حد سے باہر کو اچھلتے ہیں
منافع خور تاجر
ظالم
ہاریوں پر ظلم ڈھانے والے
بے انصاف
طاقت کے نشے میں چور ہو کر اپنے سے کم زور کے منہ سے نوالہ
چھیننے والے جب اپنی حد سے باہر ہونے لگتے ہیں
تو پھر سیلاب آتے ہیں
وقت اور تاریخ شاہد ہے
ہزاروں قرن گزرے ایسی ہی اک قوم کو پانی بہا کر لے گیا تھا
مگر ہم کس کے منکر ہیں!
ہم تو خدا کو مانتے، اس کے نبی کا کلمہ پڑھتے ہیں
ہمیں سیلاب نے کیوں گھیر رکھا ہے!
تو پھر کوئی گروہِ منکراں تو ہے!!
مرے اندر ہی چھپ چھپ کر جو مجھ پر وار کرتا ہے
کوئی تو ہے!

ایوب خاور

سرکاری و نیم سرکاری اعلامیہ

(سیلاب زدگان کے لیے)

ابھی اُترا نہیں پانی
ابھی پانی بہالے جارہا ہے
ایک انتھک زندگی کی ماند پڑتی آب و تاب
مختلف عمروں کے خواب
اور تمنّاؤں کے گم گشتہ سراب
گھروں، گلیوں، محلوں اور بازاروں کے اندر
صورت خاشاک اڑتی آرزوئیں
حبس اگلتے، کچے کمروں میں جھلنگی چارپائیوں پر دھری بےزار نیند
آنگنوں میں کھیلتا بچپن...... بہالے جارہا ہے

ابھی پانی بہالے جارہا ہے
کچے رستوں
اور شیشم
اور چناروں کی گھنی چھاؤں میں پلتی دیسی گیندے کی طرح کی سادہ اور رنگیں محبت
اک ذرا دو چار دن خوش رہنے اور آرام کرنے کی بہت مہنگی سی خواہش
آنسوؤں کی تیز اور نمکین بارش میں بہالے جارہا ہے
ابھی پانی بہالے جارہا ہے
آنے والے موسموں کی ساری فصلیں
ہل پنجالی، ڈھور ڈنگر

اور جو کچھ روکھی سوکھی زندگی کی شرم رکھنے کے لیے ہاری سے بن پڑتا ہے
وہ سب کچھ بہالے جارہا ہے
ابھی اترا نہیں پانی
ابھی کچھ دیر میں اترے گا پانی
ہر اک شے کی نشانی چھوڑ کر اترے گا

اتر جائے گا جب پانی
گزر جائے گا جب پانی
تو پھر معدوم ہوتی زندگی کی ہر نشانی کو دوبارہ زندگی دیں گے
نئی گلیاں
محلے
راستے
پگڈنڈیاں
اور آنے والی زندگی کے خواب
مختلف عمروں کے خواب
زنگ آلودہ سے خواب
ایک ان تھک زندگی کی ماند پڑتی آب و تاب
اور تمناؤں کے صحرا میں چٹختے آئینوں جیسے سراب
جب قلعی ہو جائیں گے
تو پھر سے یہ سب عہد و پیماں
آپ لوگوں میں مساوی بانٹے جائیں گے
ابھی اترا نہیں پانی
ابھی کچھ دیر ہے
زمیں کو خشک ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

ندا فاضلی (ممبئی)

نظم بہت آسان تھی پہلے

نظم بہت آسان تھی پہلے
گھر کے آگے پیپل کی شاخوں سے نکل کے
آتے جاتے بچوں کے بستوں سے اچھل کے
رنگ برنگی چڑیوں کی چہکار میں ڈھل کے
نظم مرے گھر جب آتی تھی
میرے قلم سے جلدی جلدی خود کو پورا لکھ جاتی تھی
اب سب منظر بدل چکے ہیں
چھوٹے چھوٹے چوراہوں سے
چوڑے رستے نکل چکے ہیں
بڑے بڑے بازار، پرانے
گلی، محلے نگل چکے ہیں
نظم سے مجھ تک
اب میلوں لمبی دوری ہے
ان میلوں لمبی دوری میں
کہیں اچانک بم پھٹتے ہیں
پیٹ میں ماؤں کے
زندہ بچے کٹتے ہیں
مذہب اور سیاست دونوں
نئے نئے نعرے رٹتے ہیں
بہت سے شہروں
بہت سے ملکوں سے اب ہو کر
نظم مِرے گھر جب آتی
اتنی زیادہ تھک جاتی ہے
میرے لکھنے کی ٹیبل پر
خالی کاغذ کو خالی ہی چھوڑ کے رخصت ہو جاتی ہے
اور کسی فٹ پاتھ پہ جا کر
شہر کے سب سے بوڑھے شہری کی
پلکوں پر
آنسو بن کے سو جاتی ہے!

رشید قیصرانی (مرحوم)

صدیوں کا سفر

آکاش کی سرحد سے پرے تیرا نگر تھا
صدیوں کا سفر تھا
میں ذرۂ آوارہ تھا اور محوِ سفر تھا
صدیوں کا سفر تھا
وہ ساعتِ گم گشتہ کہ میں خود سے نہاں تھا
کیا جانیے کہاں تھا
تو میری نگاہوں میں تھا میں جسم بدر تھا
صدیوں کا سفر تھا
پڑتا تھا تری راہ میں ہر گام سرِ دار
لمحے تھے کہ تلوار
کہنے کو تو دو چار قدم پر ترا گھر تھا
صدیوں کا سفر تھا
اُس تیرہ مسافت پہ کمر بستہ تھے سارے
سب چاند ستارے
نکلا تو مرے ساتھ بس اک نجمِ سحر تھا
صدیوں کا سفر تھا
کہتا تھا چلیں شہرِ شفق چل کے بسائیں
سورج کو منائیں
اور میرے بدن میں کوئی شعلہ نہ شرر تھا
صدیوں کا سفر تھا
لگتا تھا مرا حاصلِ جاں تھا جو کہیں تھا
معلوم نہیں تھا
وہ وہم تھا، پرچھائیں تھا جو بھی تھا جدھر تھا
صدیوں کا سفر تھا
کرنوں نے فلک پر جو بدن اُس کا تراشا
تھا طرفہ تماشا
سب لوگ یہ کہتے تھے نہیں تھا، وہ مگر تھا
صدیوں کا سفر تھا

رشید قیصرانی (مرحوم)

حرفِ عجز

مجھے کیا خبر کہ وہ ذکر تھا، وہ نماز تھی کہ سلام تھا
مرا اشک اشک تھا مقتدی، ترا حرف حرف امام تھا
ترے رُخ کا تھا وہی طنطنہ، مری دید کا وہی بانکپن
کہ بس ایک عالمِ کیف تھا، نہ سجُود تھا نہ قیام تھا
میں ورائے جسم تری تلاش میں تھا مگن، مجھے کیا خبر
کہ ہر ایک ذرہءتن میں بھی تری جلوتوں کا نظام تھا
مجھے رَت جگوں کی صلیب پر زرِخواب جس نے عطا کیا
وہی سحر، سحرِ مبین تھا، وہی حرف، حرفِ دوام تھا
مجھے عرش وفرش کی کیا خبر، مجھے تُو ملا تھا جہاں جہاں
وہی آسماں تھی مری زمیں، وہی فرش عرش مقام تھا
میری دسترس میں جو آ گیا کوئی زاویہ ترے حسن کا
وہی سلطنت مرے لفظ کی، وہی تاجدارِ کلام تھا
ترے گُنجِ لب سے رواں دواں وہ جو ایک سیلِ حروف تھا
اسے لہر لہر سمیٹنا اُسی کمل والے کا کام تھا

اسلم انصاری

خوشبو کا سفر

ساغرِ رنگ سے چھنتی ہوئی خوشبو کی کرن
شاخِ لرزاں کے سفینے سے اُتر آئی ہے
شب کے گل پوش دریچوں سے گزر آئی ہے
کتنی یخ بستہ بہاروں کا لہو ہے اس میں
کتنے بے نام شگوفوں کے سسکتے ارماں
اس کی پامال اُداسی میں سمٹ آئے ہیں
کتنے ایوانوں میں محصور رہے اس کے قدم
کتنی زنجیروں کے دہکے ہوئے بازو لپکے
تجربہ ، لذتِ ہستی کا خطا ہو جیسے
ہر قدم زخمِ کفِ پا میں اضافہ گویا
اور مسافت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے

کاوش عباسی (سعودی عرب)

ہم اتنا کچھ کھوئے ہوئے

ہم اتنا کچھ کھوئے ہوئے
کچھ کھو کر ہی سمجھتے ہیں ہم
کوئی ہماری کالی بات
کوئی ہمارا داغِ حیات
کوئی ٹھوکر ہی
دل کا اک ٹکڑا جو کاٹ کے لے جاتی ہے
ہم میں کھولتی ہے
وہ خوں کا فوارہ
اور ذہن کی وہ برقی لہریں
ہم جن سے محبت سیکھتے ہیں
پھر نئی، ہماری،
محبت جس میں نہاتی ہے!

کاوش عباسی

بیس برس پہلے

بیس برس پہلے خوش قسمت نہیں تھا میں تو
اب کیوں ہوگا
تم بھی میرے خواب میں آگ لگانے لگی ہو
ستارے جیسی
آسمان کے نور میں بیٹھی، مجھ کو بلاتی
اچانک اندھیرے میں خود گم ہو جانے لگی ہو
پوچھتی تھیں تم
اتنے ناخوش، اتنے برسوں کیسے جیۓ تم
ایسے جیا میں!
خواب میں آگ لگی ہوئی
اور اُس آگ میں زندہ جلتا ہوا میں!!

احمد حسین مجاہد (ہزارہ)

شکریہ

(ایک نظم حیدر قریشی کے لیے)

مری آنکھ میں کیسے آنسو ہیں
تو جانتا ہے
عجب نارسائی ہے
ساری خدائی ہے
لیکن
مری آنکھ سے بہتے آنسو
تجھے ڈھونڈتے ہیں
تجھے تو خبر ہے
کتابوں میں لکھے ہوئے نام مرتے نہیں
تو نے مجھ کو امر کر دیا
مجھ کو تو قید دی
تو کہاں ہے؟
مری آنکھ سے بہتے آنسو۔۔۔!

احمد حسین مجاہد

زندگی بھر کا مسافر

یہ برف باری اور ایک ناری، چشمے سے پانی بھرے
خود کو سمیٹے آنچل میں اپنے، آہٹ سے اپنی ڈرے

آنکھیں وہ گہری، زلفیں سنہری، وہ اس کی مستانہ چال
ہونٹوں سے ٹپکے انگور کا رس، اس پر زمانہ مرے

کر کے اشارہ، مجھ کو دوبارہ، اٹھ کے چلی جائے وہ
گڑیا کی شادی رہ جائے آدھی، الزام مجھ پر دھرے

بل کھاتے رستے، تنہا اکیلے، پیڑوں کی لمبی قطار
منزل نہ پاؤں، چلتا ہی جاؤں، آنکھوں میں جگنو بھرے

دکھ کا سفر ہو، دھندلی ڈگر ہو، ہو جائے رستے میں شام
ہمراہ کوئی، ساتھی نہ سایہ، دل کا کوئی کیا کرے

مڑ مڑ کے جھانکے نیچے گلی میں، کھڑکی میں رکھ کے دیا
کوئی مسافر لٹ جائے ہائے، اس کی گلی سے پرے

پروین شیر (کینیڈا)

نہ جانے کیوں۔

اچانک کیا ہوا؟
آنکھوں سے تیری
سیلِ خوں جاری ہوا ایسے
بہا کر لے گیا سب کچھ
بچا کچھ بھی نہیں
طغیانیوں میں غرق ہو کر رہ گئی بستی
تڑپتی، لڑکھڑاتی،
پے بہ پے معدوم سی ہوتی ہوئی ہستی
یہ کیسا سانحہ کرب و بلا کا وادیوں میں ہے؟
یہ تیرے سینے سے چپکے ہوئے بچّے
کبھی جو گود میں تیری بہت محفوظ رہتے تھے
سمٹ کر تیرے آنچل میں
چہکتے، کھلکھلاتے تھے
عجب سکتے میں ہیں
مجروح تن، بے آسرا
ٹوٹے پڑے ہیں ماں!
انہی بچوں نے پھولوں سے سجایا تھا ترا آنچل
جو خوشبو سے معطر تھا وہاں اب خون کی بو ہے
گھروندے جو بنائے تھے
مقابر بن گئے ان کے
تجھے جس غم نے پاگل کر دیا
اس غم کی آخر انتہا کیا ہے؟
ترے بچے یونہی سہمے رہیں گے کب تلک آخر؟
دعائیں بے اثر کیوں ہیں؟
بتا کچھ تو مری ماں،
میری دھرتی ماں!

پروین شیر

نسیان

بے بسی کی رضائی میں منہ کو چھپائے ہوئے
ذہن کے گھپ اندھیرے کی کالی گپھا میں بھٹکتی ہوئی
جیسے خود سے بھی بچتی بچاتی ہوئی
اپنے ہاتھوں سے سر کو سنبھالے ہوئے
چیختی ہے کہ کوئی بتائے اسے
کون ہے وہ؟ کہاں ہے؟ یہ اندھی اندھیری گپھا
کیا یہی حافظے کے محل کا ہے باقی کھنڈر؟
اپنی آہ و بکا، اپنی سینہ زنی، سوگ کے ماتمی شور میں
ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی
سسکیوں میں ہے ماتم کناں
زندگی کا مرتّب ورق/ ریزہ ریزہ جو اڑتا بکھرتا رہا
سارے الفاظ اک دوسرے سے جدا ہو گئے
کوئی معنی و مفہوم بنتا نہیں!
زنگ آلود تالے سے جکڑے ہوئے
ذہن کے در پہ دستک کا کچھ زور چلتا نہیں
خون بہتی ہوئی انگلیوں سے کوئی در بھی کھلتا نہیں
یاد کے پرزہ پرزہ ورق/ سب اڑا کر کہیں
لے گئیں آندھیاں/ سارے دروازے جو بند ہیں
اب کھلیں گے کہاں/ گم ہوئیں چابیاں
اے خدا، تو بتا/ کوئی چارہ نہیں؟

کوئی چارہ نہیں!
کوئی چارہ نہیں!!

پروین شیر

ادھورا عنصر

وہ سا لمیّت تھی ایک وحدت
وہ کاملیّت کسی طرح ایک غیر مضبوط ثانیے میں بکھر گئی تو
الگ ہوا اس کا ایک حصّہ!
وہ ایک عنصر کا ایک حصہ
جھٹک کے دامن
خلا کے گہرے، عمیق، لاوقت فاصلوں کو عبور کرتا
ہزاروں صدیوں کی دوریوں پر چلا گیا ہے۔۔۔!
کوئی نہیں جانتا کہ کیسے وہ نامکمل شکستہ عنصر
ادھورے پن کی اذیتوں سے گزر رہا ہے
مگر وہ اتنا تو جانتا ہے
کہ جان سے بھی عزیز تر وہ ادھورا عنصر
اٹوٹ بندھن کی ایک ڈوری سے بے لچک سا بندھا ہوا ہے!
ہوا کی ڈوری کا اک سرا اُس کے ہاتھ میں ہے
تو دوسرا اس کے ہاتھ میں ہے
اگر یہ رنجور ہو گیا تو
ہوا کے تاروں پہ دکھ کی لہریں
وہاں پہنچ کر
اسے بھی دکھ میں لپیٹ لیں گی!!

افضل چوہان (مظفر گڑھ)

مِرے بچوں کی خواہش ہے

مِرے بچوں کی خواہش ہے
کہ آنگن کے شجر کی ٹہنیوں پہ فاختائیں ہوں
مگر معصوم کیا جانیں
جہاں بارود جلتا ہو
جہاں خودکش دھماکے ہوں
جہاں پر تتلیاں مقتول ہوں
اور جگنوؤں کے پر سلگتے ہوں
جہاں پر پھول کا چہرہ کسی انجان مہلک خوف سے
کچھ زرد رہتا ہو
جہاں پر ظلمتوں کا خوف ذہنوں پر مسلط ہو
جہاں آواز سسکی ہو
جہاں خوشبو کے چہرے پر خراشیں ہی خراشیں ہوں
جہاں پر لفظ گونگے ہوں جہاں پر حرف بہرے ہوں
جہاں لہجے بھی اندھے ہوں
جہاں پر چاندنی کچھ اجنبی معلوم ہوتی ہو
جہاں دہشت کے عفریتوں کی ٹولی رقص کرتی ہو
وہاں پر فاختائیں کب بھلا مسکن بناتی ہیں

یہ معصوموں کی خواہش ہے
جو پوری ہو بھی سکتی ہے
اگر ایثار کی فصلوں کی کر دیں آبیاری ہم
محبت اور اخوت کو اُگائیں سوچ دھرتی پر
اگر نفرت کے لہجوں کو رویوں سے بدل ڈالیں
اگر ہم درگزر کو اپنے جیون میں سجا ڈالیں
اگر تعلیم کی طاقت سے نفرت کو مٹا ڈالیں
اگر ہم امن یکجہتی کو مقصد ہی بنا ڈالیں
تو پھر اس پاک دھرتی پر
محبت اور مودت کے لہکتے پھول مہکیں گے
حسیں رنگ و مہک کی دیویاں اتریں گی آنگن میں
تو پھر ہم سوچ سکتے ہیں
کہ آنگن کے شجر کی ٹہنیوں پہ فاختائیں ہوں
یقیناً ہر شجر کی ٹہنیوں پہ فاختہ ہو گی
یقیناً فاختہ ہو گی

قاضی اعجاز محوّر (گوجرانوالہ)

سن باتھ

''اِدھر دیکھو
یہاں بیٹھو
تمھارے سامنے پھیلا ہوا نیلا سمندر ہے
سمندر اندھے ہوتے ہیں
یہ ساحل، ریت اَور یہ پام کے پودے
یہ سب اندھے ہیں
آؤ تُم یہاں بیٹھو
سمندر کی طرف منہ کرکے
اِن لہروں کو دیکھو
اَور اپنے جسم سے لپٹی ہوئی یہ دھجیاں
ہر سو بچھی اس دھوپ کی چادر پہ پھیلا دو
اَور آنکھیں بند کرکے لیٹ جاؤ
آسماں کو دیکھنے دو
آسماں تو دیکھ سکتا ہے''
''مگر یہ سامنے پھیلا ہوا نیلا سمندر''
''یہ تو اندھا ہے''

☆☆☆

تنہا تماپوری (تماپور)

انجام

جب بھی کوئی بچہ رویا
اس نے چاند کو توڑ کے
چھوٹی گیند بنائی
تب بچوں نے ہنسنا سیکھا

جب بھی کوئی بچی روئی
اس نے سورج پھاڑ کے
اک سندر سا گڈا بنا دیا
چاندی کی گھنٹیاں بجیں
سب روتی بچیاں ہنسیں

جانے کیا کیا توڑا پھوڑا
بہلاوے کی شکلیں دے کر
اس نے سب کو خوب ہنسایا
لیکن......آج کی بات انوکھی

سب نے دیکھا
اب وہ خود روتا پھرتا ہے
اس کو ہنسانے والا کوئی
کہیں نہیں ہے............!!

تنہا تماپوری

زہریلی لکیریں

مرا بچہ بڑا معصوم ہے، نٹ کھٹ ہے، چنچل ہے
مری تصویر پر اس نے لکیریں کھینچ ڈالی ہیں
بگڑ جائے گی یہ تصویر اس کو کیا پتہ
لیکن......قلم جب ہاتھ میں آئے تو
مصرف اُس نے دیکھا تھا
اس مصرف کی یہ بچکانہ حرکت
کتنی پیاری ہے............
کسی نے کھینچ ڈالی ہیں لکیریں
میرے چہرے پر
یہ مذہب کی، زبان کی اور علاقے کی......
لکیریں ہیں
مرے چہرے کو یہ ساری لکیریں
کاٹ ڈالیں گی
نہ جانے کتنے ٹکڑوں میں مجھے تقسیم ہونا ہے
میں اپنے آپ کی پہچان
شائد بھول بیٹھا ہوں
یہ بدبودار، زہریلی لکیریں
کس نے کھینچی ہیں؟؟!!

تنہا تماپوری

بانجھ دعا

اندھیرے کے میدان میں عکس کی بے نشاں
بے بصارت خراشوں پہ
انگلی نہیں رکھ سکوں گا
تمھیں میری حیرت کا اندھا سفر
آنے والے رتوں کا تسلسل لگا
ابھی سوچ کی گھاس سوکھی نہیں ہے
تم اپنے بدن کے شگافوں کو ڈھانپو
اگر اس طرف سے کوئی واہمہ
سر اٹھانے لگے تو
اندھیرے کے میدان میں لفظ کے پھول
خوشبو جگانے کی کوشش کریں گے
یہ کس نے ہواؤں کا
دروازہ کھولا
اصولوں کے کاغذ بکھر جائیں گے
معبدوں میں دعا
بانجھ ہو جائے گی!!!

تنہا تماپوری

جڑیں کٹ رہی ہیں

تلخابے کی درد آشامی چکھنے کا
دعویٰ کرتے ہو
ننھی منی آرزوؤں کے ہیرے موتی
چھوکر دیکھ نہیں پائے ہو
تم کتنے کڑوے لگتے ہو
بے جڑ کے پودے لگتے ہو
خود اپنے پیروں سے چلنا بھول کے تم نے
اپنے بوجھ کو بیساکھی پر لاد دیا ہے
اونچے آدرشوں کی باتیں
مردہ لفظوں کے افسانے
چاٹ کے کب جی پاؤ گے؟
چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹو
ریزہ ریزہ بکھری ان معصوم تمناؤں کو سمیٹو
جینے کے انداز کو اوپر سے مت لادو
اپنی جڑ کے ساتھ جیو گے
تو پھیلو گے......!

تنہا تماپوری

پھر کیا ہوگا؟

دور تک پھیلے ہوئے
پانی میں بہنے کا عمل مفقود ہے
سبز چادر اوڑھ کر ہنستے ہوئے
پودوں کی رانی کا بدن اب زرد ہے
اور ملن کی راہ پر پھیلی ہوئی
ساری جڑیں
ہجر کی دیوانگی میں
اس زمیں سے سارے رشتے
توڑ لیں گی
آسمانوں پر اُگے
سب بادلوں کے
پھول بھی کھلائیں گے
پاکدامن یہ ہوائیں
ناگنیں بن جائیں گی!!!

تنہا تماپوری

قیدی لمحہ

کیمرے کی آنکھ سے جب
آنکھ میری مل گئی
میں نے دیکھا
سامنے سے اپنی آنکھیں
''وہ''......انھیں آنکھوں میں شامل
کر رہی تھی......

عین اسی لمحے کا شاہد
ایک لمحہ سامنے ہے

جس میں ''وہ'' ہے
اُسکی آنکھیں ہیں مگر
میری آنکھوں کا پتہ چلتا نہیں
کیمرے کی آنکھ بھی ہے لا پتہ
آج بھی وہ ایک لمحہ
قید ہے تصویر میں!!

☆☆☆☆☆

تنہا تماپوری

دستوری کرسی

سدوم اور عمورہ
کا سرسبز علاقہ
عجب نام کا بحر مردار مسکن
لواطت کی عیاشیوں میں
مگن تھا۔
کھلی بے حیائی کی اِس سرکشی پر
خدا کے غضب نے
جو آگ اور پتھر کی برسائی بارش
تباہی کے انجام نے
کیسی ہیبت کی تاریخ لکھ دی۔
جہالت کے اس دور کی گندگی پر
عذاب الٰہی نے
اس قوم کا خاتمہ کر دیا تھا۔
مگر آج
سائنس کے دور نے
پھر اُسی بے حیائی کو
''دستوری کرسی''
کا تحفہ دِیا ہے......
تو......؟!
انجام......!!؟؟

تنہا تماپوری

کڑوے گھونٹ

میں نے سب ناراض ارادے ڈھونڈ نکالے
تم نے اپنی ہی کرتوت غبن کر ڈالے
اُس نے فرصت کی گھڑیوں میں
اپنے بدن کا جھوٹ ہی دیکھا
سب اپنی اپنی پہچان کا
کھوٹا سکہ چلا رہے ہیں
گھسے ہوئے ہونٹوں سے پھر
معذور جوابوں کی تسکین کا
اندھا چہرہ دکھا رہے ہیں
یہ اپنی گندی تاویلوں سے
اجلے بت نصب کریں گے
ریت کے ساگر خوابوں میں تو
بہہ سکتے ہیں
کھلی کھلی آنکھوں سے جینا سیکھنے والو
برف کا موسم آگ نہیں برسائے گا
ٹھنڈے دھوکے سانس کی آنچ
نہیں بن سکتے
کھوٹے سکوں کو پہچانو
دروازوں پر لٹکی یہ تہذیب پگھل کر
بہہ جائے گی!!......

تنہا تماپوری

خدشہ

اپنے گھر کی باتیں ہیں
دن بھر گھر میں رہتی ہیں
کچھ کے دل میں چبھتیں ہیں
کچھ کا دل بہلاتی ہیں
نئی نئی کچھ باتیں
رات کو
ان باتوں سے اگتی ہیں
روز روز کی ان باتوں سے
گھر بازار بنا رہتا ہے
دروازے تو بند ہیں لیکن
کھڑکی سے گھر کی مریادا
گلی گلی میں اتر رہی ہے۔!

تنہا تماپوری

حکایت

جسم کی اونچی مصیلیں
ایک دروازے کے دو پٹ، آنکھ
جن پر
خارجی حملوں سے بچنے کے لئے
میخیں گڑی ہیں
داخلی منظر میں
گلیاں ہیں رگوں کی
لمحہ لمحہ سرخ فوجیں
گشت پر مامور ہیں
دل کے تہہ خانے میں
ارمانوں کے درباری کھڑے ہیں
دھڑکنوں کی فائیلوں میں
کلبلاتے ہیں مسائل
پیٹ کے میدان میں
بھوکی رعایا سر پٹکتی پھر رہی ہے
سر کے ایواں میں دماغ، اک شاہ
جو سویا ہوا ہے۔

تنہا تماپوری

ایک سوال

ہر دن:
سورج مشرق سے ہی نکلے گا
دھرتی
سورج کے اطراف ہی گھومے گی
چاند
چاندنی تاریکی میں پھینکے گا
تارے
بے ترتیبی کا ہی کھیل ہمیشہ کھیلیں گے......
صدیوں سے ان سب کو
ایک ہی رنگ کا
جیون دینے والے
میں کتنی راہوں پر بھٹکوں
میں
کتنے حالات سے الجھوں
لمحہ لمحہ رنگ بدلتا
جیون مجھ کو
کیوں سونپا ہے؟

تنہا تماپوری

کچھ تو ہوگا

پنجرہ ٹوٹ کے گر جائے گا
یا پنجرے کو زنگ لگے گا
شاید تیلی مڑ جائے گی
کوئی دروازہ کھولے گا
کچھ تو ہوگا............
میرے اِس بندھن پر
کوئی دِل پگھلے گا
کچھ تو ہوگا............

کچھ ہونے تک جینا ہوگا
اُس کے بعد
کھلی فضاؤں کی آزادی
اپنے پَر، اپنی پرواز............

اِسی آس کا جیون
ہم سب جینے لگے ہیں
خود کو
کب سے کھونے لگے ہیں!!!

تنہا تماپوری

آخری سوچ

بحرِ حیات:
تیرے منتھن سے
تھک گیا ہوں
اب سوچتا ہوں
پی کر
سو جاؤں
صبح تک
نیل کنٹھ ہو جاؤں!

تنہا تماپوری

بہتا قصہ

تم سورج ہو، میں قطرہ ہوں
تم بھی مجھ کو جان چکے ہو
میں بھی تم کو دیکھ چکا ہوں
تم اپنی گرمی سے مجھ کو بھاپ بنا کر اڑا چکے ہو
میں اپنی جرأت سے خود کو لمحہ لمحہ جوڑ لیا تو
دھرتی ماں کی گود ہری کرنے پھر اترا
خود کو کھو کر خود کو پایا
میں اپنے عرفان پہ خوش ہو کر مسکایا
تم گھبرائے۔
سورج ہو کر اک قطرے سے یوں گھبرانا
میرا مان بڑھا دیتا ہے
جیون گیان سکھا دیتا ہے
مت گھبرانا............
پھر اپنی گرمی سے خود کو بھاپ بنانا
میں مر مر کر جی لیتا ہوں / جینا مرنا کھیل ہے میرا
اسی لئے تو میرا کوئی رنگ نہیں ہے
میں سب رنگوں میں ملتا ہوں
میں قطرہ
قطروں سے مل کر بہہ سکتا ہوں
ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہوں
میں قطرہ، شبنم کہلاؤں
میں قطرہ، جھرنا بن جاؤں
میں ندی ہوں، میں ہی دریا
میں گمبھیر سمندر بھی ہوں۔
میں جس دھرتی پر رہتا ہوں
اس دھرتی کو سورگ بنانا / اُس کی گود میں پھول کھلانا
پھل دے کر اُس کو بہلانا / رنگوں میں اُس کو نہلانا
اُس کے دھبوں کو دھو دینا / ہر پل چلنا
کبھی نہ رکنا............ میرے کام
اُتنے ہی اونچے ہیں پیارے میرے نام
میں گنگا ہوں، میں زمزم ہوں
میں فرات ہوں،
مجھ سے تہذیبیں جنمی ہیں
میں مذہب کے ساتھ چلا ہوں
میں تاریخ کے ساتھ رہا ہوں
تم سورج ہو۔ / میں قطرہ ہوں۔
سب کو جیون دیتا ہوں میں
گندے چہرے دھوتا ہوں میں
بہتا قصہ، سب کا حصہ
سب کو درپن دیتا جاؤں
خود کو وار پن کرتا جاؤں!
میں نے سب کی پیاس بجھائی
کوئی میری پیاس نہ جانے
میں سب کی چتنا پہچانے
بہتا جاؤں
ہنستا جاؤں
میں قطرہ ہوں!!!

تنہا تماپوری

اے اُحد

اے اُحد! اے رازدارِ مصطفیٰ
دفن ہے تجھ میں سلیقہ پیار کا
آج تک بتلا رہی ہے تیری ذات
کتنے ہی حب نبی کے واقعات
جو بھی تیر آئے پیمبر کی طرف
خود ہوئے ہر تیر کے پہلے ہدف
ہاتھ کے وہ ڈھال آخر شل ہوئے
گھاؤ کے انعام طلحہؓ نے لئے
ہائے مصعبؓ...... نازل پروردہ جوان
جن کے پیراہن کا چرچا چارسو
آج کمبل کا چرچا چارسو
شہسوار آخرت کا پیرہن
سیدالشہداؓ کے اعضاء کٹ گئے
پیار پیغمبر کا لے کر اٹھ گئے
مِل نہ پائے گی مثال اُس وقت کی
جب کہ بھائی، باپ اور شوہر نے جان قربان کی
سارے پیارے پیارے رشتوں سے تعلق توڑ کر
پوچھتی تھیں، ہیں رسول اللہ اب کس حال میں؟
دور سے جب چہرۂ انور کو دیکھا تو کہا:
''ہر مصیبت مجھ سے اب برداشت ہوتی جائیگی''۔
اے احد! ۔۔۔ اے رازدار امتحاں

یاد ہوگا تجھ کو وہ شوق جہاد
اپنے پنجوں پر کھڑے نوعمر جب
اپنا قد اونچا دکھانے آئے تھے
راہِ حق میں سر کٹانے آئے تھے
اے احد! ۔۔۔ اے حق و باطل کے گواہ
حنظلہؓ نے کیا سنا تھا
کیسی حالت میں، کہاں سے، کس لئے آئے تھے وہ؟
چھوڑ کر کیسوں کو کیسوں کی طرف آئے تے وہ؟
تیری نظروں میں وہ منظر آج بھی ہوگا ضرور
حنظلہؓ کو غسل دینے کیوں ملائک آئے تھے؟
زندگی دلہن کی باہیں، یا کہ تلواروں کی دھار؟
زندگی سانسوں کا احساس یا شہادت کا خمار؟
درحقیقت زندگی کا راز تھا اُن پر عیاں
کلمہ توحید کے جو بن گئے تھے پاسباں۔
اے اُحد: دیکھا ہے تو نے اس جری خاتون کو
اُمِّ عمارہ تھیں، ''خاتونِ اُحد''
لے کے تلوار اور ڈھال
ہوگئیں سینہ سپر کفار کے
اک قدم آگے نہیں بڑھنے دیا
سرورِ عالم نے دی اُن کو دُعا
اے اُحد: اے رازدارِ مصطفیٰ
دفن ہے تجھ میں سلیقہ پیار کا
اے خدا:
ایک تنکا ہی سہی اُس پیار کا
میری جھولی میں ذرا سا ڈال دے
میں بھکاری ہوں اسی اک پیار کا!!

تنہا تماپوری

پہلا سجدہ

گرما کے موسم کی تپتی رات کو
چھت پر، نیم برہنہ ٹہل رہا تھا
گرم ہوا کے جھونکوں میں کچھ
ٹھنڈے لمحے ڈھونڈ رہا تھا
پیاس پسینہ پونچھ رہی تھی
شائد دوزخ نے دروازہ کھول دیا تھا......
بے چینی کی اس حالت میں
جاگتے لڑکوں نے ریڈیو کو اون کیا تھا
خمد کے مصرعے گونج رہے تھے...........
صبح ہوئی تو سب نے دیکھا
وہ سجدے میں پڑا ہوا تھا

فرحت نواز (رحیم یار خان)

دعا

ماں کے دودھ کو پینے والے
چھوٹے بچوں کے چہروں سے
کتنی معصومی اور کتنا نور چھلکتا رہتا ہے
ایسے نور کی مجھ میں کوئی لہر نہیں ہے
ماں کے دودھ کا ذائقہ تک میں بھول گئی ہوں
سوہنے ربا!
میری ماں کو اتنا عرصہ زندہ رکھنا
میں اس کو بے حد خوش کردوں
اتنا۔۔۔
جس سے میرا
جنت میں جانا بھی
غیر یقینی نہ رہ جائے
مجھے یقیں ہے
جنت کی نہروں میں ہر دَم بہنے والا دودھ
یقیناً ماں کے دودھ ایسا ہی ہوگا!

فرحت نواز

اداس آنکھوں کا روگ

جہاں بھی جاؤں
ملوں میں جس سے
وہ مجھ سے پوچھے
یہ آنکھیں اتنی اداس کیوں ہیں
میں چپ رہی ہوں، میں چپ رہوں گی
میں منتظر ہوں کہ
وہ بھی پوچھے
وہ جس نے اب تک نہ مجھ سے پوچھا
یہ آنکھیں اتنی اداس کیوں ہیں
وہ لوٹ آئے تو راستوں اور مسافتوں کی
اذیتیں ساری بھول جاؤں
وہ حشر سا ایک لمحہ بھی بھول جاؤں
کہ جب اناؤں کی سرکشی میں
ہم اپنی اپنی علیحدہ راہوں پہ چل پڑے تھے
دھڑکتے دل ڈر رہے تھے لیکن
نجانے کیوں یہ یقین بھی تھا
علیحدہ راہیں کہیں پہ جا کے تو ایک ہوں گی
ہمارے بکھرے وجود پھر سے سمیٹ لیں گی
نسوں کے اندر فسادانگیز سچے جذبے
بچھڑنے پر جو اداسیاں بن کے
میری آنکھوں میں جم گئے ہیں
یہ کہہ رہے ہیں
وہ اپنی سرکش انا کو ٹھکرا کے
اک نہ اک دن ضرور آئے گا
اور پھر ہم اسی جہاں میں ہی ایک دوجے سے مل سکیں گے
ہمارے جسموں سے لے کے روحوں تلک
یقین اور بے یقینی کے آئنوں سے مسرتیں سی چھلک پڑیں گی
نہ تب کوئی مجھ سے کہہ سکے گا
یہ آنکھیں اتنی اداس کیوں ہیں
مگر مجھے پھر بھی خوف سا ہے
نجانے کیوں مجھ کو خوف سا ہے

فرحت نواز

مجھ کو اوورٹیک نہ کرنا

مانتی ہوں میں تم کو
مجھ سے پیار بہت ہے
اور تمہارا نطق بھی گویا
لافانی لفظوں پر مبنی ایک لغت ہے
ہر موقعہ اور بے موقعہ تم
اپنے جذبوں کے اظہار کی
کم، زائد، یا کچھ گنجائش
کسی بھی صورت پا لیتے ہو
مانتی ہوں تم کر سکتے ہو جو بھی کرنا چاہو لیکن
اک پل ٹھہرو
میری بھی اک بات سنو نا!
چوراہے پر جب بھی دیکھو
لال سی بتی جلتی ہے
تو رک جانا لازم ہوتا ہے
دیر بہت ہو جائے تو پھر
کم رفتار سے چلنا ہی دانشمندی ہے
مجھ کو اوورٹیک نہ کرنا
جلدی کیا ہے
ہم دونوں کی منزل بھی
جب ایک ہے جاناں!

فرحت نواز

بچھڑتے لمحوں میں

مجھے خبر ہے
ہمارے جیون کے سنگ سانسیں کشید کرتی
تمام گھڑیوں کا وقتِ آخر قریب تر ہے
بچھڑتے لمحے دعائیں کیا دوں!
کہ اب تلک کی دعاؤں نے جو اثر کیا
اس کا زہر اب تک رگوں میں رقصاں ہے
سوچتی ہوں
تمہارے ماتھے پہ اپنے ہونٹوں سے کیا میں لکھوں
کہ جو بھی مالک نے لکھ دیا ہے وہی امر ہے
بچھڑتے لمحے
ملن کے سب موسموں کے جذبے میں تم کو دے دوں
تو کیا انہیں تم بہار آمیز رکھ سکو گے؟
میں اپنی ساری محبتیں تم کو دوں تو بولو
انہیں بھلانے میں
عمرِ فانی میں کتنی صدیوں تلک جیو گے
دعائیں۔۔جذبے۔۔محبتیں
یہ تمام دکھ ہیں
بچھڑتے لمحوں میں دکھ نہ مانگو!

فرحت نواز

کٹی پتنگ

کٹی پتنگ کی مانند تم بھی
کسی بھی آنگن میں جا گرنا
اس نے ٹھیک لکھا ہے لیکن
ایسا ہونا لازم ہے کیا
کٹی پتنگ تو دور کہیں
ویرانے میں بھی گر سکتی ہے

فرحت نواز

جواب

تم کو اپنی ذات کے اندر
کے موسم کا حال کیا لکھوں؟
کیونکہ میں تو کئی رتوں سے
اپنی ذات سے باہر بیٹھی
راہ تمہاری دیکھ رہی ہوں!

فرحت نواز

ایک شکایت

سارے سچے شعر تمہارے
اپنا حسن گنوا بیٹھے ہیں
یا پھر اپنے دل کی بات بتانے کے
معصوم بہانے بھول گئے ہو
کیونکہ میں یہ دیکھ رہی ہوں
کئی دنوں کے بعد بھی جب تم آتے ہو
نہ مجھ کو شعر سناتے ہو
نہ سننے کو ہی کہتے ہو
آتے ہو اور سامنے بیٹھے
بس مجھ کو چپ چاپ ہی تکتے رہتے ہو

فرحت نواز

ہجرت

سرداروں کی یورش ہر پل بڑھتی جائے
میرے چاہنے والے!
سب ہی تیری جان کے دشمن ٹھہرے
میری مانو
میری من بستی سے تم ہجرت کر جاؤ
خدا کرے کوئی امن محبت کی دھرتی تم کو مل جائے
ساتھ تمہارے کیسے ہو لوں
بعد میں آنے کا وعدہ بھی کر نہیں سکتی
میرے پاس امانتیں ہیں جو
کس کو سونپوں؟
کوئی بھی ذمہ لے نہیں سکتا
ظاہر ہے اپنے بستر پر
مجھ کو خود ہی سونا ہوگا!

فرحت نواز

بن باس میں ایک دعا

اب کے لچھمن میرے گرد
حفاظت ریکھا کھینچ کے جانا
بھول گیا ہے
لیکن ریکھا نہ بھی ہو تو کیا خدشہ ہے
ہر آفت میں مجھ کو میرے بن باسی
کے سچے پیار کی ڈھال بہت ہے
یوں بھی میرا اس کی خاطر
دنیا کی ہر ایک بلا سے
اپنا آپ بچا رکھنے کا اپنے آپ سے وعدہ ہے
مجھ کو تو بس تنہائی سے ڈر لگتا ہے
اور خدا سے ایک دعا ہے
میرے بن باسی کو اتنی دیر نہ ہو کہ
جسم کے اندر خواہش کا لوبان سلگ کر بجھ جائے
اور پیاس چمک کر مٹ جائے
میرے مالک!
میرے بن باسی کو اتنی دیر نہ ہو کہ دنیا مجھ کو
پھر دوبارہ شک سے دیکھے
پھر ویسا بہتان لگے!

فرحت نواز

ڈائلما

Dilemma

دکھ یہ ہے کہ ہم دونوں
اک دوجے کو پا ہی نہیں سکتے
اس سے بھی بڑھ کر دکھ یہ ہے کہ ہم دونوں
اک دوجے کو کھو کر بھی تو جی نہیں سکتے
پا لینے اور کھو دینے کے بین بین
کوئی رستہ ڈھونڈو
اور ہاں دیکھو!
ریستوران کی لمبی میز کے دو کونوں پر
اپنے آگے ٹھنڈی ہوتی چائے رکھے
یوں ہم دونوں
آخر کب تک بیٹھے رہیں گے!

فرحت نواز

وصیت

جیون بھر میری سانسوں نے
نام نسب کا بوجھ اٹھایا
مر جاؤں تو
مجھ پر سے یہ سارا بوجھ ہٹا دینا
میرا کتبہ جب لکھنا تو اس کے اوپر
میرا نام محبت لکھنا
اور وفا کو شجرہ لکھنا
پیشہ لکھنا قلم کی محنت
عمرِ رواں کے آگے لکھنا
لا حاصل خوابوں کی گنتی
یہ سب گر نہ لکھ پاؤ تو
بے شک میری تربت کو
گمنام ہی رکھنا------!

فہیم شناس کاظمی (کراچی)

محبت کے روشن ساحل پر

پھول کھلنا چاہتا ہے
نیند کی بے خواب جھیلوں کے
کناروں پر کہیں
خواب ملنا چاہتا ہے
زندگی سے جگمگاتی
اس کی آنکھوں سے کہیں
چاند چلنا چاہتا ہے
کہر میں ڈوبی ہوئی ان بستیوں کے
بھیگے رستوں پر کہیں
دل نکلنا چاہتا ہے
شام کی ٹھنڈی ہوا میں
زندگی آمیز ساحل پر کہیں
غم مچلنا چاہتا ہے
یاد کی راہداریوں کے
نرم گوشوں میں کہیں

فہیم شناس کاظمی

مسافر

ہم بناتے ہیں گھر
شام کی راہ پر
دھوپ کے دشت میں
ابر کی شاخ پر
رات سے کچھ ادھر
خواب کے باغ میں
موت کی سرحدوں سے
ذرا سا اِدھر
ہم بناتے ہیں گھر
اور تم سفر پر نکل جاتے ہیں

☆☆☆

مہکتی یاد

رات
ہوا
اور ترچھی بارش
خاموشی کا میلا آنچل دھوتے ہیں
اور روتے ہیں
اور کشتی جلتی رہتی ہے

جنگل ہنستا رہتا ہے
دریا دیکھتا رہتا ہے
ہر دھارے کو
دور اُفق پر جلتے ہوئے ستارے پر
یاد مہکتی رہتی ہے
آگ دہکتی رہتی ہے

☆☆☆

روز تماشا ہوتا ہے

اک اُجلے خواب کی لہر
روز بہالے جائے ہم کو
بھنور بھنور گہرائی میں
یہ مرجانی......
خصماں کھانی
روز کمائے قہر
چاند کو دفنائے تو روئے
رات کے پچھلے پہر
اک آہٹ سے پل میں اُجڑے
بسا بسایا شہر
عریاں آنکھیں
بکھرے سپنے
دیکھنے آئے دہر

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

رسم و رواج

مکڑی
اک نقطے سے
کام شروع کرتی ہے
سُندر......اُجلا......دلکش
وہ نقطے کے چار طرف ریشمی جالا بنتی ہے
پھر مہکے اُجلے سارے حرف
ساری زباں کھا جاتی ہے
مکڑی زباں کو کھا کے
لبوں کے در پہ جالا بنتی ہے
پھر گھر پہ جالا بنتی ہے
پھر شہر پہ جالا بنتی ہے
پھر تہذیبیں کھا جاتی ہے
پھر..................

☆☆☆

پُرمشقت عمر کا حاصل

ایک قدم دہلیز پہ ہے
اور ایک قدم ہے راہ پر
اور اس کے بیچ میں
ساری عمر کی

دُھول اڑاتی دوپہر
تنہائی کی پھیلی دھوپ

☆☆☆

محبت ! خواب۔خوشبو

ندّی کے سنہرے پانی پر
کوئی سُرخ گلابی پھول گرا
پتّا تیرا
کوئی ناؤ چلی
خاموش کنارا مسکایا اور
محبت چاروں جانب پھیل گئی

☆☆☆

سانحہ

شام......
کوؤں کے غول سی اتری
اور
کوئل بھی کُوک بُھول گئی
سبز کھیتوں میں............
..........................منجمد رستے
دُھوپ......
......شاخوں کے ساتھ جُھول گئی
زندگی سارے خواب
بُھول گئی

☆☆☆

خرم خرام صدیقی (اسلام آباد)

آمد

ایسے وہ قریہ دل میں آئے
جیسے کسی کی کھوجتی آنکھیں
روح میں جھانکیں
اور صبا میں نرمی سے ہلکورے لیتی زلفیں
رُخ پہ بکھرتی جائیں
جیسے دہکتے عارض پر
تحسین بھری اک دید کا لمس
حدِّ نظر تک جا کر کوئی
یوں ہی اچانک مڑ کر دیکھے
کچھ کہتے کہتے رُک جائے
جیسے کسی نغمے کی دُھن تو یاد رہے
پر بول نہ یاد آئیں
جیسے سحر کے وقت فلک پر
رنگ شفق کا بکھرے
شام کو جیسے سارا مطلع
ایک سنہرا رنگ نہائے
جیسے لبوں تک آتے آتے
جام اچانک چھلک سا جائے
ایسے وہ قریہ دل میں آئے!

خرم خرام صدیقی

افسوں

یوں لبِ یار نے پھونکا مری جانب افسوں
چشمِ حیراں پہ کھلا حسنِ جہاں کا پرتو
اتنے مدہم سے سروں میں وہ ہوا محوِ کلام
جیسے ہولے سے ہوا عارضِ گل کو چومے
تارِ دل پر یوں رکیں اس کی ملائم پوریں
بزمِ احساس میں اک نغمۂ شیریں بکھرا

سانس کی لے سے ہم آغوش ہوئی دل کی کسک
اور لب بستہ خموشی میں وہ ہم راز بنا
پھر بھی خواہش درِ احساس پہ دستک دے کر
نگہِ شوق کے ادراک سے پوشیدہ رہی
دل کے پہلو میں کوئی درد تڑپ کر جاگا
اور پھر خون کی رفتار میں معدوم ہوا

خرم خرام صدیقی

سحر کے انتظار میں...

سحر کے انتظار میں تمام خواب سو گئے
چراغ بجھ گئے طویل رات کے حصار میں
کہیں پہ ٹمٹمائی گر کسی نظر کی روشنی
مہیب آندھیوں نے اک غبار میں بدل دیا
کہیں پہ جھلملائی یاد کی کوئی کرن اگر
تو خامشی کے اژدہوں نے اس کو بھی نگل لیا

سحر کے انتظار میں مگر یہ دل تھا پُر یقیں
کہ آئے گا نظر ابھی ترے جمال کا قمر
نثار ہو گا دل ترے رخِ حسیں کی تاب پر
فگار ہوں گی انگلیاں بس اک نگہ کی آب پر
چمک اٹھے گی تیرے لب کی احمریں شگفتگی
جلے گی دل کی انجمن میں پھر سے شمعِ وصال

سحر تو آ گئی یقیں کی روشنی چلی گئی
بہم تو ہم ہوئے مگر وہ دلکشی چلی گئی

خرم خرام صدیقی

ایک ملاقات

عمر کی پیچیدہ راہیں
اور تیری زلف کے انجان خم
زندگی میں اک محبت کی کمی
ایک ویرانی ہے آنکھوں میں سمٹتی شام میں
ایک حسرت ہے تیری قربت چھلکتے جام میں

روشنی بھرتی ہے آنکھوں میں بدن کے زاویے
ان کہے الفاظ، ان دیکھے سفر
پھیلتے جاتے ہیں دن کے سامنے
اپنی آنکھوں میں سمو لے میرے خواب
اور مجھ سے نیند کی وادی میں مل
بے محابا، بے حجاب

خرم خرام صدیقی

بھوک

آگ اگلتا سورج میرے خال و خد جھلساتا ہے
اس کی کرنیں، تیروں پر لپٹے دوزخ کے شعلے ہیں
سکڑی ہوئی بے بس آنکھوں سے دیکھتا ہوں
آکاش کو جب
ست رنگی اور تیز شعاعیں نوچتی ہیں بینائی کو
محرومی کی ایک قطار میں کھڑا ہوا ہوں مدت سے
ایک بازیگر جیسے سرکس کی رسی پر تنا ہوا
ایک قدم بڑھنے کی بھی اب سکت نہیں باقی مجھ میں
جرمِ ضعیفی کی خفت سے ڈھیر ہوا ہوں راہوں پر
جنت سے جس خاطر نکلا اس دوزخ میں جلتا ہوں
دانۂ گندم کی حسرت میں یا رب روز میں مرتا ہوں

محمد زبیر ٹیپو (اسلام آباد)

سفر کی تھکن

انشائیہ

وہ سفر جو بڑے بڑے خوابوں کو مدنظر رکھ کر کیے جاتے ہیں ۔انکی کامیابی کا بڑا پختہ یقین ہوتا ہے اور کامیابی میسر نہ آ سکے تو واپسی پر تھکاوٹ سے بخار ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کچھ ایسا ہی مَیں بھی محسوس کرتا ہوں۔ یہ سفر کسی کے سبز باغ دکھانے پر اختیار کیا یہ سفر اندرون ملک کا نہیں، بلکہ بیرون ملک سے اس کا تعلق ہے جہاں مجھ سے پہلے بڑے بڑے لیڈر گئے اور بامراد لوٹے۔ یہ سفر انگلستان کی زمین کا تھا شاید گھر والوں کے بھی میرے اس سفر کے متعلق کچھ خواب ہوں ۔ میرا اور گھر والوں کا خواب حقیقت کے رنگ میں تبدیل ہوگیا۔ مجھے انگلستان کا ویزا مل گیا پڑھائی میں میرا کوئی خاص اچھا ریکارڈ نہیں تھا عام سا طالب علم ہوں۔اس پر یہ ویزا ایک لاٹری کی حیثیت رکھتا تھا۔سو سفر انگلستان کیلئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدے گئے شاپنگ بھی کی گئی اس سفر میں والد صاحب میرے ساتھ تھے۔آپ مجھ سے ایسے سفر نامے کی توقع نہ رکھیئے گا جس میں اہل یورپ کو مادر پدر آزاد بتایا جاتا ہے۔اور بھر پور جنسی کشش سے سفر نامے کو دلچسپ بنایا جاتا ہے۔

ہم پاکستان کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو وہاں کے ایک آفیسر نے ہمارے پاسپورٹ رکھ لیے اور کوئی سرسری الزام لگایا شاید اسے ویزے اصل نہیں لگ رہے تھا۔مَیں پہلے اس کو جواب دینے لگا تو والد صاحب نے منع کر دیا۔اس صاحب کا خیال تھا کہ ہم اُسے پیسے دیں گے۔اس نے اپنے میز کی ایک جانب ہمیں مجرموں کی طرح کھڑا کر دیا۔ جب کافی دیر ہو چکی۔تو اس نے دونوں پاسپورٹ واپس کر دیئے ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک اسلامی ملک کی ایئر لائن تھی۔ ہوائی اڈے پر دو گھنٹے کا وقفہ تھا پھر اگلی پرواز ملنی تھی۔ مجھے تو انگلستان سے زیادہ یہ اسلامی ملک مادر پدر آزاد نظر آیا۔ بہرحال ہم انگلستان کے ہوئی اڈے پر اُترے تو وہاں کے ایک آفیسر نے دونوں پاسپورٹ دیکھے۔ پہلے والد صاحب کا پاسپورٹ تھا۔تو وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔۔ڈیر سر خوش آمدید ان یو۔ کے والد صاحب سے لیکچرار شپ کے بارے میں اور خصوصاً جب اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ والد صاحب اردو زبان پڑھاتے ہیں۔اور ادب بھی لکھتے ہیں۔بیس منٹ سے زیادہ خوش گوار موڈ میں باتیں ہوئیں۔ مجھ سے کوئی سوال نہ کیا صرف والد صاحب کو کہا یہ آپ کا بیٹا ہے۔ جی۔ دونوں پاسپورٹوں پر چھ ماہ کا انٹری ویزہ لگا دیا۔ والد صاحب کے ہاتھ سے اس آفیسر نے بیگ لے لیا اور ہمیں پارکنگ ایریا تک چھوڑنے آیا۔ جہاں ہمارے عزیز منتظر تھے۔اور معذرت چاہی اگر کوئی تکلیف ہوئی ہو۔اُس نے باپ بیٹے کی سادگی پر کوئی اعتراض نہ کیا نہ ہی والد صاحب کے لیکچرار ہونے کو گمان جانا۔

والد صاحب دو ہفتے کے بعد واپس پاکستان آ گئے اور مَیں قسمت آزمائی کیلئے وہاں کام میں معروف

ہو گیا۔ بغیر اجازت کے کام کرنے میں مزدوری کم محنت و ذلت زیادہ اُٹھانی پڑتی ہے پھر کبھی کام ملتا ہے، کبھی نہیں۔ کبھی کبھار بھوکا سوکھا بھی سونا پڑتا تھا اور بیمار ہو جائیں تو پرائے دیس کی پرکشش خوبصورتیوں کو دیکھ کر صحت یاب نہیں ہُوا جا سکتا۔ کبھی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہاں زندگی پاکستان سے ہزاروں گنا بہتر ہے۔صرف چند پونڈ ہمیشہ آپ کے پاس ہونے چاہیں۔تو وہاں آپ اپنے آپ کو امیر آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ پاکستان کی بات رہنے دیجئے پیسے ہوں بھی تو آپ متعلقہ جگہوں اور سہولتوں کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔لطف اندوز ہونے کے سفر میں تھکاوٹ محسوس کریں گے۔ پھر ٹرینوں اور بسوں میں ایک ہی ٹکٹ خرید کر سارا دن سیر کی جا سکتی ہے۔کھانے اچھے کھا سکتے ہیں لیکن کھانوں میں وہ لذت نہیں جو پاکستان میں ہے۔ایک سو پونڈ پورے ہفتے کے لیے کافی ہے۔اگر رہائش مفت میں میسر ہو۔

پاکستان میں مَیں سات ہزار تنخواہ لے رہا ہوں دس سال کی نوکری کے بعد لیکن مَیں سائیکل ہی خرید اور چلا سکتا ہوں۔اور جو سائیکل خریدنی ہے تو کمیٹیاں ڈال کر۔جبکہ وہاں بلیک میں بھی کام کریں تو چار ماہ بعد سات آٹھ سو پونڈ کی اچھی حالت میں چھوٹی گاڑی خرید سکتا ہوں اور اس کے ہفتہ وار اخراجات بھی برداشت کر سکتا ہوں ۔وہاں صرف ایک تکلیف ہوتی ہے۔وہ وہاں کی تنہائی دوسری اہم بات جو ضمیر کو کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ وہاں کے ہوٹلوں میں کام کاج کرنا۔کھانے تیار کرنا اور صفائی وغیرہ کرنا۔ یہ سب کچھ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا دوسرا جو تجربہ دیکھنے کو ملا۔فرض کیا وہاں شادی ہو جاتی ہے۔خواہ دلہن آپ وہاں سے یا پاکستان سے لے لیں۔میں ہوٹل یا کوئی دوکان کھول لیتا ہوں۔تو کچھ عرصے بعد خاتون خانہ بھی ہوٹل میں کام کرنے آ جاتی ہے پھر اولاد میں کوئی زیادہ لائق نہیں تو وہ بھی اُسی جگہ مزدوری کرنے آ جاتا ہے۔اور وہ اولاد جس کے اخراجات بہت ہوں وہ بھی اوور ٹائم کیلئے باپ کی دُکان پر آ جاتی ہے، مستقبل کی یہ تمام باتیں مجھے پریشان کر جاتیں پاکستان میں دادا، پردادا اور پھر والد کی عزت و توقیر سامنے آ جاتی۔تو مجھے انگلستان میں اپنا آپ اجنبی محسوس ہوتا۔نزدیک کی پارکوں میں سیر کیلئے بھی جاتا تو مجھے ان سے بہتر اسلام آباد میں میرے گھر سے قریب ترین پارک ارجنٹائنہ یاد آ جاتی، روز باغ یاد آ جاتا۔شکر پڑیاں اور دامن کوہ کے وسیع و عریض پہاڑ ستانے لگتے۔ راول ڈیم جا کر کشتیوں کی سیر اور چاروں اطراف کے حسین مناظر کی بات ہی کچھ اور ہے۔جو شاید کسی بھی سیاح کے لیے نایاب ہوں۔میرا ویزہ ختم ہونے سے ایک دن پہلے عزیز نے فون کیا کہ تمہارے سیٹ ہونے کے لیے دوسرے یورپی ممالک کی بھی کوشش کی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تمہیں پاکستان واپس جانا ہوگا۔

بہر حال مَیں نے پاکستان آتے ہی اپنی تعلیمی صورت حال بہتر کی۔ ٹیلی فون آپریٹر کی نوکری حاصل ہوئی۔ جو مجھے وہاں کی زندگی سے ہزاروں طرح بہتر لگتی ہے۔ یہ تھکاوٹ جسمانی تو نہیں ہو سکتی۔صرف ذہنی ہو سکتی ہے اور آپ جانتے ہیں۔ کہ جسمانی تھکاوٹ کی نسبت زیادہ محسوس ہوتی ہے ۔لیکن ان باتوں کا انحصار ہمارے سوچنے پر ہے۔ہم چاہیں تو اپنی قوت ارادی سے ہر قسم کی تھکاوٹ کو ذہن سے اُٹھا کر دور پھینک سکتے ہیں۔مَیں اب یہی کرنے والا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے۔کہ مَیں پردیس سے جہاں میری کوئی عزت اور کوئی استحقاق نہیں تھا۔اب واپس اپنے گھر آ گیا ہوں۔ جہاں میری عزت بھی ہے اور استحقاق بھی۔

محمد زبیر ٹیپو

انشائیہ

ہمسائیہ

مدت ہوچکی مجھے انگلستان سے واپس آئے ہوئے۔مَیں کچھ مسائل کی وجہ سے وہاں رہنا نہیں چاہتا تھا۔یہ بات مَیں نے اپنی پچھلی کسی تحریر میں کہی تھی۔مَیں جہاں کام کرتا تھا اس کے اوپر دو منزلہ عمارت اور تھی، نیچے والی منزل کی پچھلی جانب بڑا سا صحن جو ہمیشہ انگلستانی خزاؤں کی داستانیں سناتا تھا معلوم نہیں کتنی صدیوں سے خشک اور پیلے رنگ کے پتے اپنی بے شمار تہوں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔تو مجھے ایک دن شوق ہوا۔ان پتوں کو ہٹایا جائے کوشش کرنے سے پہلے مَیں نے ایک ڈنڈا نما آلے کی مدد سے گہرائی معلوم کی تو دو فٹ سے زیادہ کی تھی۔پہلی منزل پر سیڑھیوں سے چڑھتے ہی ایک تھڑا آتا تھا پھر دروازہ کھلتے ہی کچن نظر آتا تھا کچن سے آگے ایک چھوٹی سی گلی جس کے بائیں طرف باتھ اور لٹرین اُس سے آگے تین قدموں کی سڑھیاں تھیں چڑھتے ہی بائیں طرف اور سامنے دو کمروں کے دروازے پھر اوپر سیڑھیاں تھی تیسری منزل کی سڑھیاں ختم ہوتے ہی بائیں طرف دو بڑے کمروں کے دروازے تھے اور سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے کمر کو جھکانا پڑتا تھا۔مَیں نے دو مہینے بڑی تنہائی میں بسر کیے۔ایک دن راستے میں چلتے ہوئے الیکٹرونک کی دوکان نظر آئی، اندر گیا تو ٹیپ ریکارڈر موجود تھے مَیں نے بیس پونڈ کا ٹیپ ریکارڈر خریدا اور گانوں کی دو تین کیسٹیں۔اب یہ کیسٹیں تنہائی کے وقت کا قیمتی سرمایہ تھیں۔یوں کہیئے کہ تنہائی میں دماغ رنگین یادوں کو اس ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے لطف اندوز کرتا۔انگلستان برفانی ملک ہے سب گھر لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔

یوں مجھے کلاسک میوزک سنتے ڈیڑھ مہینہ ہو چکا مجھے انگلستان کے موسم سے کبھی وحشت نہیں ہوتی تھی بلکہ خزاں اور برسات تو میرے پسندیدہ موسم ہیں۔مجھے وحشت ہوتی تھی جب مَیں کام کرنے کے بعد واپس آتا یا کام کیلئے نیچے جاتا تو ہمسائے کا کتا خوب استقبال کرتا۔بلکہ اچھلتا، کودتا، چھلانگیں مارتا، منہ سے جاگ نکالتا۔درمیان میں لکڑی کی پانچ فٹ کی باریک لمبی دیوار تھی۔

اس کے مالک کی بھی دُکان تھی وہ سارے گھر اور دوکان کا راج دلارا معلوم ہوتا تھا۔اتنا بدمعاش تھا کہ جب دکان جائیں تو آنکھیں بند کر لیتا اور دُم سے خوش آمدید کہتا، اور اپنے صحن میں میرے گزرنے کا انتظار کرتا تو خوب ہلا گلا کرتا۔بد سے بدنام بُرا والی کہاوت مشہور ہے۔مجھے بعض دفعہ اپنے آپ میں ان دیکھا چور نظر آتا۔اس بات کا میرے پاس کوئی حل نہیں تھا بہرحال مَیں اپنے کمرے میں جا کر رفیع، میکش، لتا، نور جہاں کے گانے

سنتا ورد نیا سے بے نیاز ہو جاتا۔رات گے تک سنتا رہتا۔زندگی کے شب وروز جاری تھے ایک دن میں کسی کام سے ساتھ والی دُکان پر گیا۔کتا صاحب نے میرا استقبال دُم ہلا کر کیا آنکھیں فرش پہ بچھا دیں۔یہ دُکان دو میاں بیوی چلا رہے تھے۔کافی جواں سال تھے گفتگو کا آغاز ہوا۔تو معلوم ہوا وہ غیر مسلم ہیں میرے کمرے میں لگی موسیقی کی آواز انہیں رات کو خوب سنائی دیتی ہے۔انہوں نے مجھے کہا آپ ایشین ہیں اور انڈین ہیں۔مَیں نے کہا ایشین ضرور ہوں لیکن انڈین نہیں پاکستانی ہوں، اور مسلمان۔ تو انہوں نے کہا ہماری آپ سے ایک درخواست ہے کہ اپنا ٹیپ ریکارڈر رات کو نہ بجایا کریں مَیں نے کہا اُسکی آواز ہلکی سی ہوتی ہے انہوں نے کہا کلاسک کی آواز ہلکی ہونے کے ساتھ باریک ہے اور ہماری سمجھ سے باہر ہے ورنہ ہم بھی لطف اندوز ہوتے۔

بات سے بات نکلتی ہے سو مَیں نے بھی اُن کے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔کہ مجھے تو پچھلے ساڑھے تین مہینوں سے آپ کا کتا خوف زدہ کیے ہوئے ہے۔با آواز بلند چور چور پکڑو پکڑو کے نعرے اپنی آواز میں بلند کر رہا ہوتا ہے۔مجھے احساس شرمندگی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔آپ کا معاملہ تو معمولی نوعیت کا ہے۔ابھی میری بات ختم ہی ہوئی تھی۔اُن کی بیگم نے کریم کافی کا کپ مجھے پیش کیا اور سائیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ۔خواتین کے اشارے پر تو مشرقی کیا مغربی بھی تگنی کا ناچ ناچنے کے لیے ہر پل تیار رہتے ہیں۔میں نے فوراً ان کی آفر قبول کی اور ان کے ہاتھ سے کافی کا کپ پکڑا خوش اخلاقی کے طور پر وہاں کا میزبان اپنی انگلیوں کے لمس بھی مہمان کے ہاتھوں کی انگلیوں کو لگاتے ہیں۔پھر کپ واپس لیتے ہوئے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔مَیں کافی پی رہا تھا ان کے میاں نے مجھے ہیڈ فون دیا اور کہا اس کے ذریعے میوزک سنا کریں۔ مَیں نے قیمت معلوم کی تو ہنس کر کہنے لگا، سکون۔تو مَیں نے کہا سکون سے زیادہ عزت نفس اور جان، تو تینوں کا قہقہ بلند ہوا، چوتھا قہقہ کتے صاحب نے آخر میں لگایا۔

مَیں ہیڈ فون لے کر اپنی دوکان پر واپس آ گیا اور شام کو واپس اپنی بالائی منزل پر چڑھنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں ایک بڑا سا پنجرہ ہے اور کتا صاحب باحفاظت اس میں گشت کر رہے ہیں۔لیکن ابھی بھی اپنی اوچھی حرکت سے باز نہیں آیا لیکن اب اس میں اور مجھ میں دو فٹ کا طویل فاصلہ موجود تھا مَیں نے اُس کی غیرت پر ذرا زور سے تھوکا۔تھوک اس کے منہ پر پڑا۔پر وہ اپنی ڈیوٹی سے ہٹا نہیں۔

تو آج مَیں نے محسوس کیا کہ انسانوں کے تعلقات کے درمیان کوئی چیز اور مذہب کبھی حائل نہیں ہوسکتا۔بظاہر جن کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ بڑے بُرے ہیں ان کی کردار کشی کی باتیں سُنی تھیں مجھے تو ایسی ہی کُھن مجھے غیر مسلموں سے بھی تھی لیکن جب مجھے اس ہمسائیہ غیر مسلم کا معلوم ہوا۔تو میرے تاثرات اور خیالات حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو گے۔

تمام مذاہب انسان کے اندر اچھائی کو تلاش کر کے اس کی پالش کرتے ہیں۔اور مجموعی طور پر تمام تعلیمات ایک ہی ہیں۔یعنی انسان کی شعوری پرورش کرنا ہے۔مَیں چاہتا ہوں ان غیر مسلموں کی طرح ہمارے پاکستانی بھائی بھی اپنے اپنے کتے باندھ کر رکھیں۔تا کہ ہمسائیوں کو امن و سکون کے ساتھ احساس تحفظ بھی حاصل ہو۔

حیدر قریشی (جرمنی)

زندگی دَر زندگی

یادوں کے گزشتہ باب **لبیک اللھم لبیک** کی اشاعت کے بعد میرے قریبی دوست احباب نے میرے ۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء والے خواب اور اس کی ممکنہ تعبیر کے سلسلے میں مزید اپنی اپنی رائے سے نوازا ہے۔ بعض تاثرات دوستوں اور بزرگوں کی محبت یا ہمدردی پر مبنی ہیں۔ بعض تاثرات میں خواب کو واہمہ جیسا سمجھا گیا ہے اور مجھے بھی یہی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)، محمد عمر میمن (امریکہ)، شمیم حنفی (دہلی)، ڈاکٹر علی جاوید (دہلی)، اشعر نجمی (تھانے)، سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)، منشا یاد (اسلام آباد) وغیرہ اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ البتہ ان میں سے منشا یاد نے تو کسی حد تک غصہ کر کے میری توجہ موت کے احساس سے ہٹانا چاہی جبکہ شمیم حنفی نے میری تحریر کو ادبی طور پر بہت پسند کرتے ہوئے مجھے مزید لکھنے کی تحریک کی۔ ایوب خاور (کراچی)، خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)، شبانہ یوسف (انگلینڈ)، ارشد خالد (اسلام آباد)، عبدالرب استاد (گلبرگہ)، احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)، عظیم انصاری (کلکتہ) ان احباب نے تو بہت زیادہ جذباتی جوش کے ساتھ میرا خیال رکھا۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پروین شیر (کینیڈا)، شہناز خانم عابدی (کینیڈا)، ڈاکٹر صغریٰ صدف (لاہور)، سلیمان جاذب (دبئی)، بشریٰ ملک (جرمنی) وغیرہ احباب جیسے درازیٔ عمر کی دعا میں مشغول ہو گئے۔ جوگندر پال جی کا ٹیلی فون آگیا، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میرا حوصلہ بڑھاتے رہے، تحریر کی سچائی پر داد دیتے رہے۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ آپ کے ''خود وفاتیہ'' طرز کی تحریر ہے، کہنے لگے: تمہاری واردات بہت گاڑھی ہے۔ بعض احباب نے خواب کا غلط ہونا قرار دیا ہے تو بعض نے اس کی تاویل کر کے تعبیر کسی اور زاویے سے دیکھی ہے۔ مذکورہ بالا احباب کے تاثرات اگر یکجا کرنے بیٹھوں تو پورا ایک باب بن جائے گا، لیکن ظاہر ہے وہ سارا میٹر ان کی میرے تئیں، محبت اور ہمدردی کا غماز ہے اس لیے اسے یہاں درج کرنے کی بجائے ذاتی ریکارڈ میں ہی سنبھال رکھتا ہوں۔

تین تاویلیں ایسی ہیں کہ میں انہیں یہاں درج کرنا چاہوں گا۔ میرے ماموں صادق باجوہ کا کہنا ہے کہ خواب میں موت سے مراد لمبی عمر ہے۔ میرے خیال میں خواب میں کسی زندہ انسان کی موت کی خبر ملنا یا اسے مردہ دیکھنا تو اس کی لمبی عمر کی علامت ہو سکتی ہے لیکن اس طرح معین تاریخ وفات کی خبر سے مراد لمبی عمر شاید نہیں

بنتی۔ باقی واللہ اعلم۔

کینیڈا سے عبداللہ جاوید صاحب کی تاویل مجھے مزے کی لگی۔ ان کے بقول: جیسے کسی بچے کو کسی شرارت یا کام سے روکنے کے لیے کسی تاریک کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر دکھایا جائے اور پھر دروازہ بند کر کے بچے کو ڈرایا جائے کہ اگر تم شرارت سے باز نہ آئے تو تمہیں اس کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح ۳ دسمبر کی تاریخ بتا کر اللہ میاں نے موت کے تاریک دروازے کا ڈراوا دیا تھا۔ لیکن یہ ضدی بچہ شرارت کو چھوڑ کر دروازے کے اندر میں دلچسپی لینے لگا۔ دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا کہ شرارت ورارت کا معاملہ چھوڑیں یہ دروازہ کھولیں مجھے اس کمرے میں جانا ہے۔ دیکھوں تو سہی اندر کیا ہے۔ جب دروازہ نہیں کھلا تو ۲۶ نومبر آنے تک اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکانا شروع کر دیا، اور پھر ۲۶ نومبر سے ۳ دسمبر تک اس بچے نے دروازہ کھٹکھٹانا اور شور مچانا جاری رکھا۔

ایک طرف تعبیر و تاویل کا یہ سلسلہ تھا دوسری طرف بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ خواب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس پر میری اہلیہ مبارکہ نے بڑی انوکھی نشان دہی کی۔ مبارکہ کی تاویل بیان کرنے سے پہلے دو وضاحتیں کر دوں۔ پہلی وضاحت: اپنے قریشی ہونے کی نسبت سے، اپنی تمام تر کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود میں خود کو ہمیشہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی آل میں شمار کرتا ہوں۔ مجھے گہرا احساس ہے کہ روحانی سطح پر مجھ خاک کی اُس عالمِ پاک سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ پر کچھ ہے تو سہی۔ دوسری وضاحت: خواب کی تعبیر و تاویل میں جو ایک مماثلت کا بیان آگے آنے والا ہے، وہ صرف خواب کی تفہیم کے سلسلہ میں ایک مثال کے طور پر ہے، وگرنہ میں ابراہیمی سمندر کے سامنے ایک قطرہ اور صحرا کے سامنے ایک ذرہ جتنی وقعت کا بھی حامل نہیں ہوں۔ یہ وضاحت اس لیے نہیں کر رہا کہ کوئی مذہبی انتہا پسند میری بات سے کوئی اشتعال انگیزی نہ کر گزرے۔ بلکہ اس لیے کر رہا ہوں کہ اس اظہار کے نتیجہ میں کہیں میرے اپنے اندر کوئی فتور نہ آجائے۔ بس میری یہ تحریر مجھے میری اوقات کا احساس دلاتی رہے۔

ان وضاحتوں کے بعد مبارکہ کی بیان کردہ تعبیر و تاویل پیش کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ انہوں نے بیٹے کو اپنا خواب بتایا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً خواب کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اب صورتحال یہ بنی کہ باپ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے اور بیٹا قربان ہونے کو تیار ہے۔ جب خدا نے دیکھا کہ باپ بیٹا دونوں اس کی رضا پر راضی اور اس کے حکم کی تعمیل پر کمربستہ ہیں تو قربانی کے حکم کے باوجود ذبح کرنے سے روک دیا گیا اور خواب کی تعبیر مینڈھا بھیج کر پوری کر دی گئی۔ یوں خواب دوسرے رنگ میں پورا ہو گیا۔

میرے خواب میں ایک معیّن تاریخ وفات کی خبر کے بعد میری طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی موت کا ڈر یا خوف پیدا نہیں ہوا۔ اسی برس پے در پے دہلا دینے والے سانحات نے بھی مجھے کسی یاس انگیز کیفیت میں نہیں جانے دیا۔ **لبیک اللھم لبیک** میں جتنا میں ہشاش بشاش ہوں اتنا ہی میں گزشتہ برس اپنی زندگی میں ہشاش

بشاش رہا اور ۳ دسمبر کا وعدۂ وصل کی طرح انتظار کرتا رہا۔ میری اس کیفیت کو میرے وہ تمام عزیز اور احباب بخوبی جانتے ہیں جو گزشتہ برس میرے ساتھ مسلسل رابطہ میں رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس خدا نے یہ خواب دکھایا تھا اور جو ہمارے دلوں کے بھید ہم دل والوں سے بھی زیادہ جانتا ہے، وہ بخوبی جانتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں کس حد تک راضی برضا ہو گیا تھا۔ سو موت کی خبر پا کر اس کے لیے کسی خوف کے بغیر آمادہ ہو جانے کی سال بھر کی کیفیت کو دیکھ کر میرے خدا نے بھی ۳ دسمبر کی تعبیر کسی اور رنگ میں بدل دی۔ کس رنگ میں بدلی؟ یہ ابھی تک مجھے بھی علم نہیں ہے۔

کچھ عزیزوں نے کہا کہ اللہ کے نیک بندوں پر بیماریوں کی یلغار کی صورت میں ابتلا اور آزمائش آتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں ان بلاؤں کے آنے پر شاکی نہیں ہوں لیکن خدا کی قسم میں اللہ کا نیک بندہ نہیں ہوں ،اس کا گنہگار بندہ ہوں۔ ایک کرم فرمانے فرمایا کہ یہ گناہوں کی سزا ہے۔ میں نے کہا میری گناہوں کے سلسلہ میں اپنی ایک سوچ ہے۔ میں تکبر، رعونت، فرعونیت خواہ وہ کسی صورت میں ہو اس لعنت سے ہمیشہ بچتا ہوں۔ ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے کسی کی بے جا تذلیل نہ ہو جائے۔ کسی کی زیادتی کا بدلہ ضرور لیتا ہوں لیکن اس زیادتی کے برابر، پوری طرح ناپ تول کر۔ میرے نزدیک تکبر، رعونت اور فرعونیت چاہے کسی رنگ، روپ اور بہروپ میں ہو۔۔ سب سے بڑا گناہ ہے۔ ریا کاری والی انکساری بھی ایسا ہی بہروپ ہے جس کے عقب میں تکبر موجود ہوتا ہے۔ سو میں ان سب کے ارتکاب سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں اور بچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس گناہِ عظیم سے ہٹ کر جہاں تک بشری کمزوری والے گناہوں کی سزا کی بات ہے تو اگر یہ بشری کمزوری والے گناہوں کی سزا ہے تو بہت کم ہے، بہت ہی کم ہے، اتنی کم ہے کہ سزا لگتی ہی نہیں کیونکہ بشری کمزوریوں والے میرے گناہ تو بے شمار ہیں

دسمبر ۲۰۰۹ء گزر گیا تو نئے سال کا استقبال اپنے معمول کے مطابق کیا۔ پاکستان سے ہی میرا معمول رہا ہے کہ میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ کسی چھوٹے سے کمرے میں بند ہو کر مصلیٰ بچھا لیتا ہوں۔ گزرے ہوئے سال کا ایک جائزہ اپنے اندر لیتا ہوں۔ کہیں استغفار کرتا ہوں تو کہیں شکر گزار بنتا ہوں۔ آنے والے سال کے سلسلہ میں اپنی دعائیں بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے تک یا ساڑھے بارہ بجے تک میں اسی طرح نئے سال کا استقبال کرتا ہوں۔ اسے میں اللہ میاں سے اپنی سالانہ ملاقات بھی سمجھتا ہوں۔

۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کا جو مرحلہ ملتوی کر دیا گیا تھا وہ گیارہ جنوری ۲۰۱۰ء کو ہونا طے پایا۔ گیارہ جنوری کو انجیو گرافی کی گئی لیکن کسی ٹیکنیکل مسئلہ کی وجہ سے انجیو پلاسٹی کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے دو گھنٹے تک زیرِ نگرانی رکھنے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انجیو پلاسٹی کے لیے ۲۱ جنوری کی تاریخ طے کر دی گئی۔ مجھے ایک دن پہلے یعنی ۲۰ جنوری کو ہسپتال میں آ کر داخل ہونا تھا۔ سو ۲۰ جنوری کو ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ انٹرنیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جب گھر سے روانہ ہوا، اور وہاں سے سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ایک کوئے یار سے دوسرے کوئے یار میں آ نکلا۔ منجھلا بیٹا عثمان مجھے ہسپتال تک پہنچا گیا تھا۔ بار بار آنے جانے کی وجہ سے باذ و دن ہسپتال کے کارڈیو ڈیپارٹمنٹ میں اب کافی جان پہچان ہو گئی ہے۔ پہلی منزل پر کمرہ نمبر ۹ میں میرا بیڈ تھا۔ پہلے نرس آئی اور

شوگر، بلڈ پریشر وغیرہ چیک کر گئی۔ پھر نیپالی ڈاکٹر مایا آئی۔ اس نے سر سے معائنہ شروع کیا۔ آنکھ، منہ اور گلے کو ٹٹول کر چیک کرتے ہوئے جب پیٹ تک آئی تو پیٹ کو دباتے ہوئے پوچھنے لگی کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟ میں نے کہا صرف گیس کی تکلیف ہے۔ ڈاکٹر تھوڑا سا مسکرائی۔ پھر پیٹ کے دائیں بائیں جانب سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دباتے ہوئے پوچھا درد تو نہیں ہو رہی؟ میں نے کہا گدگدی ہو رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر جو ابھی تک مسکراہٹ میں بھی سنجیدگی ظاہر کر رہی تھی، اب زور سے ہنسنے لگی، گویا میرے حصے کا بھی ہنس دی۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر چہل قدمی کے لیے نکلا۔ پھر اپنے کمرے اور وارڈ سے باہر لگی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات کو گھر والوں سے بات ہوئی۔ پھر ایک غزل شروع ہو گئی۔ رات گیارہ بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

۲۱ جنوری کو فجر کی نماز سے فارغ ہوا تو ٹیپو آ گیا۔ میرے استعمال کی چند چیزیں جو گھر پر رہ گئی تھیں دینے آیا تھا۔ وہیں سے پھر اپنی جاب پر چلا گیا۔ صبح ناشتہ سے پہلے میری شوگر ۱۶۹ تھی۔ ناشتہ کے بعد یکدم ۳۶۹ ہو گئی۔ اس پر فوراً انسولین کا ٹیکہ لگایا گیا۔ ٹیکہ لگوا کر میں اپنے کاغذ قلم لے کر لابی میں چلا گیا۔ (لیپ ٹاپ کی سہولت ہوتی تو کاغذ قلم کی ضرورت نہ پڑتی) شام کو ساڑھے چار بجے انجیو پلاسٹی کا وقت طے تھا۔ اس دوران مبارکہ سے فون پر بات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ کل رات کو کینیڈا سے پروین شیر نے فون کر کے خیریت دریافت کی تھی۔ آج دن میں ارشد خالد اور نذر خلیق کے فون آئے تھے اور دونوں خیریت دریافت کر رہے تھے۔ مبارکہ کے فون کے بعد اپنے اپنے گھر سے سارے بچوں نے بھی فون کر کے خیریت دریافت کی۔

آج ڈاکٹر ویسنا چیک اپ کے لیے آئیں۔ ٹمپریچر، نبض، بلڈ پریشر سب نارمل تھے۔ بلڈ پریشر ۸۰۔۱۴۰ تھا۔ ڈاکٹر ویسنا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بیڈ پر بہت زیادہ جھک آئی تھیں، شاید اسی لیے بلڈ پریشر ۱۲۰ کی بجائے ۱۴۰ ہو گیا تھا۔ بہرحال سب کچھ کنٹرول میں تھا۔ شام کو انجیو پلاسٹی بھی ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آ گیا اور ٹانگ سیدھی رکھنے والی تکلیف کا مرحلہ بھی نسبتاً آسانی سے گزر گیا۔ ۲۲ جنوری کو صبح سویرے میرا ای سی جی ٹیسٹ ہوا۔ رپورٹ اطمینان بخش تھی۔ اسی روز میں نے دو غزلیں کہیں۔ شام تک مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

۱۸ فروری کو چیک اپ ہوا۔ اس کے بعد ۱۲/اپریل کو پھر معائنہ کیا گیا۔ یہ معمول کے چیک اپ ہیں۔ ہماری بیماریوں کے معاملہ میں ہم سے زیادہ ان لوگوں کو فکر رہتی ہے۔ اسی دوران میری پوتی ماہ نور نے بھی قرآن شریف ختم کر لیا۔ ۲۶ فروری کو اس کی آمین کی تقریب ہم سب نے اہتمام کے ساتھ کی۔ اب تک میرے دو نواسوں مشہود (رومی) اور مسرور (جگنو) نے، دو پوتوں شہریار (شہری) اور جہاں زیب (سونو) نے اور دو پوتیوں ماہ نور (ماہا) اور علیشا (ایشا) نے قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیا ہے اور ان سب کی تقریب آمین ہو چکی ہے۔ یہ ان بچوں کی ماؤں کا اعزاز ہے کہ انہوں نے جرمنی میں رہتے ہوئے بھی بچوں کو اوائل عمری میں ہی نہ صرف قرآن شریف پڑھنا سکھا دیا بلکہ اس کی تلاوت کی عادت بھی قائم کر رہی ہیں۔ **فالحمد و للہ!**

مبارکہ کا ہفتہ میں تین بار ڈائلسز کا سلسلہ جاری ہے اور اب ایک طرح سے معمولاتِ زندگی میں شامل

ہے۔ ۱۶، ۱۷/اپریل کی درمیانی رات اسے بے چینی ہونے لگی۔شوگر اور بلڈ پریشر چیک کیے تو سب نارمل تھے البتہ نبض کی رفتار مدھم تھی۔ ۴۰ سے ۴۳ کے درمیان۔ دو اڑھائی گھنٹے اپنے ٹوٹکے کرنے میں گزار دیئے۔صبح ساڑھے پانچ بجے بڑے بیٹے کے گھر فون کیا۔تسنیم سے بات ہوئی۔اس نے فوراً قریبی شہر ہوف ہائم کے ہسپتال میں فون کیا۔ چھ بجے وہاں کا ڈاکٹر ہمارے گھر پہنچ گیا۔نبض کے بارے میں جان کر اس نے دستی ای سی جی مشین بھی ساتھ رکھ لی تھی۔مبارکہ کی صورتحال دیکھ کر اس نے گھر پر ہی ای سی جی ٹیسٹ شروع کر دیا۔دل میں گڑ بڑ ہونے کے سگنل مل رہے تھے۔ساڑھے چھ بجے اس نے ایمبولینس بلا لی۔ایمبولینس والوں نے آتے ہی اپنی کاروائی شروع کر دی۔وہ اسٹریچر پر ڈال کر لے جانا چاہتے تھے۔ہم اپنی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر رہتے ہیں۔میرے پاس ہاؤس ماسٹر کا فون نمبر نہیں تھا۔ہاؤس ماسٹر سے سارے معاملات چھوٹا بیٹا ٹیپو خود ڈیل کر لیا کرتا ہے۔ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ لفٹ کی چابی منگائیں تاکہ مریضہ کو اسٹریچر پر ہی لے جایا جا سکے۔میں نے ٹیپو کے گھر فون کیا،موبائل پر فون کیا،مگر سارے فون بند تھے۔پانچ منٹ کا پیدل رستہ ہے اس دوران میں نے خود جا کر اس کے گھر پر بیل دی اور پیغام دیا کہ فوراً ہمارے ہاں پہنچو۔ان لوگوں کے پوری طرح بیدار ہونے،تیار ہونے اور ہمارے ہاں پہنچنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ تب تک ڈاکٹرز مزید انتظار کیے بغیر مبارکہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ہی لے گئے۔تینوں بیٹے ہمارے گھر کے اتنے قریب ہیں کہ کسی ایمرجینسی میں بلانے پر پانچ منٹ کے اندر گھر پر پہنچ سکتے ہیں۔ہر چند آج بڑی بہو تسنیم کو جتنا کام سونپا گیا اس نے احسن طریقے سے کر دیا اور اسی کے نتیجہ میں ڈاکٹر اور ایمبولینس بر وقت پہنچ چکے تھے۔لیکن آج ایمرجینسی میں یہ تجربہ بھی ہوا کہ سب سے قریب مقیم بیٹا اس وقت ہم تک پہنچا جب اس کے آنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔اس سے اندازہ ہوا کہ قدرت کی طرف سے آسانی ہو تو دور والے بھی قریب ہیں اور اگر الجھن پیدا ہونی ہے تو سب سے قریب والے بھی دور ہیں۔سبق ملا کہ بچوں کی سعادت مندی پر ان کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے لیکن بھروسہ صرف اور صرف اپنے خدا پر ہی رکھنا چاہیے۔اس کا فضل ہے تو ہر طرف سے ہر طرح خیر ہے۔

ساڑھے سات بجے ایمبولینس والے مبارکہ کو ساتھ لے کر گئے تھے اور ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ مبارکہ کا فون آ گیا کہ انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کے دونوں مرحلے طے ہو گئے ہیں۔گویا اب ہم دونوں میاں بیوی ہارٹ کلب کے ممبر بن گئے ہیں۔میں نے تو مبارکہ کی کسی بیماری میں شراکت نہیں کی لیکن وہ میرے دل کی بیماری میں حصہ دار بن گئی۔اگلے دن اس کے ڈائلسز کی باری تھی۔۲۳ اپریل کو شام تک ڈائلسز کے بعد مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔

۲۴/اپریل کو ہمارے شہر کی مئیر شپ کی ایک امیدوار محترمہ کارین کے ساتھ مقامی کمیونٹی سنٹر میں ملاقات طے ہوئی تھی۔ان کا تعلق ایف ڈی پی سے ہے۔جب کمیونٹی سنٹر میں پہنچیں تو بالکل اکیلی۔۔۔۔مجھے اس لیے حیرانی ہوئی کہ ہمارے ہاں تو یونین کونسل کے امیدوار بھی ڈھول،باجے کے ساتھ آتے ہیں۔یہ تو شہر کی بلدیہ کی مئیر شپ کی امیدوار تھیں اور بالکل اکیلی۔انہوں نے ماضی میں اپنی سماجی سرگرمیوں کی تفصیل سے آگاہ کیا اور مستقبل کے ارادوں (صرف وعدوں کا نہیں ارادوں) کا ذکر کیا۔ماضی کی سرگرمیوں میں انہوں نے بتایا کہ وہ نوجوانوں کی

بہتری کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔میں نے انہیں تجویز دی کہ اس بار آپ بڑی عمر کے لوگوں کے لیے بھی کچھ کام کرنا۔میری تجویز انہوں نے پرزور مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لی۔جاتے ہوئے مجھے اپنا ای میل ایڈریس دے گئیں۔میں نے اسی دن شام کو انہیں ایک ای میل بھیج دی جس میں اپنے تعارف کے طور پر اپنی نظم ''سرسوں کا کھیت'' کا جرمن ترجمہ بھی نتھی کر دیا۔ان کی جوابی میل آئی جس میں نظم پر پسندیدگی کا رسمی اظہار تھا۔اگلے دن ۲۵ اپریل کو انتخاب تھا۔ہمارے ووٹ پڑنے کے باوجود محترمہ ہار گئیں۔تب میں نے انہی حوصلہ بڑھانے والی ایک میل بھیجی۔اس کا جواب بڑا دلچسپ آیا۔انہوں نے لکھا کہ ہارنے کے باوجود ہم لوگ پُر عزم ہیں۔ہار کی خبر سننے کے بعد پارٹی کے مقامی رہنما اور کارکن ایک جگہ جمع ہوئے۔وہاں میں نے بطور خاص آپ کی ای میل کا ذکر کیا اور آپ کی نظم ''سرسوں کا کھیت'' پڑھ کر سنائی،جسے حاضرین نے اس خاص کیفیت میں بطور خاص پسند کیا۔

اس سال فروری کے مہینے میں امریکہ سے ستیہ پال آنند کی ای میل آئی کہ میں یورپ کا سفر کرنے والا ہوں۔ان کے ساتھ گزشتہ برس ایک علمی مجادلہ میں ہلکی سی تلخی ہوئی تھی۔میں نے جوابی کاروائی میں ان کی متعلقہ ای میلز شائع کر کے انہیں علمی و اخلاقی دونوں سطح پر خاموش کر دیا تھا۔یہ ساری روداد میری کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' میں محفوظ ہے۔اس سب کچھ کے باوجود ان کی ای میل آئی تو کچھ اچھا سا لگا۔سو میں نے انہیں لکھا کہ جب یورپ آ رہے ہیں تو جرمنی سے بھی ہوتے جائیے۔ڈاکٹر آنند فوراً راضی ہو گئے۔مجلسی سرگرمیوں سے تمام تر بے رغبتی کے باوجود اب مجھے ایک تقریب کا اہتمام تو کرنا تھا۔اسی دوران فرینکفرٹ کے ایک متشاعر سے بات ہو رہی تھی تو اس نے کہا کہ آپ کو تو تقریبات کرانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے پھر کیسے انتظام کریں گے۔میں نے کہا میں جان بوجھ کر ان سرگرمیوں سے پرہیز کرتا ہوں وگرنہ ان کا برپا کرانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چنانچہ ۲۴ مارچ کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی زیر صدارت ڈاکٹر آنند کے اعزاز میں تقریب کامیابی کے ساتھ ہو گئی۔تقریب کے بعد ڈاکٹر آنند کوئی رسمی شکریہ کہنا تو کجا،مجھے خدا حافظ کہے بغیر روانہ ہو گئے۔اگلے روز انہوں نے ہمبرگ میں کسی خاتون کی شاعری کی ایسی کتاب کی تقریب رونمائی کرنی تھی جو شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔۲۳ مارچ کی رات جب ڈاکٹر آنند میرے ہاں مقیم تھے وہ دیر تک اس خاتون کی شاعری کے مسودے پر اصلاح کا نیک فریضہ انجام دیتے رہے تھے۔میں نے تب ہی انہیں دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر وہ کتاب کی اشاعت کے بغیر رونمائی کے ڈرامہ میں شریک ہوئے تو وہ ایک ادبی جرم کے مرتکب ہوں گے۔لیکن انہیں اس تقریب میں شرکت کی جلدی تھی سو ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی تقریب سے فارغ ہوتے ہی ملے بغیر چلے گئے۔امریکہ واپس پہنچنے کے بعد بھی ان کی طرف سے کوئی رسمی ای میل تک نہیں ملی۔شاید یہ ادبی تہذیب کا کوئی مابعد جدید رویہ ہو۔

اسی تقریب کے سلسلہ میں ایک اور لطیفہ در لطیفہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے ایک خاتون صدف مرزا کا حوالہ دیا کہ میرے سفر کے جملہ امور کو وہی دیکھیں گی۔ان کا تعارف بطور شاعرہ کرایا گیا۔سو انہیں بھی مدعو کر لیا گیا۔پھر ان خاتون نے پاکستان سے آئے ہوئے ایک شاعر باقر زیدی کا بتایا تو انہیں بھی مدعو کر لیا گیا۔تقریب

سے پہلے ہی کھل گیا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی متعارف کرائی گئی خاتون کا جو شعری مجموعہ چھپ چکا ہے بے وزن شاعری پر مشتمل ہے۔ اب صبر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ البتہ اس صبر میں یہ اطمینان شامل کرلیا کہ اس تقریب میں اپنا کلام نہیں سناؤں گا۔ مجھے ویسے بھی مشاعرہ بازی کا شوق نہیں ہے، سو یہ طے کرلیا کہ میں اپنی ہی اس تقریب میں کلام نہیں سناؤں گا۔ پروگرام سے چند دن پہلے معلوم ہوا کہ پاکستان سے جو شاعر آئے ہوئے ہیں وہ کسی ٹی وی چینل سے وابستہ ہیں اور پروگرام کی ریکارڈنگ بھی کی جائے گی۔ مجھ سے دو دوستوں نے پوچھا اب تو ٹی وی چینل کی طرف سے ریکارڈنگ بھی ہوگی، تو اب تو کلام سنائیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے لیے بے معنی بات ہے۔ چنانچہ تقریب ہوئی، ریکارڈنگ دھوم دھام سے ہوئی لیکن اسٹیج سیکریٹری ہونے کے باوجود میں نے کلام نہیں سنایا۔ بعد میں لطیفہ یہ ہوا کہ مجھے مذکورہ پاکستانی شاعر کی طرف سے پیغام بھیجا گیا کہ اس تقریب کی ریکارڈنگ کی ڈی وی ڈی کی ماسٹر کاپی لینا چاہیں تو سات سو یورو کا خرچہ دینا ہوگا۔ میں نے پیغام پہنچانے والے دوست (ڈاکٹر وسیم) کو جواب دیا کہ پاکستانی دوست کی جیب کٹ گئی ہو اور اسے کرایا کے لیے ہیلپ کی ضرورت ہو تو کوئی مدد کی جاسکتی ہے لیکن اس ڈی وی ڈی کے لیے میں سات یورو دینے کے لیے بھی راضی نہیں ہوں۔ جس ریکارڈنگ کے لیے میں نے کلام سنانے میں بھی دلچسپی نہیں لی مجھے اس کی ڈی وی ڈی میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ وہ دوست سات سو سے کم کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ میں سات یورو دینے سے بھی انکار کر چکا ہوں تو آپ کیا بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

اسی دوران بون میں بشریٰ ملک نے ایک ادبی تنظیم اردو سوسائٹی آف یورپ قائم کی اور ۱۶ مئی ۲۰۱۰ء کو وہاں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس کی صدارت مجھ سے کرائی گئی۔ میں نے بعد میں بشریٰ ملک کو مشورہ دیا کہ الم غلم قسم کے شاعر اور شاعرات کا مجمع لگانے سے بہتر ہے کہ کوئی سلیقے کی ادبی تقریب کی جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں مشورہ مانگا تو میں نے کہا کہ فضول شاعروں اور متشاعروں کی بجائے ایک دو اچھے شاعر بلائیں، ایک افسانہ نگار بلائیں، ایک خاکہ نگار۔۔۔ اس طرح چار پانچ ادبی اصناف کے مختلف افراد کو بلا کر ان سب سے باری باری سنا جائے۔ پھر ان ساری پڑھی گئی تخلیقات پر گفتگو کی جائے۔ حاضرین کو مجمع میں بیٹھ کر نہیں بلکہ اسٹیج پر بلا کر اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔ اس طرح حاضرین براہ راست اس پروگرام میں شریک ہوسکیں گے۔ میری تجویز بشریٰ ملک کو اچھی لگی۔ اب دیکھتے ہیں وہ کس حد تک اس کو کر پاتی ہیں۔

اس عرصہ میں اٹلی میں مقیم پاکستانی دوست جیم فے غوری جو میرے لیے ادبی محبت اور اخلاص کے جذبات رکھتے ہیں، انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ اٹلی میں تین روزہ سیمینار کرنا چاہتے ہیں۔ موضوع ہے ’’مغربی دنیا میں اردو کی صورتحال‘‘۔ ۲۱ تا ۲۳ جولائی کو سیمینار ہوگا۔ ۲۴ جولائی کو سوئٹزرلینڈ لے جائے جائیں گے، وہاں شام کو ایک مشاعرہ ہوگا اور وہاں کی سیر بھی ہوگی۔ ۲۶ تا ۲۸ جولائی اٹلی کی سیر ہوگی۔ گویا آٹھ دن کا ادبی و تفریحی پروگرام ہوگا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس تقریب میں روایتی مشاعرہ باز اور کانفرنس باز ادیبوں کو بالکل نہیں بلائیں۔ ان جینوئن لوگوں کو بلائیں جو مشاعروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے منتظمین کے پیچھے پاگلوں کی

طرح نہیں بھاگتے۔ ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک میرے مشورے کو قبول کیا۔ پھر انہوں نے جو پروگرام بنایا اس میں ایک آدھ کو چھوڑ کر تقریباً ہر نشست کی صدارت پر مجھے بٹھا دیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ یہ مناسب نہ ہوگا، ویسے بھی پاکستان میں آج کل صدرِ مملکت کے ساتھ مختلف ادارے اور پارٹیاں مل کر جو کچھ کر رہی ہیں اس کے بعد تو لفظ صدر سے ہی وحشت ہونے لگی ہے چاہے وہ کسی ادبی نشست کا صدر ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ پھر میں نے او کھے سو کھے ہو کر دو نشستوں کی صدارت قبول کی اور باقی کے لیے خود سے زیادہ بہتر اور موزوں افراد کے نام دے دیئے۔ جیم فے غوری نے ۲۹؍مئی کو میری ائر ٹکٹ بنوا کر مجھے بھیج دی۔ لیکن اسے قسمت کی بات سمجھیں کہ محکمہ صحت کی طرف سے انہیں دنوں میں میری Rehabilitation کے لیے منظوری آ گئی۔ لوگ اس کے لیے لمبی لائن میں لگ کر باری کا انتظار کرتے ہیں مجھے اتنی جلدی اس کا چانس مل گیا جسے ضائع کرنا اپنی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے فائیو سٹار ہوٹل جیسا صحت افزا مقام ہوتا ہے۔ جہاں مریض کی دیکھ بھال، دواؤں کی تبدیلی کے ٹیسٹ، مساج وغیرہ یعنی مریضوں کو ہر طرح کا ممکنہ عیش و آرام فراہم کیا جاتا ہے جو کامل شفایابی کے لیے ممد ہوتا ہے۔ سو میں نے بڑے ہی بوجھل دل کے ساتھ غوری صاحب کو ۲۱ جون ۲۰۱۰ء کو اس کی اطلاع دی۔ ۲۲؍جون کو میری دائیں آنکھ کا موتیا کا آپریشن ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے بالکل کامیاب رہا۔ یہ آپریشن گزشتہ برس اپریل سے موخر ہوتا چلا آ رہا تھا اور میرے لیے یہ تاخیر کسی حد تک تکلیف دہ ہونے لگی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام خیر و خوبی سے انجام پذیر ہوگیا اب میں دونوں آنکھوں سے پوری طرح کام لے سکوں گا۔

۲۱ جون کو ہی مجھے پاکستان سے ڈاکٹر نذر خلیق نے بتایا کہ خیر پور میرس یونیورسٹی کے اردو مجلّہ ’’الماس‘‘ میں میرا مضمون ’’ہرمن ہیسے کا ناول سدھارتھ‘‘ شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر یوسف خشک جو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے سربراہ ہیں، چند برس پیشتر جرمنی میں آئے تھے۔ ایک علمی و تحقیقی منصوبہ کے سلسلہ میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ان کا قیام تھا۔ تب ان کے ساتھ ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میرے اور ان کے تعلق میں جرمنی کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے مجلّہ میں جو مضمون شائع کیا وہ جرمن ناولسٹ ہرمن ہیسے کے ایک اہم ناول کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ اٹلی کا پروگرام چھوڑنے کی بوجھل کیفیت میں اس خبر نے کچھ سکون سا دیا، ڈاکٹر یوسف خشک کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں اور ان کی محبتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ لیکن محبت تو جیم فے غوری بھی بہت کرتے ہیں۔ یوں میں دیر تک اداسی اور خوشی کی ملی جلی کیفیات میں گھرا رہا۔ اٹلی کے اتنے اچھے ادبی پروگرام کو مس کرنے کے ساتھ مجھے اٹالین کھانوں سے محرومی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

کھانے پینے کے ذکر سے خیال آیا، جرمنی میں رہتے ہوئے ہم لوگ پاکستانی کھانے ہی کھاتے رہے ہیں۔ لیکن اب کھانے کے معمولات میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ ناشتہ میں ہم میاں بیوی اپنی اپنی پسند کی بریڈ لیتے ہیں۔ دوپہر کو پاکستانی کھانا ہوتا ہے۔ مبارکہ شام کو بھی پاکستانی کھانا کھاتی ہے لیکن میں نے شام کو بریڈ لینا شروع کر دی ہے۔ ویسے پاکستانی کھانوں میں عام گوشت، سبزی اور دال کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار چپلی کباب، نہاری اور پائے کی بدپرہیزی بھی کر لیتے ہیں۔ ویسے آجکل ہماری پسندیدہ ڈش گڑ کے چاول ہے، اگرچہ یہ بچپن کی پسندیدہ

ڈش کے طور پر بہت کچھ یاد دلاتی ہے لیکن اس میں ہر طرح کے میوہ جات کی شمولیت بہت کچھ بھلا بھی دیتی ہے۔کبھی کبھار یہ ڈش بنتی ہے تو میں جی بھر کے بد پرہیزی کر لیتا ہوں۔شوگر کا مریض ہونے کی وجہ سے عام طور پر تشویش تب ہوتی ہے جب شوگر معمول سے بڑھ جاتی ہے۔تاہم حالیہ دنوں میں وقفہ وقفہ سے تین بار ایسا ہو چکا ہے کہ میری شوگر بہت کم ہو گئی۔۵۰ کے لگ بھگ۔پہلی بار تب اس کا انکشاف ہوا جب میں وضو کر رہا تھا اور ٹانگیں کپکپانے لگیں۔شوگر چیک کی تو پچاس۔فوراً احتیاطی تدابیر بروئے کار لائے اور شوگر لیول نارمل ہو گیا۔جب وقفہ سے تین بار ایسا ہوا تو ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ڈاکٹر فکر مند ہوا اور کہنے لگا اس میں خطرہ زیادہ ہے، خصوصاً نیند میں ہی شوگر لیول اتنا گر جائے تو بندہ سویا ہوا ہی آگے نکل جائے گا۔اس کے لیے خود ہی الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔لیکن مجھے تو اس مسئلہ میں بھی ایک دلکشی دکھائی دی ہے۔موت برحق ہے۔ایک نہ ایک دن آنی ہے اور میں اس سلسلہ میں اپنی خواہش پہلے سے لکھ چکا ہوں۔

’’مجھے موت کے سلسلہ میں صرف ایک خواہش شدت کے ساتھ رہی ہے کہ جب بھی آئے بہت آرام سے آئے۔جیسے ہلکی سی اونگھ میں گہری اور میٹھی اونگھ آجائے اور میں اسی میٹھی اونگھ میں آگے نکل جاؤں۔‘‘

تو اس لحاظ سے نیند میں شوگر لیول کا بہت زیادہ کم ہو جانا اس خواہش کی تکمیل کے لیے مد ہو سکتا ہے لیکن صرف تب جب خدا کی طرف سے بلاوے کا اصل وقت آئے گا۔اس برس پاکستان سے محمد حامد سراج کی اوپن ہارٹ سرجری کے بعد ایک ای میل آئی تو اس میں موت کے خوف کا احساس نمایاں تھا۔میں نے انہیں اپنی یادوں کے گزشتہ باب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہمت افزا ای میل بھیجی جس کا پھر اچھا جواب آیا۔

بے شک انجیو پلاسٹی کے مقابلہ میں اوپن ہارٹ سرجری زیادہ نازک معاملہ ہے لیکن کامیاب آپریشن کے بعد بندہ جیسے جوان ہو جاتا ہے۔میرا خود اپنے ہسپتال کے ڈاکٹر کے ساتھ یہی مسئلہ چل رہا ہے۔وہ اگلی بار ایک اور انجیو پلاسٹی کرنا چاہتے ہیں۔اور میرا اصرار ہے کہ اب مزید ایسا کچھ نہیں کریں۔اوپن سرجری کر گزریں جو ہونا ہے ہو جائے۔عنقریب اس بارے میں فیصلہ ہونا ہے۔

اسی دوران ہالینڈ سے لندن شفٹ ہو جانے والے دوست جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو اپنے بعض مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے اتنے جذباتی ہو گئے کہ خودکشی کی بات کرنے لگے۔میں نے انہیں سمجھایا کہ میں پاکستان میں ایک بار ایسی کیفیت سے گزرا ہوں لیکن اب تو خدا کا فضل ہی فضل ہے۔پھر ان پر جو خدا کے فضل اور احسانات ہیں ان کی طرف انہیں توجہ دلائی اور کہا کہ ہم بامراد لوگ ہیں، نامراد نہیں ہیں۔سو خودکشی کا سوچنا بھی خدا کی ناشکری میں شمار ہوگا۔مجھے خوشی ہے کہ ایک نازک مرحلہ پر میں ایک دوست کے لیے زندگی بخش اچھی باتیں کر سکا اور اس کے لیے وقتی طور پر سہی سکون کا موجب بنا۔

۱۲ مئی کو مجھے ہالینڈ سے ایک دوست احسان سہگل کا ٹیلی فون آگیا۔کافی پریشان تھے اور بتا رہے تھے کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔جس کی وجہ سے ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔چیک اپ ہوا تو تمام رزلٹ اطمینان بخش تھے لیکن احسان سہگل پھر بھی گھبرائے ہوئے تھے۔میں نے انہیں تو تسلی دینے والی باتیں کر دیں لیکن پھر گزشتہ برس اور اس

برس کی اب تک کی اپنی صورتحال پر غور کیا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے نہ صرف مجھ جیسے کمزور اور بزدل انسان کو ہمت اور حوصلہ عطا کر رکھا ہے بلکہ پوری طرح سے خود سنبھال رکھا ہے۔مبارکہ کی جسمانی حالت تو کانچ کی گڑیا جیسی ہو کر رہ گئی۔اس کے باوجود روئے ما، گردوں کے مسئلہ اور دل کی بیماری کو یوں نبھا رہی ہے جیسے گھر کا معمول کا کام ہو۔ڈائلسز سے آنے کے بعد انسان اچھا خاصا نڈھال ہو جاتا ہے۔لیکن مبارکہ پانچ دس منٹ ریسٹ کرنے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتی ہے۔البتہ کھانا کھانے کے بعد پھر گہری نیند سوتی ہے۔

۲۴ مئی کو جرمنی میں سرکاری چھٹی تھی۔اس دن بارش نہیں ہونا تھی۔کئی دنوں سے چل رہی ٹھنڈ کے برعکس موسم خاصا بہتر تھا۔چمکتی ہوئی لیکن نرم دھوپ میں ۲۵ ٹمپریچر نے فضا کو خوشگوار بنا دیا تھا (اس دن پاکستان کے بعض شہروں میں ٹمپریچر ۵۲ ہو گیا تھا)۔ہم نے، پوری کی پوری فیملی نے اپنے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے دریائے مائن کے کنارے پکنک منانے کا طے کر لیا۔اپنی اپنی سہولت کے مطابق پانچوں بچوں نے جو پکانا مناسب سمجھا پکا کر لے آئے اور سب دریا کے کنارے پر جمع ہو گئے۔چھوٹے بچے، پوتے، پوتیاں، نواسے جو ہمارے گھر میں کھیلتے ہیں تو لگتا ہے کہ اودھم مچا رہے ہیں۔اب یہاں کھل کر کھیل رہے تھے، اودھم مچا رہے تھے لیکن سب اچھا لگ رہا تھا۔گزشتہ برس کی بیماریوں کی یلغار کے بعد مبارکہ پہلی بار دریا کے کنارے پہنچی تو یہ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔بیماریوں کے حملہ سے پہلے ہم دونوں میاں بیوی کئی بار چہل قدمی کرتے ہوئے دریا کے اس کنارے تک آئے ہیں اور کئی بار یہاں کے بنچوں پر دیر تک بیٹھے قدرتی مناظر کا نظارہ کرتے رہے ہیں۔لیکن گزشتہ برس ۲۰۰۹ء میں ہم جس نوعیت کی سنگین بیماریوں سے گزرے ہیں، اس کے بعد سوچا نہیں تھا کہ مبارکہ اس طرح پھر سے ہنستے کھیلتے ہوئے دریا کے کنارے تک پہنچے گی۔لیکن خدا کے فضل سے ایسا ہو گیا تھا۔ہمارے لیے یہ پکنک بھی خدا کی شکر گزاری کا جواز بن گئی۔دریا کے دوسرے کنارے پر بھی پکنک منائی جا سکتی تھی لیکن بچے اسی طرف رہنے پر مصر تھے کیونکہ یہاں کی گراؤنڈ وسیع تھی۔کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے کے لیے کھلی جگہ تھی۔دوسری طرف صرف بیٹھنے کے لیے دو تین بنچوں کا ہی انتظام تھا۔چھٹی والے دنوں میں دریا کے دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے ایک کشتی موجود ہوتی ہے۔کرایا واجبی سا ہوتا ہے۔میں اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔بچوں نے اس مختصر سے دریائی سفر کا لطف لیا لیکن دوسرے کنارے پر پہنچ کر واپسی کا شور مچا دیا۔اصل میں وہ کشتی میں ہی سفر کرتے رہنا چاہتے تھے۔مجھے ہرمن ہیسے کا ناول ’’سدھارتھ‘‘ بہت پسند ہے۔دریا کی آوازیں سننا اور ان کا گیان حاصل کرنا بڑی بات تھی لیکن ہرمن ہیسے کے سدھارتھ نے میرے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں کی معصوم اور زندگی سے بھرپور آوازوں کے ساتھ دریا کی آواز کو سنا ہوتا تو اسے ایک اور طرح کا گیان بھی نصیب ہو جاتا۔میں اپنے بچوں کے بچوں میں اپنے ماضی، حال اور مستقبل سمیت اپنی ساری کائنات کا عکس دیکھ رہا ہوں اور وزیر آغا کی نظم ’’آدھی صدی کے بعد‘‘ کا اختتامی حصہ جیسے میرے اس تجربے کا حصہ بن جاتا ہے۔

’’معاً مَیں نے دیکھا / زمیں پر ہَوا تھی /

ہَوا کے تڑختے ہوئے فاصلے تھے /

مگر سبز دھرتی کی/ٹھنڈی تہوں میں/
جڑوں کی پُر اسرار وحدت تھی/
سب فاصلے/ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے/
ہزاروں جڑیں/ایک ہی جڑ سے پھُوٹی تھیں/
آگے بڑھی تھیں/مگر جڑ سے ایسی جُڑی تھیں/کہ چلنے کے عالم میں/ٹھہری ہوئی تھیں/
یہ ساری جڑیں/سبز دھرتی کی اپنی جڑیں تھیں/
جو خود اُس کے گیلے بدن میں/اُترتی گئی تھیں/
کہو کون تھاوُہ؟/کہ جس نے کہا تھا:/ستارے فقط پات ہیں/
کہکشائیں/گندھی نرم شاخیں ہیں/
آکاش/اِک سبز چھتنار/ہر شے پہ سایہ کُناں ہے/
مگر اس کی جڑ/اس کے اپنے بدن میں/نہیں ہے!/
کہو کون تھا وہ/کہ جس نے ہَوا کی حسیں سرسراہٹ/لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی سہانی صدا/
مشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز/اور خواہشوں کے تلاطم کو/دکھ کا سبب کہہ دیا تھا؟/
وہ جس نے/خود اپنے ہی پانچوں حواسوں کو/
اپنی جڑوں کو/فریبی، سیہ کار، جھوٹا کہا تھا؟
مرا اُس سے/کوئی تعارف نہیں ہے/
مجھے تو فقط/اپنے ''ہونے'' کا عرفان ہے/
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں/پَروں کو ہلاتی/
حسیں قوس بن کر/مری سمت آتی ہوئی/فاختہ/
پھڑ پھڑاتے ستارے/گھنی گھاس کی نوک پر آسماں/سے اُترتی نمی/
اور پُورب کے ماتھے پہ/قشقے کا مدھم نشاں/
تیرگی کی گُپھا سے نکلتا ہُوا/روشنی کا جہاں/دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے/
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن/بھیگی پلکوں پہ دکھ کی تپکتی چُبھن/
سبز شبدوں کی بہتی ہوئی آبجُو/
اِک انوکھے پُراسرار معنیٰ کے/گھاؤ سے رِستا لہو/مُسکراتے ہوئے لب/
یہ سب/میرے اوتار ہیں/
میری آنکھیں ہیں/مُجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں/
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی!''

زندگی کا اسرار روح سے منسلک ہے اور روح کا بھید روحِ اعظم تک لے جاتا ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس بھید کو سمجھنے کی جستجو میں ہوں۔ کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا تو ممکن نہیں لیکن پھر بھی غور و فکر کے نتیجہ میں جتنا کچھ منکشف ہوتا ہے میرے لیے روحانی لذت کا موجب بنتا ہے۔ میں اپنی یادوں کے باب ''روح اور جسم'' میں لکھ چکا ہوں کہ روح اور جسم لازم و ملزوم ہیں۔ کلوننگ کے سائنسی تجربہ کی کامیابی کے بعد یہ مذہبی تصور مزید مستحکم ہوا ہے۔ تاہم مجھے جسم اور روح کے اس تعلق کے ساتھ روح کے جسم سے سوا ہونے کا ہلکا سا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں اس احساس کو شاید ڈھنگ سے بیان نہ کر پاؤں۔ تاہم اس کے لیے ایک دو مثالیں کسی حد تک تفہیم میں ممد ہو سکتی ہیں۔ خواب میں جسم اپنے بستر پڑا ہوتا ہے اور روح ایک اور جسم کے ساتھ کہاں سے کہاں تک پہنچی ہوتی ہے۔ خواب میں ہم جن کیفیات سے گزر رہے ہوتے ہیں بیداری پر ان کے اثرات بھی ہم پر کسی نہ کسی حد تک طاری ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم خواب میں دوڑ رہے تھے تو بیداری پر سانس پھولی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ڈراؤنا یا بہت سہانا خواب تھا تو بیداری پر اس کے ڈراؤنے یا سہانے اثرات بھی ہم پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک اور مثال بھی معین طور پر تو تفہیم نہیں کرتی لیکن اس سے بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خوشبو پھول کے اندر موجود ہوتی ہے لیکن پھر وہ پھول سے الگ ہو جاتی ہے اور پھول مرجھا جاتا ہے۔ کسی بزرگ کی تحریر میں پڑھا تھا کہ قیامت کے دن ہمیں نئے جسم دیئے جائیں گے۔ میں پرانے جسم کی اہمیت سے ابھی تک منکر نہیں ہو پا رہا۔ یوں تو ہمارے جسم کی کھال چند معیّن برسوں کے اندر غیر محسوس طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ صاحبِ جسم کو بھی اس تبدیلی کا ادراک نہیں رہتا۔ ہم خود کو وہی کا وہی سمجھتے ہیں۔ سو قیامت کے دن اگر ہمیں اسی انداز میں کوئی نیا جسم عطا کیا جاتا ہے جس سے ہم سب اپنا آپ اسی طرح اپنا محسوس کریں تو پھر اس سے ان بزرگ کی بات بھی بجا رہتی ہے اور نئے، پرانے جسم کا مسئلہ بھی کسی حد تک قابلِ فہم ہو جاتا ہے۔

پاکستان اور انڈیا کے کئی چینلز جرمنی میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے ہی چینلز میں ایک کا نام NDTV Imagine ہے۔ گزشتہ برس اس چینل پر ایک رئیلیٹی شو ''راز پچھلے جنم کا'' کے نام سے دکھایا گیا۔ چند محدود قسطوں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ میرے گھر والے اس شو میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے کہ شاید انہیں یہ اپنے معتقدات کے خلاف لگتا تھا۔ میرے پیشِ نظر دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں ایک طویل عرصے سے کبھی ایسا محسوس کیا کرتا ہوں کہ جیسے میں کسی پچھلے جنم میں بادشاہ/راجہ یا سردار قسم کی چیز تھا اور کبھی ایسے لگتا ہے کہ میں کوئی سادھو، سنت، فقیر یا ملنگ تھا۔ میں اس بات کو اپنی بیوی کے علاوہ بعض بچوں کے ساتھ بھی بیان کر چکا ہوں۔ یہ دو مختلف دھاروں کا احساس پاکستان میں قیام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس لیے پچھلے جنم کا اسرار میرے لیے ذاتی دلچسپی کا موجب تھا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے روح کے بھید کو سمجھنے کی خواہش ہمیشہ سے رہی ہے۔ یہ گیان اور معرفت مجھے کہیں سے بھی ملنے کی امید ہو میں ممکنہ حد تک وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ شو تو گھر بیٹھے ہی دستیاب ہو رہا تھا۔ اس میں ایک ماہرِ نفسیات خاتون ایک خصوصی نوعیت کے بیڈ کے ساتھ براجمان ہوتی تھیں۔ وہاں اپنے پچھلے جنم کی یاترا پر جانے کے خواہشمند کو لٹا کر پچھلے جنم کا کچھ حصہ دکھایا جاتا تھا۔ میرا اپنا اندازہ یہ تھا کہ مسمریزم سے ملتے

جلتے کسی نفسیاتی طریقے سے مریض کو ٹرانس میں لا کر پھر کسی جینیٹک وے سے یا صدیوں سے محفوظ لاشعور کے ذریعے ہمارے آباؤ اجداد کے کسی کردار کی فلم کے ذریعے سے نفسیاتی علاج کر دیا جاتا ہے۔

اس شو میں آنے والے بعض لوگ اپنے پچھلے جنم کی کئی انوکھی داستانیں سنا رہے تھے۔ میں ان سب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ تو سائنس کی ایک سادہ سی، درسی نوعیت کی عام سی بات ہے کہ ہر انسانی سیل کے نیوکلس میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔ ۲۳ ماں کی طرف سے اور ۲۳ باپ کی طرف سے۔ کروموزوم کے اندر ایک کیمیائی مادہ ہوتا ہے جسے DNA کہتے ہیں۔ اس DNA کے مالیکیول کے مخصوص حصوں کو جین کہتے ہیں۔ سیل کے ہر فعل کو کنٹرول کرنے والی ایک مخصوص جین ہوتی ہے۔ انسانی جسم کے اربوں سیل میں سے ہر ایک سیل کے ۴۶ کروموزوموں کو ملا کر کروڑوں کی تعداد میں جینز ہوتی ہیں۔ ایک سیل جس کے اندر یہ کروڑوں کی سرگرمیاں جاری و ساری ہیں، اس کی مادی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ سوئی کی نوک پر ۲۰ ہزار سیل سما جاتے ہیں۔ (یہاں مجھے ایک غیر متعلق بات یاد آ گئی۔ بغداد پر ہلاکو خان کے حملہ کے وقت علماء کے دو گروہوں میں اس مسئلہ پر مناظرہ ہو رہا تھا کہ ستر ہزار فرشتے سوئی کے ناکے میں سے گزر سکتے ہیں یا نہیں؟۔ سوئی کی نوک پر مادی صورت کے حامل ۲۰ ہزار سیل سما سکتے ہیں جبکہ ہر سیل کے اندر کروڑوں جینز موجود ہیں، تو ناکے میں سے ستر ہزار فرشتوں کا گزرنا تو معمولی سی بات لگتا ہے)۔

سیل کی کارکردگی کی اس تفصیل کے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہمارے اندر ہمارے آباؤ اجداد کی عادات و افعال کا کتنا بڑا حصہ موجود ہے۔ ان کے ذریعے ہمارے ننھیال، ددھیال کے اعمال و عادات کا بہت سارا حصہ ہم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو کبھی کوئی مہاراجہ یا سردار اور کبھی کوئی ملنگ فقیر محسوس کرنا مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرے ددھیال، ننھیال میں سے کوئی ایسے رہے ہوں گے اور انہیں کی وہ بادشاہی اور فقیری میرے اندر بھی سرایت کر کے کسی نہ کسی رنگ میں میرے مزاج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔

این ڈی ٹی وی پر پچھلے جنم کا جو سفر میں دیکھ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ اصل میں ان کے کروموزوم میں محفوظ آباؤ اجداد کے کسی کردار کی زندگی کی کوئی پرچھائیں جیسی جھلک تھی۔ یہ میں ان افراد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جن کی داستانوں میں کہیں کوئی ربط تھا۔ لیکن کئی باتیں بے ربط یا بے جوڑ بھی محسوس ہوئیں۔ مثلاً کسی کو شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے تو اس کے پچھلے جنم میں اسے کسی صندوق میں بند کر کے ڈبو دیا گیا تھا۔ پچھلے جنم میں ظلم ہوا تھا تو اب تو اس کے بدلہ میں من میں شانتی اور کھلے پن کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہی گھٹن کا احساس ابھی تک موجود ہے تو پھر نیا جنم پچھلے جنم کا اجر نہیں بنتا بلکہ اسی سزا کا تسلسل لگتا ہے جس کے نتیجہ میں پچھلا جنم انجام کو پہنچا۔ تاہم میرا مقصد یہاں ہرگز ہرگز کسی کے عقائد پر اعتراض کرنا نہیں ہے بس اس پروگرام کو دیکھتے وقت روح کی کھوج کی میری لگن جو کچھ سجھاتی رہی وہ بیان کر رہا ہوں۔ بعض پروگراموں میں جو کچھ دکھایا گیا انہیں کے اندر پچھلے جنم کی داستان کی تردید ہو گئی۔ مثلاً ایک لڑکی کے پچھلے جنم میں اس کی ساس نے اسے زندہ جلا دیا تھا۔ وہ اپنے پچھلے جنم کے گھر کے علاقہ اور ہاؤس نمبر سے لے کر اسکول کے نام پتہ تک کی ساری تفصیل بیان کرتی ہے۔ لڑکی کا پچھلا جنم بھی دہلی میں

ہوا اور موجودہ جنم بھی دہلی میں ہوا۔ لیکن جب پچھلے جنم کے مقامات کی تصدیق کرنے گئے تو کوئی بھی درست ثابت نہ ہوا۔ اسی طرح انڈیا میں پنجابی فلموں کی ایک اداکارہ پچھلے جنم میں یاسمین خان تھی، سلطان نامی مسلمان سے محبت کرتی تھی۔ رنجیت سنگھ کے مزار پر جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں اسے مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ کسی مسلمان کو کسی ہندو یا سکھ کے ہاتھوں قتل ہوتا بتایا جاتا تو قابلِ فہم بات ہوتی یا پھر لڑکی ہندو یا سکھ ہوتی اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں ماری جاتی تو پچھلے جنم کا راز سمجھ میں بھی آتا۔ اس طرح کے کئی بے جوڑ نتائج پر مبنی پروگرام ماہرِ نفسیات خاتون کی تشخیص کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہندو عقائد کے حوالے سے روح کے اسرار کی باتیں ہو رہی ہیں تو مجھے ان میں ایک بڑا انوکھا اور دلچسپ تصور بھی ملا ہے۔ ہستیٔ باری تعالیٰ جو اس کائنات کی حقیقتِ عظمیٰ بھی ہے اور روحِ اعظم بھی، اصلاً ہم اس عظیم ترین ہستی کو بھی اپنے معاشرتی رویوں کے حوالے سے دیکھتے یا سمجھتے ہیں۔ جبکہ وہ ہمارے سارے تصورات اور قیاسات سے بالا ہے۔ چونکہ ہمارا معاشرہ مردانہ بالا دستی کا معاشرہ ہے اسی لیے خدا کے بارے میں بھی عام طور پر مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے برعکس قدیم ہندوستان کے مادری نظام کے اثرات کے نتیجہ میں ہندوؤں میں دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کا تصور بھی موجود رہا ہے۔ شری دیوی بھگوت پُران میں خالقِ کائنات عورت کے روپ میں ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق خالقِ کائنات شری دیوی اپنی تنہائی اور شدتِ جذبات سے مضطرب ہوئی تو اس نے اپنی ہتھیلیوں کو رگڑا۔ اس کے نتیجہ میں ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے، جو پھوٹ بہے تو پانی کا ایک سیلاب آ گیا۔ اس پانی سے برہما کی پیدائش ہوئی۔ شری دیوی نے برہما سے جنسی ملن کی خواہش کا اظہار کیا مگر برہما نے اسے اپنی پیدا کرنے والی کہہ کر اس عمل سے انکار کر دیا۔ تب شری دیوی نے برہما کو فنا کر دیا۔ ان کے بعد وشنو کو پیدا کیا گیا اور ان سے بھی وہی خواہش دہرائی گئی، وشنو نے بھی برہما کی طرح انکار کیا اور ان کو بھی برہما جیسے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ وشنو کے بعد شنکر کا جنم ہوا۔ شنکر اِن معاملات میں کافی معاملہ فہم نکلے۔ انہوں نے دو شرطوں کے ساتھ شری دیوی کی بات ماننے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ ایک شرط یہ کہ برہما اور وشنو کو دوبارہ پیدا کریں اور ان کے لیے دو دیویاں بھی پیدا کی جائیں۔ دوسری شرط یہ کہ شری دیوی خود دوسرا روپ اختیار کریں کیونکہ اس روپ میں بہر حال وہ ماں کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ شری دیوی نے برہما اور وشنو کو ان کے جوڑوں کے ساتھ دوبارہ خلق کیا اور خود بھی پاروتی کا دوسرا روپ اختیار کیا۔ شنکر اور پاروتی کی داستان ہندوؤں کے عقائد میں آج بھی کئی جہات سے اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے پدری بالا دستی والے معاشروں میں خدا مردانہ صفات کا حامل دکھائی دیتا ہے تو مادری نظام کے قدیم ہندوستان میں خدا کے عورت جیسے روپ کی بات دلچسپ ہونے کے ساتھ اپنے ثقافتی پس منظر میں قابلِ فہم بھی لگتی ہے۔ باقی خالقِ حقیقی تو ہمارے ہر مردانہ و زنانہ تصور سے کہیں بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ صفات بھی اس کو سمجھنے اور اس تک رسائی کا ایک وسیلہ تو ہیں لیکن اس عظیم تر حقیقت کے سامنے صفات بھی بہت نیچے رہ جاتی ہیں۔ صفات کا معاملہ یوں ہے کہ ذاتِ احد ہونے کے باوجود ہم صفات کے وسیلے سے اسے مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً:

''اے میرے رحیم خدا! مجھ پر رحم فرما'' کہیں گے۔ رحیم خدا کی بجائے قہار خدا کہہ کر رحم نہیں مانگیں گے۔ اسی طرح

رزق مانگتے وقت رزاق خدا کہیں گے، جبار خدا نہیں کہیں گے۔علیٰ ھذ القیاس۔اب میرے سوچنے کا معاملہ یوں ہو جاتا ہے کہ بُت سامنے رکھا ہو یا ذہن میں بنایا ہوا ہو،اسے بُت ہی کہیں گے۔کہیں صفاتِ باری تعالیٰ کے معاملہ میں ہم بھی ذہن میں چھپائی ہوئی بت پرستی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے؟

اگر چہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الا اللہ

(یہاں مجھے لاہور میں منعقدہ جماعت اسلامی کے ایک خاص یوم تاسیس کی یاد آ گئی۔بڑے پیمانے کی اس تقریب میں علامہ اقبال کی نظم ''خودی کا سِرِ نہاں لاالٰہ الا اللہ'' خوش الحانی سے پڑھی گئی۔نظم کے تمام اشعار پڑھے گئے لیکن مذکورہ بالا شعر سنسر کر دیا گیا۔اس سنسر شپ کی خبر اخبارات میں چھپی۔میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہاں چور کی داڑھی میں تنکا والی کوئی بات رہی ہوگی،لیکن میں نے اس سنسر شپ کی خبر کا بھرپور لطف لیا تھا)

میرا خیال ہے اپنے آپ کو سمجھنے میں اور خالقِ کائنات کو سمجھنے میں شاید میں کچھ بھٹکنے سا لگا ہوں اس لیے جوگندر پال کے ایک افسانہ ''سانس سمندر'' کے خوبصورت اقتباس کو خود پر منطبق کرتے ہوئے،اپنی اس روداد کو سمیٹتا ہوں۔مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔

''وہ پکی قبر؟......وہ ایک مجذوب کے قبضے میں ہے۔بے چارہ اپنی اس کھوج میں دنیا سے باہر نکل گیا کہ پیدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا۔ارے بھائی تم ہو ہی کیا، جو کچھ ہوتے؟ وہ تو شکر کرو کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو چوم چاٹ کر تمہیں بنا دیا۔مگر باؤلا اپنی چھوٹی سی سمجھ بوجھ کو نہ چھوڑے ہوتا تو اتنی بڑی دنیا کیوں چھوڑتا۔تل گیا کہ اپنی تلاش میں وہیں جانا ہے جہاں سے آیا ہوں۔عین وہیں پہنچا ہوا ہے اور اپنی قبر کی پکی دیواروں کے اندر ہی اندر کچی مٹی ہو چکا ہے۔

ذرے کو جان کیا ملی کہ پاگل نے مٹی سے کھیلنے سے انکار کر دیا مگر مٹی تو اپنے ذرے ذرے سے کھیلتی ہے۔''

یہاں تک آتے آتے مجھے ایسا لگا ہے جیسے آج میرے اندر کے بادشاہ اور ملنگ میں لڑائی ہوگئی ہے۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ جیت گیا ہے اور فقیر کو قبر میں ڈال دیا گیا ہے۔لیکن فقیر کی تو قبر بھی زندہ رہتی ہے اور سانس لیتی ہے۔اب میں نہ خود سے مزید مکالمہ کر سکتا ہوں نہ اپنے قارئین سے مزید گفتگو کی گنجائش ہے،بس خدا سے ایک سوال ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے،سلطانی بھی عیاری

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنی کہانی کا درویش بھی میں ہوں،سلطان بھی میں ہوں،
اور خدا کا سادہ دل بندہ بھی میں ہی ہوں۔

سوانحی وادبی خاکہ

ڈاکٹر رضیہ حامد

(۱)	نام	:	**ڈاکٹر رضیہ حامد**
(۲)	ولدیت	:	والد۔سید فتح علی۔ والدہ: سیدہ بیگم
(۳)	جائے پیدائش	:	بھوپال (مدھیہ پردیش)
(۴)	پتہ	:	۶،کنارہ اپارٹمنٹ۔دوسری منزل۔وی.آئی.پی. روڈ،بھوپال۔462001۔ایم.پی۔انڈیا۔
(۵)	فون	:	(0755)2734119(o) 2738168(R) 2544100(R) M.9826949473

(۶) **تعلیمی قابلیت**

بی۔اے۔	۱۹۶۹ء	وکرم یونیورسٹی۔اوجین۔مدھیہ پردیش۔
ایم۔اے(عربی)۔	۱۹۷۲ء	بھوپال یونیورسٹی۔بھوپال۔مدھیہ پردیش۔
ایم۔اے(اُردو)۔	۱۹۸۳ء	جامعہ ملیہ اسلامیہ۔نئی دہلی۔
پی۔ایچ۔ڈی۔	۱۹۸۲ء	بھوپال یونیورسٹی۔بھوپال۔مدھیہ پردیش۔

(۷) **زبانوں میں اچھی استعداد** : اردو، ہندی، انگلش، عربی

(۸) **مطبوعہ کُتب** :

۱۔	نواب صدیق حسن خاں (تحقیق وتنقید)	اردو	۱۹۸۳ء
۲۔	لمحوں کا سفر (افسانے)	اردو	۱۹۸۴ء
۳۔	معاون حج	اردو/ہندی	۱۹۸۵ء
۴۔	بشیر بدرؔ فن وشخصیت	اردو	۱۹۸۸ء
۵۔	رفعت سروش،شخصیت وفن	اردو	۱۹۹۰ء
۶۔	رفعت سروش،بحیثیت نثر نگار	اردو	۱۹۹۰ء
۷۔	اوپیرا نگاری	اردو	۱۹۹۱ء

۸۔	نقوشِ بھوپال	اردو	۱۹۹۸ء
۹۔	بھوپال درپن	ہندی	۱۹۹۸ء
۱۰۔	علی گڑھ میرا چمن	اردو	۲۰۰۰ء
۱۱۔	محمد احمد سبزواری۔فن وشخصیت (تحقیق)	اردو	ء
۱۱۔	محمد احمد سبزواری: ایک مطالعہ	اردو	۲۰۰۳ء
۱۲۔	اعتبار (رہبر جونپوری کی شخصیت اور شاعری)	اردو	۲۰۰۴
۱۳۔	ارمغانِ اختر سعید خاں	اردو	۲۰۰۵ء
۱۴۔	اعتراف (قاسم رسا فن وشخصیت)	اردو	۲۰۰۶ء
۱۵۔	خالد عابدی: شخصیت اور خدمات	اردو	۲۰۰۶ء
۱۶۔	بھوپالی اردو	اردو	۲۰۰۶ء
۱۷۔	یادوں کی مہک	اردو	۲۰۰۷ء
۱۸۔	کائنات فکر ونظر (تحقیق وتنقید)	اردو	۲۰۰۸ء

(۹) کتب (زیر تصنیف/ترتیب)

۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم
۲۔ غالب کی حس مزاح
۳۔ اردو مثنویوں میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے اثرات
۴۔ شبلی ایک ہمہ گیر شخصیت
۵۔ متنبّی: ایک مطالعہ
۶۔ متاعِ نقد ونظر
۷۔ عشرت قادری: اپنے فن کے آئینہ میں
۸۔ مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا۔۔۔۔۔۔۔(علیگڑھ سے متعلق یادیں)

(۱۰) دیگر علمی وادبی خدمات:

الف۔صحافت

سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی کا اجراء ۱۹۸۶ء۔
فکر وآگہی کی مدیرہ۔

۱۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	بشیر بدر نمبر ۱۹۸۷ء	

۲۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	رفعت سروش نمبر	۱۹۸۸ء
۳۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	اوپیرا نمبر	۱۹۹۱ء
۴۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	بیکل اتساہی نمبر	۱۹۹۲ء
۵۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	بھوپال نمبر ۱۹۹۲ء	
۶۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	علیگڑھ نمبر ۲۰۰۰ء	
۷۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	محمد احمد سبزواری نمبر	۲۰۰۳ء
۸۔	سہ ماہی فکر وآگہی، دہلی	ارمغان اختر سعید خاں	۲۰۰۵ء

ب۔ ۱۔ادبی رسالوں میں تحقیقی وتنقیدی مضامین کی اشاعت
۲۔ آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت: افسانہ، تنقید، فیچر
۳۔ ادبی سیمیناروں میں شرکت
۴۔ ادبی سمپوزیموں میں شرکت

ج۔ ۱۔ بانی سکریٹری سید فتح علی ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال ۲۰۰۱ء تا حال

د۔ ۱۔ سکریٹری بزم ادب شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۹۸۲۔۸۳ء
۲۔ بانی سکریٹری نواب سلطان جہاں بیگم، ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال۔ ۱۹۸۲ء تا حال

(۱۱) انعامات واعزازات:

۱۔	آل انڈیا ایوارڈ مغربی بنگال اردو اکادمی	۱۹۸۴ء
۲۔	یوپی اردو اکادمی ایوارڈ	۱۹۸۴ء
۳۔	بہار اردو اکادمی ایوارڈ	۱۹۸۴ء
۴۔	مغربی بنگال اردو اکادمی ایوارڈ	۱۹۹۰ء
۵۔	امتیازِ میر۔میرا اکادمی لکھنؤ۔	۱۹۹۷ء
۶۔	نواب صدیق حسن خاں ایوارڈ۔ایم۔پی۔اردو اکادمی۔	۹۹۔۱۹۹۸ء
۷۔	نشانِ سپاس۔بھوپال انٹرنیشنل فورم کراچی۔	۲۰۰۰ء
۸۔	بہار اردو اکادمی ایوارڈ۔	۲۰۰۳ء
۹۔	اعزاز وسپاس نامہ۔ایم۔کے۔بی۔اردو لائبریری اینڈ اسٹڈی سینٹر گوالیار۔۲۰۰۶ء	
۱۰۔	اعزاز وسپاس نامہ۔خوشبو ایجوکیشن اینڈ کلچرل سوسائٹی بھوپال	۲۰۰۹ء

(۱۲) ممبر:

۱۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی۔

۲۔ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس، نئی دہلی۔

۳۔ بانی ممبر دہلی اسٹیٹ اردو پبلشرز ایسوسی ایشن۔ دہلی۔

۴۔ بانی ممبر سید فتح علی ایجوکیشن سوسائیٹی (رجسٹرڈ) بھوپال

۵۔ بانی ممبر نواب سلطان جہاں بیگم ایجوکیشن سوسائٹی۔ بھوپال

(۱۳) اسفار:

سعودی عرب، پاکستان۔ یونائیٹڈ عرب امارات (الامارات العربیۃ المتحد ۃ) انگلستان۔

(۱۴) اولاد و احفاد:

اولاد	احفاد
سید محمد عامر	ھُدیٰ بنت عامر، بشریٰ بنت عامر
صالحہ شفیع	سعدیہ، صفا، محمد سعد
ڈاکٹر سید محمد عاصم	سید محمد علی قاسم، سید محمد یوسف، عائشہ بنت عاصم
سید محمد عاطف	آئرہ بنت عاطف

☆☆☆

''اہلِ ثروت کے ذوق ادب نمائی اور اردو مدیران کی مالی مجبوریوں کی وجہ سے آج کل نمبروں اور گوشوں کی روش عام ہو چلی ہے مگر رضیہ حامد میں یہ مادہ ہی نہیں وہ مادی فوائد سے بے نیاز ہیں انہوں نے مادی نقصان کے بدلے میں نیک نامی عزت اور شہرت حاصل کی ہے۔ رہِ عشق میں فکر سود و زیاں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی اور یہ بات دہرانے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اردو زبان و ادب سے عشق کرتی ہیں اس لئے وہ اس راہ میں کبھی اور کہیں طالب زر نظر نہیں آتیں۔'' (**پروفیسر خالد محمود** کے ایک مضمون سے اقتباس)

ڈاکٹر رضیہ حامد کی مرتب کردہ کتاب محمد احمد سبزواری ''فن اور شخصیت'' دیکھی اور بینائی کی کمی کے باوجود پڑھی۔ بیحد پسند آئی۔ سبزواری صاحب کے متعلق جتنی معلومات ممکن ہوسکتی ہیں سب رضیہ حامد نے یکجا کردی ہیں۔ شاید ہی کوئی گوشہ تشنہ ہو۔ اتنی معلومات کسی کے متعلق میں نے اب تک نہیں دیکھی۔ ہوسکتا ہے کچھ اس میں میری کم علمی بھی شامل ہو۔ پھر بھی یہ انتہائی عرق ریزی اور دیدہ وری کا نتیجہ ہے۔

(**پروفیسر شفیقہ فرحت** کے تبصرہ ''رضیہ حامد اور محمد احمد سبزواری'' سے اقتباس)

محمد احمد سبزواری (کراچی)

تحقیق و ادب کی ایک بے لوث ادیبہ

ڈاکٹر رضیہ حامد

اگر یہ کہا جائے کہ تین سو سال سے بھوپال پر خواتین کا سایہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ کہانی اوائل اٹھارویں صدی رانی کملا پتی سے شروع ہوتی ہے جس نے امداد کے صلے میں اپنا یہ علاقہ بیرسیہ کے سردار دوست محمد خان کی نذر کردیا۔ سردار کی بیگم کو دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ایک وسیع جھیل نے کچھ ایسا لُبھایا کہ انھوں نے اس کے کنارے ایک قلعہ اور شہر بسانے کی خواہش کی اور سردار نے سر خم کیا اور یوں قلعہ فتح گڑھ اور شہر بھوپال آباد ہوا جس کو ایک نیک سرشت خاتون ماجی ممولا اور ان کی پوتی زینت بیگم نے پُر آشوب دور میں حفاظت کرتے ہوئے فرشتہ صفت ولیّہ قدسیہ بیگم کی گود میں ڈال دیا۔ ان کی مدبر اور منتظم بیٹی سکندر جہاں نے ریاست کو ریاست کی شکل دی، اردو کو ریاست کی قانونی زبان قرار دیا، دفتر تاریخ کی بنیاد رکھی۔ دہلی کی بند جامع مسجد کو کھلوایا اور اپنی فارسی دانی سے سید غوث علی شاہ کو لاجواب کردیا۔ اپنی خودنوشت سوانح تزک سکندری کا آغاز کیا مگر مکمل نہ کرسکیں جس کو ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم نے مکمل کیا جو اپنی ماں سے مختلف شعر و شاعری اور تعمیرات کی دلدادہ تھیں۔ دو دیوان اور ایک طویل مثنوی اپنی یادگار چھوڑی۔ حال میں محترمہ ادا جعفری نے قدیم شعراء کے تعارف اور انتخاب ''غزل نما'' میں ان کو منتخب کیا ہے۔ ان کی صاحب زادی سلطان جہاں بیگم ۴۱ کتابوں کی مصنفہ اور برصغیر میں یونی ورسٹی کی پہلی خاتون چانسلر تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمشیرہ آبرو بیگم ان کی لٹریری سکریٹری تھیں۔ نواب حمید اللہ خان کی پہلی بیگم میمونہ سلطان نے علامہ شبلی کی ایک فارسی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ رسالت مآب کی سوانح ذکر مبارک، اکابر اسلام پر سلک مروارید کا سلسلہ اور سیاحت سلطانی (سفرنامہ یورپ و انگلستان) ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان کی صاحبزادی شہزادی عابدہ سلطان نے ''ریبل پرنسیز'' Memores of a Rebel Princess ایک چونکا دینے والی کتاب لکھی۔ صحافت میں بھی خواتین کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ انور جہاں مستور (آفتاب نسواں) خاتون ارشد، بانو ارشد کی والدہ

(ماہ نامہ بانو) قمر النساء بیگم (والدہ اختر جمال) نے ہفتہ وار امہات جاری کیا اور اب ڈاکٹر رضیہ حامد سہ ماہی فکر و آگہی کے ذریعہ ان سب سے سبقت لے گئیں۔ حمیدیہ اور دوسرے کالجوں اور خصوصاً بھوپال یونیورسٹی حال برکت اللہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے درجنوں طالبات نے ایم۔اے، ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے تحریر کئے جن کی فہرست کافی طویل ہے کچھ باہر چلی گئیں جیسے ڈاکٹر عالیہ امام (کئی کتابوں کی مصنف) حامدہ مسعود (غالب کے خطوط کا فنی تجزیہ) بانو ارشد (افسانہ نگار چار کتابوں کی مصنفہ) ثروت سلطانہ (ہائیکو نگار) وغیرہ تعلیمی اداروں کے قیام کے بعد اساتذہ کے ساتھ بعض خواتین بھی باہر سے آئیں۔ جیسے صفیہ جاںنثار، شفیقہ فرحت وغیرہ۔ یہاں کی زیادہ تر طالبات نے بھوپال کے شاعروں اور ادیبوں کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا مگر تین نام اس ڈگری سے ہٹ کر ہیں ایک ڈاکٹر فعت سلطان جنہوں نے اپنے وقت کے نابغہ مولانا ابوالحسن علی ندوی حیات و خدمات کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ دوسری ڈاکٹر طاہرہ وحید عباسی جنہوں نے اقبال کی فارسی شاعری کے مترادفات پر انگریزی میں مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور تیسری رضیہ حامد جنہوں نے بمصداق ''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں'' مروجہ مضامین کو چھوڑ کر عربی میں ایم۔اے کیا۔ پھر جویائے علم نے اردو میں ایم۔اے کیا اور اس کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھیں بلکہ نواب صدیق حسن خان پر مقالہ لکھ کر عربی میں پی۔ایچ۔ڈی کر لیا۔

یوں تو نواب صاحب کی سوانح ان کے چھوٹے صاحبزادے علی حسن خان نے ماثر صدیقی کے نام سے چار جلدوں میں مرتب کی۔ سعید اللہ خاں نے کمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھا۔ سید اجتبیٰ ندوی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے عربی میں پی ایچ ڈی کے لئے ایک مقالہ لکھا مگر رضیہ حامد نے نواب صاحب پر اردو میں پہلا مقالہ لکھا۔ جس کا مقدمہ محترم سید ابوالحسن ندویؒ نے تحریر فرمایا اس کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ مقالہ نگار عربی اور اردو کی ایم اے ہیں اور نواب صاحب کی بیشتر کتابیں اور رسائل نہ صرف عربی میں ہیں بلکہ اردو مطبوعات کے نام بھی عربی میں ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ حضرت مولانا ندوی نے تحریر فرمایا ہے ''کہ ان کا (مصنفہ کا) تعلق بھوپال سے ہے جو نواب صاحب کا مسکن اور مدفن اور ان کی علمی اور تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے اور موصوفہ کے ان کے خاندان سے قرابت کے رشتے بھی ہیں (گو مصنفہ نے اس کا تذکرہ کہیں نہیں کیا) .... لہذا اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے''

میں ایک اور پہلو سے ان کی حوصلہ مندی، بلند ہمتی اور غیر معمولی جرأت کی داد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے بحیثیت بھوپالی اور بھوپال میں مقیم ہونے اور ان کے والد بزرگوار کا نواب حمید اللہ خان کے پرائیوٹ آفس سے تعلق بلکہ بعد میں ان کے اور ان کی جانشین نواب مہر تاج ساجدہ سلطان کے پرائیوٹ سکریٹری رہنے کے باوجود نواب صدیق حسن خان کی زندگی کو اپنے مقالے کا موضوع منتخب کیا۔

نواب صاحب کو نہ صرف شاہی خاندان، ریاست کے متوسلین بلکہ عوام الناس کی اکثریت پسند نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ مدرسہ سلیمانیہ جس کے ابتدا میں نواب صاحب منتظم رہے وہاں ان کی کوئی کتاب یا رسالہ درس میں شامل نہیں رہا۔

گو مصنفہ نے ان الزامات کی صفائی پیش کی ہے جو نواب صاحب پر سرکار برطانیہ یا ریاست کی طرف سے لگائے گئے تھے مگر بعض حقائق سے انکار ممکن نہیں مثلاً ان کے والد سید اولاد حسین تحریک جہاد میں سید احمد شہیدؒ کے ہم رکاب رہے وہ جہاد کے عظیم مجاہد اور سید احمد شہید کے زبردست شیدائی اور فدائی تھے۔.....ان کے قلب میں فرنگی سامراج کی طرف سے بغض و نفرت اور عداوت کی آگ شعلہ زن تھی جس کی چنگاریاں بزگوار باپ کی طرف سے سعادتمند بیٹے کی طرف یقیناً منتقل ہوئی ہوں گی (وجدی ص ۱۸۰) یہ کہنا کہ ان کو وہابی مسلک کی وجہ سے ناپسند کیا جاتا تھا درست نہیں۔ اسی زمانے میں زین العابدین قضا کے عہدے پر مامور تھے ان کے اعزا شیخ حسین بن محسن الیمانی نواب صاحب کے استاد بھی رہے اور شیخ محمد بن حسین انصاری مجلس علماء کے رکن اور اساتذئے فقہ و حدیث تھے، اسی خاندان کے مولانا خلیل عرب انصاری، شہزادی عابدہ سلطان اور ان کے بیٹے کے معلم رہے۔ یہ سب وہابی المسلک بزرگ تھے۔ دراصل نواب صاحب کی مخالفت ان کی شدت پسندی کی وجہ سے تھی انہوں نے محافل میلاد مجالس، عرس، تعزیوں یا علم کے جلوس، شب برأت پر حلوہ سازی اور آتش بازی سب کو ممنوع قرار دے دیا تھا، دوسرے ان کی پوری کوشش تھی کہ ولی عہدہ ریاست کا عقد ان کے بڑے صاحبزادے سے ہو جائے لیکن قدسیہ بیگم (رئیسہ کی نانی) اور دیگر اخوان ریاست خصوصاً جلال آبادی خاندانوں کی شدید مخالفت سے یہ بیل پروان نہ چڑھ سکی۔ (وجدی ۱۹۱) لیکن رئیسہ شاہجہاں بیگم اور ان کے شوہر قدسیہ بیگم سے اس قدر ناراض ہو گئے کہ ان کو نہ تو سلطان جہاں بیگم کی شادی میں مدعو کیا اور نہ ان کو جمعہ کی دعوت (جو بھوپال میں عام تھی) کرنے کی اجازت دی۔ خود ماں اور بیٹی کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی کہ وہ شاہجہاں بیگم کے مرتے دم تک باقی رہی۔ سلطان جہاں بیگم نے اپنی کتاب تزکِ سلطانی میں اپنی ماں سے بسترِ مرگ پر ملاقات کی کوشش کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کو پڑھ کر دل پگھل جاتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ نواب صاحب نے بیٹی کی طرف سے ماں پر وہ کونسا جادو کر دیا یا کونسا منتر پھونکا کہ وہ آخر وقت تک اپنی اکلوتی بیٹی سے ملنے کی روادار نہیں ہوئیں۔'' (وجدی ۱۹۱) ان کی بعد کی عبارت میں قدیم وفاداروں اور خاندانوں پر ظلم و ستم کا ذکر ہے[1]

---

[1] بھوپال تحریکات آزادی کے آئینہ میں۔ سیّد عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہرِ بھوپال۔ واضح رہے کہ وجدی صاحب نواب صاحب کے حامی تھے اور ان کے والد نواب صاحب کے حاشیہ نشین تھے اور یہ خود مولانا عبید اللہ کے شاگرد رہے۔ لہٰذا ان کے خیالات نواب صاحب کے متعلق معاندانہ نہیں ہو سکتے۔

نواب صدیق حسن خان کی زندگی خود ان کے بقول ۔

کبھی ہے عیش، کبھی غم، کبھی خوشی، کبھی رنج
ہمارا حال سدا وقفِ انقلاب رہا

ایسے فرد پر مقالہ لکھنا اور ان کی روایتی علمی اور ادبی عربی کو سمجھنا کافی مشکل مسئلہ تھا لیکن رضیہ حامد اس مرحلے سے بخیر وخوبی گذریں۔ یہ بھی حُسن اتفاق ہے کہ جب رضیہ حامد نے تعلیم کی ابتدائی منازل طے کیں اس وقت بھوپال میں حمیدیہ کالج اور لڑکیوں کے لئے مہارانی لکشمی بائی کالج قائم ہو چکا تھا ورنہ اس سے پہلے لڑکیوں کو بھوپال سے باہر جانا پڑتا تھا جو دشوار گذار مسئلہ تھا، پھر ان کی خوش نصیبی کہ بھوپال اور دہلی میں اردو کے لئے شفیقہ فرحت، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر شمیم حنفی۔ ڈاکٹر محمد ذاکر اور ڈاکٹر مظفر حنفی جیسے اساتذہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے تمام مراحل شادی کے بعد طے کئے۔ تعلیم اور علمی کارناموں میں ان کے نامور رفیق حیات ڈاکٹر سید محمد حامد نے ان کی حوصلہ افزائی کی جو ایک کم گو، خاموش، شریف النفس انسان ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں اور انہوں نے بھی اسلام میں فروغ انسانی وسائل کے مضمون پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ دونوں میاں بیوی نے مل کر باب العلم پبلیکیشنز کی بنیاد رکھی اور سب سے پہلے اپنا مقالہ شائع کیا جس کی خاصی پذیرائی ہوئی اور دوسری اشاعت کی نوبت آ گئی۔ جس سے ان کے اعتماد میں اضافہ ہوا اور سہ ماہی رسالہ فکر و آگہی کا ۱۹۸۶ء میں دہلی سے اجرا کیا جہاں حامد صاحب ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ گو انہوں نے رسالہ کی ترتیب واشاعت میں ہر طرح کی مدد کی مگر رسالے کے معاملات میں کسی شاونیت کا اظہار نہیں کیا ہر موقع پر پرنس البرٹ (ملکہ وکٹوریا کے شوہر) کا کردار ادا کیا۔ رسالہ اپنے مخصوص شماروں کی بدولت تھوڑے عرصے میں کافی مقبول ہو گیا۔ انہوں نے بھارت کے ایک بزرگ شاعر، مترجم، نثر نگار اور اوپیرا نگار اور منظوم ڈراموں کے خالق رفعت سروش پر جن کی شاعری اور ڈرامہ نگاری پر کوئی چار درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور درجنوں انعامات مل چکے ہیں، ایک رفعت نمبر شائع کیا۔ بھارت کے دو اور کہنہ مشق بزرگ اور متنوع شاعروں یعنی بشیر بدر اور بیکل اتساہی پر دو خصوصی نمبر شائع کئے۔ جیسے جیسے رضیہ حامد آگے بڑھتی رہیں اپنے پچھلے کاموں کو پیچھے چھوڑتی رہیں۔ دراصل ان کے دو عظیم تاریخی کارناموں میں نقوش بھوپال یا بھوپال نمبر اور علی گڑھ نمبر ہیں۔ دونوں ہزار ہزار صفحات پر مشتمل اور نادر تصویروں سے مزین ہیں، ریاست بھوپال گو بہت بڑی ریاست نہ تھی مگر اس کے رؤسا اور بھوپالیوں نے برصغیر کی تاریخ، ادب وشاعری، تعلیم، کھیل بلکہ سیاست وثقافت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں بھارت اور پاکستان کا وہ کون سا میدان ہے جہاں بھوپالیوں کے نقوش نظر نہیں آتے ہوں۔ بھوپال کی زیادہ تر تاریخیں رؤسائے وقت نے لکھیں لہٰذا ان میں عوام الناس کے کارنامے دخل نہ پاسکے۔ دوسرے چونکہ برصغیر کی ساڑھے چھ ریاستوں کے رئیس عموماً اپنی بدعنوانیوں، ظلم وستم، عیاشی اور بدچلنی

کی بنا پر بدنام تھے لہٰذا بھوپال کو بھی اسی زمرے میں ڈال کر نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض کتابیں منظر عام پر آئیں جیسے سلیم حامد رضوی کی کتاب جو ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کے حصے پر'' روشنی ڈالتی ہے، ایم عرفان کی کتاب جو ''برکت اللہ بھوپالی'' پر ہے جو غدر پارٹی کے نامزد وزیر اعظم تھے اور جس کا حال ہی میں ڈاکٹر رضیہ حامد کے برادر ڈاکٹر سید افتخار علی نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، سید عابد علی وجدی الحسینی کی کتاب 'جو تحریکات آزادی ہند' پر مشتمل ہے یا اسد محمد خان کی کتاب ''سپاہی بہادر'' جو ۱۸۵۷ء کے بھوپالی جیالوں کی جاں فروشیوں کی داستان ہے یا مصطفیٰ تاج کے منتخب بھوپالیوں کے مزاحیہ خاکے یا شہر یار ایم خان کی بیگمس آف بھوپال اور خصوصاً ان کی والدہ محترمہ شہزادی عابدہ سلطان کی حالیہ کتاب ''باغی شہزادی''۔ یہ دونوں کتابیں شاہی خاندان کے افراد نے لکھی ہیں مگر ان میں اندرون خانہ واقعات کا تذکرہ ہے، تاہم اب تک ایسا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آ رہا تھا جو بیک وقت ریاست کے جغرافیہ، تاریخ، معاشرت، ثقافت، قدیم اقوام، کھیل تفریحات، عمارات اور باغات اور عام مکینوں کے حالات پر مشتمل ہو۔ اسی لئے تبصرہ نگاروں نے اس کو بجا طور پر بھوپال کا انسائیکلو پیڈیا کہا ہے، اب بھوپال یا بھوپالیوں پر جو بھی کتاب لکھی جائے گی وہ اس کے حوالے سے ہی معتبر ٹھہرے گی۔ خود شہر یار ایم خان کی کتاب میں اس کے متعدد حوالے بشمول راقم کے ایک مضمون کے ملتے ہیں۔ دہلی، بھوپال اور کراچی میں اس کی رونمائی کی تقاریب ہوئیں، دہلی میں ایوان صدر میں بھوپال کے فرزند صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اس کی رونمائی کی اسکے بعد دہلی میں ہی سید حامد اور پروفیسر گوپی چند نارنگ اور بھوپال میں یہ رسم ہندوستان کی سابقہ خاتون اول وملا شرما (مسز شنکر دیال شرما) نے انجام دی۔

ڈاکٹر رضیہ کا دوسرا کارنامہ علی گڑھ نمبر ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایم اے او کالج یا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ محض ایک تدریسی درس گاہ نہیں تھی بلکہ یہ علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کا گہوارہ تھی۔ برصغیر کی علمی اور ادبی دنیا اس کے تاریخی کردار کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ سرسید کی علمی خدمات اور علیگڑھ کی روایات پر اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مگر رضیہ حامد نے جس طرح سرسید اور ان کے رفقا، کالج اور یونیورسٹی کی تعمیرات، شعبہ جات، اقامت، قانون، لائبریری کے ساتھ نامور فرزندان کے تذکروں کو ۷۵ نگارشات میں نادر تصویروں کے ساتھ سمیٹ لیا ہے وہ قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔ بھوپال اور علی گڑھ دونوں نمبروں کے لئے نہ صرف انھوں نے تاریخی مواد تلاش کیا۔ مضمون نگاروں کی جستجو کی ان سے مضامین لکھوائے، تصویریں جمع کیں اس کی داستان کافی طویل ہے ساتھ ہی انھوں نے محض رسالوں کی ترتیب کو پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ ذاتی تحقیق اور تجسس سے بھی کام لیا۔ جس کا اندازہ نقوش بھوپال میں میرے ایک مضمون کے تتمہ سے ہوسکتا ہے جس میں موصوفہ نے ایک گہرے ناقد کی طرح کوئی ۳۳ استفسارات کئے تا کہ قارئین تک صحیح

چیز پہنچ جائے۔

حال میں موصوفہ نے راقم کی فن و شخصیت پر دو سو صفحوں کی ایک کتاب مرتب کی جس کی رونمائی علی گڑھ، بھوپال اور کراچی میں ہوئی جس میں نامور ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں نے شرکت فرمائی مگر وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئیں اور فکر و آگہی کا ۴۰۰ صفحات پر مشتمل محمد احمد سبزواری نمبر شائع کیا جس کے لئے پاکستان، ہندوستان، اور انگلستان کے ادیبوں اور شعراء سے راقم پر مضمون لکھوائے۔ اس کے متعلق میرا کچھ کہنا تعلّی ہوگی لہذا میں اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں تاہم ان کے خلوص و محبت ایک قدیم ہم وطن کی قدر افزائی ہند و پاک دوستی اور بھائی چارے کے جذبات کی قدر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ میں اعلیٰ ذوق کے اس علمی و ادبی ہنس کے جوڑے سے صرف اپنی ممنونیت کا اظہار کرسکتا ہوں۔ ان کے ادارے باب العلم سے دوسری کتابیں بھی شائع ہورہی ہیں۔ حامد صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد یہ لوگ بھوپال منتقل ہو گئے ہیں اور وہاں سے علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اب بھوپال میں رضیہ حامد نے اپنے والد مرحوم کی یاد میں فتح علی میموریل لیکچر کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ میں ان کی بھرپور کامیابی کے لئے عا کرتا ہوں۔

آخر میں دو چار نجی باتیں، بارہ تیرہ برس ۱۹۹۲ء سے پہلے میں رضیہ حامد سے ناواقف تھا۔ حالانکہ ان کے والد محترم کو میں ۴۳/۱۹۴۲ سے جانتا تھا جب انہوں نے ہز ہائینیس بھوپال کا پرائیوٹ آفس جوائن کیا کیونکہ میرے والد قبلہ اس دفتر میں پہلے کام کرتے تھے۔ ان کے تایا سید انور علی مرحوم سے بھی اسی وقت کی اللہ یاد تھی۔ جب میں پہلی مرتبہ کراچی سے بھوپال گیا تو سب سے پہلے چائے پر مدعو کرنے والے بھائی انور تھے۔ فتح علی صاحب سے بھوپال اور کراچی میں جب وہ نواب حمید اللہ خاں کے ساتھ یہاں آتے تھے ملنا ہوتا تھا۔ ایک روز رضیہ حامد کا خط آیا جس میں انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور بھوپال نمبر کے لئے مضمون مانگا اور یوں دوستی کا آغاز ہوا۔ ملاقاتوں پر پتہ چلا کہ یہ ایک سیدھی سادی بھولی بھالی خاتون ہیں جنہیں نہ آرائش حسن و جمال کا خیال اور نہ زرین و رنگین ملبوسات کا شوق، صرف انہیں علمی و ادبی تحقیق کا ذوق ہے۔ ان کی ساری گفتگو مضمون، کتابوں، رسالوں کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔ جیسی وہ سادہ اسی طرح ان کی عبارت بھی آسان، زبان صاف، عربی کی طالبہ ہونے کے باوجود عربی کی گنجلک الفاظ سے پرہیز اور ان کا سادہ کردار ہی ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے اور وہ اپنی کوششوں سے بھوپال کی علمی و ادبی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے میں مصروف ہیں۔ نہ انھیں ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا اور اسی وجہ سے میں نے انھیں بے لوث ادیبہ سے موسوم کیا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

ڈاکٹر رضیہ حامد۔ بھوپال کی ہونہار بیٹی

میں بچپن سے علم و ادب کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کرنے والوں کی دل سے قدر کرتا رہا ہوں جس کی وجہ والدین کی تربیت کے ساتھ میرے گاؤں دسنہ کا علمی، ادبی اور تہذیبی ماحول، وہاں کا قابلِ قدر کتب خانہ الاصلاح اور انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ تھے جس نے علم کی روشنی سے میرے دل دماغ کو منوّر کرنا شروع کر دیا تھا اور بہتر زندگی کا شعور عطا کیا تھا ساتھ ساتھ تعلیم کی مختلف منزلوں نے خدمت کا جذبہ بیدار کیا تھا۔

اسی کے ساتھ دسنہ میں علاّمہ سید سلیمان ندوی، سید ابوظفر ندوی، شبیر الحق دسنوی، عبدالحکیم رحمانی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان وغیرہ کی بار بار ملاقاتیں اور ان کی علمی ادبی خدمات سے آگاہی نے میرے جذبۂ علم دوستی کو مہمیز کرنے میں مدد کی تھی، جس کا اظہار دسنہ سے باہر بمبئی میں دورانِ تعلیم شروع ہوگیا تھا۔ اس زمانۂ طالب علمی میں ریاست بھوپال کا ذکر مختلف وقتوں میں مختلف شخصیتوں کے ذریعہ میرے سامنے ہوتا رہتا تھا جس سے بھوپال کے لئے میرے دل میں قدر و منزلت بڑھتی گئی تھی۔ اختتام تعلیم کے بعد اللہ تعالیٰ نے حالات کچھ ایسے پیدا کر دیئے کہ میں بھوپال کے سیفیہ کالج کے شعبہ اردو سے منسلک ہوگیا۔ یہاں کی ملازمت کے دوران مجھے بھوپال کو قریب سے دیکھنے اور یہاں کے علم و ادب کے خدمت گزاروں سے ملنے کا موقع ملا جس کے نتیجہ میں ماضی کے اہل علم و ادب سے متعلق آگاہی بھی ہوتی رہی۔ یہیں آکر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' کے موضوع پر اہم مقالہ لکھ کر Ph.D کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس اہم مقالہ کی خبر نے اسے دیکھنے اور پڑھنے کی تڑپ دل میں پیدا کردی اور یہ آرزو دل میں مچلنے لگی تھی کہ مقالہ جلد چھپ کر منظرِ عام پر آجائے تو مطالعہ کا موقع مل جائیگا۔ خدا خدا کرکے دل کی یہ آرزو بھی پوری ہوئی اور ۱۹۶۵ء میں یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا۔ جس کی ایک جلد میرے حصہ میں بھی آئی جس کا مطالعہ کیا تو ایک خاص خوشی کی دولت سے مالا مال ہوا۔ خاص طور سے ماضی میں بھوپال کی اہم علمی ادبی خدمات سے میں نہ صرف واقف ہوا بلکہ حال سے بھی آگاہ ہوا جس سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی قدر و منزلت میرے دل میں اور زیادہ بڑھ گئی۔ بعد میں ایم۔ عرفان

مرحوم نے اپنے رسالہ کا مدھیہ پردیش نمبر نکال کر ایک اہم کام کی طرف اہل علم و ادب کو متوجہ کیا۔ میری یہی بھوپال کے ماضی اور حال کے علمی ادبی کاموں سے دلچسپی تھی جس نے عزیزم ڈاکٹر محمد نعمان کو ''بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا اور انھوں نے اس موضوع کو پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے انتخاب کر کے ۱۹۹۰ء میں نہ صرف ڈگری حاصل کی بلکہ اسے شائع کر کے بھوپال کی ادبی تاریخ کسی حد تک مکمل کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

یہاں آ کر جب مجھے بیگمات اور نوابانِ بھوپال کی علمی ادبی اور انسانی خدمات سے اور زیادہ آگاہی ہوئی تو دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ اس سے متعلق معلومات افزا کتابیں منظرِ عام پر آنا چاہئے۔ ایک عرصہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ جناب فتح علی صاحب کی صاحبزادی رضیہ حامد نواب صدیق حسن خاں سے متعلق پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہی ہیں تو دلی مسرت ہوئی لیکن بار بار دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ نواب صدیق حسن خاں جیسی اہم اور عظیم شخصیت سے متعلق معیاری مقالہ وہ قلمبند کر سکیں گی یا نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کی خدمات کا جائزہ صبر آزما اور مشکل تھا۔ چنانچہ اس کی تکمیل کی دل میں تمنا جاگ اٹھی خدا کا شکر ہے وہ مبارک دن بھی آیا جب یہ مقالہ مکمل ہوا اور ۱۹۸۰ء میں انھیں ڈگری تفویض ہوئی اب اسے مطالعہ کرنے کی خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ اہل اردو کے لئے یہ بڑا مسئلہ ہے کہ کتاب بھی قلمبند کریں اور اسے شائع بھی کرائیں۔ اس نیک کام کے لئے اللہ نے ان کی مدد کی۔ چنانچہ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اُتّر پردیش کے مالی تعاون سے یہ قیمتی مقالہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہو گیا۔

محترمہ رضیہ حامد نے اس کتاب کی ایک جلد مجھے بھی عنایت کی۔ ۳۹۴ صفحات کی اس کتاب کا جب میں نے مطالعہ کیا تو بے حد اطمینان ہوا کہ رضیہ حامد صاحبہ نے اس اہم تحقیقی کام کو بہ حسن و خوبی انجام دینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

اس تصنیف کے بعد ان کی دو کتابیں ''معاون حج'' اور افسانوں کا مجموعہ ''لمحوں کا سفر'' شائع ہوئیں لیکن اس مقالہ کی بات کچھ اور ہی نظر آئی۔

اسے انھوں نے نو ابواب میں نہایت دانشمندی اور سلیقہ کے ساتھ تقسیم کیا ہے۔ مقدمہ از مولانا سید ابوالحسن ندوی، حرفِ آغاز اور نقوشِ حیات بیک نظر کے بعد

- باب اول۔ تاریخی پسِ منظر۔
- باب دوم۔ سلسلۂ نسب اور خاندان۔
- باب سوم۔ حالاتِ زندگی اور حلیہ و اخلاق۔
- باب چہارم۔ بھوپال نواب صدیق حسن خاں سے قبل اور دورانِ قیام۔

- باب پنجم۔ دینی و علمی ترقیات و علمائے بھوپال۔
- باب ششم۔ تصنیفات۔
- باب ہفتم۔ علمی ادبی، سیاسی رجحانات و نظریات۔
- باب ہشتم۔ نواب صدیق حسن خاں کی خدمات کے اثرات و نتائج اور ان کا مقام۔
- باب نہم۔ نواب صدیق حسن خاں سے متعلق چند اہم شخصیات۔
- ضمیمہ جات۔ فہرست کتب نواب صدیق حسن خاں۔ شجرہ نواب صدیق حسن خاں اور کتابیات۔

ان ابواب کی روشنی میں انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی شخصیت اور خدمات سے متعلق اہم کتاب پیش کرنے میں نہ صرف کامیابی حاصل کی ہے بلکہ انھوں نے اس علمی شخصیت، جس کی خدمات پوری طرح روشن نہیں تھیں اپنی صحتمند کوشش اور صلاحیت سے نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مجھے مطالعہ کے دوران میں اس کا احساس بار بار ہوا کہ بھوپال کی ہونہار بیٹی نے اس مقالہ کو قلمبند کر کے نہ صرف خود نیک نامی حاصل کی بلکہ ایک اہم فرض کو ادا کر کے بھوپال کی عظمت کو نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ رضیہ حامد کی اس علمی، ادبی خدمت پر بھوپال کے صاحبِ نظر حضرات و خواتین کو ہمیشہ اپنی اس بیٹی پر ناز رہے گا۔

اس مفید کتاب (نواب صدیق حسن خاں) کی اشاعت ۱۹۸۳ء کے بعد انھوں نے دم نہیں لیا، بلکہ ۱۹۸۶ء میں ایک معیاری سہ ماہی رسالہ ''فکر و آگہی'' جاری کیا، جس کی اشاعت کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس دوران انھوں نے اس رسالہ کے ذریعہ حسب ذیل قیمتی شخصیات نمبر شائع کر کے بڑی نیک نامی حاصل کی ہے۔

(۱) بشیر بدر نمبر (۱۹۸۷)۔ (۲) رفعت سروش نمبر (۱۹۸۸ء)۔ (۳) بیکل اتساہی نمبر (۱۹۹۲ء)۔
(۴) محمد احمد سبزواری نمبر (۲۰۰۳ء)۔ (۵) ارمغانِ اختر سعید خاں (۲۰۰۵ء)۔

مندرجہ ذیل بالا نمبروں کے علاوہ اس رسالہ کے یہ تین نمبر بھوپال نمبر، علی گڑھ نمبر، اوپیرا نمبر اہم ہیں۔ ان میں خاص طور سے بھوپال نمبر اور علی گڑھ نمبر دونوں معلومات کے خزانہ ہیں۔ بھوپال کو ایسے ہی ضخیم اور مفید نمبر کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین ہے کہ محترمہ، نقوش لاہور کی نمبروں کی طرح ایک اور جدید بھوپال نمبر پیش کر کے بھوپال کے نثر نگاروں اور شعراء کے ساتھ ساتھ حال کی ادبی انجمنوں، تعلیم گاہوں، اخبارات، رسائل اور کتب خانوں وغیرہ کا تعارف کرانے میں کامیاب ہوں گی۔

خوشی کی بات ہے کہ سہ ماہی ''فکر و آگہی'' کی اشاعت کے ساتھ ان کی تصانیف و تالیفات کے منظر عام پر آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے نتیجہ میں ان کی حسبِ ذیل مطبوعات اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کر رہی

ہیں (۱) لمحوں کا سفر۔ (۲) معاونِ حج۔ (۳) بشیر بدر۔ فن اور شخصیت۔ (۴) رفعت سروش۔ شخصیت و فن۔ (۵) رفعت سروش بحیثیت نثر نگار۔ (۶) اوپیرا نگاری۔ (۷) نقوشِ بھوپال۔ (۸) بھوپال درپن (ہندی)۔ (۹) علی گڑھ میرا چمن۔ (۱۰) محمد احمد سبزواری۔ فن و شخصیت۔ (۱۱) محمد احمد سبزواری۔ ایک مطالعہ۔ (۱۲) اعتبار (رہبر جونپوری کی شخصیت اور شاعری۔ (۱۳) ارمغانِ اختر سعید خاں (۱۴) اعتراف۔ قاسم رسا فن و شخصیت۔ (۱۵) خالد عابدی۔ شخصیت و خدمات۔

یہی نہیں مختلف رسائل میں ان کے تحقیقی، تنقیدی و فکر انگیز مضامین مختلف وقتوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ ان کی علمی و ادبی خدمت کرنے کا سلسلہ آج بھی اسی انداز سے جاری ہے۔

رضیہ حامد صاحبہ میں یہ علمی ادبی خدمت اور کچھ اہم اور مفید کام کرنے کا جذبہ، وطن بھوپال کی نیک نامی میں اضافہ کرنے کی خواہش، اہل علم کی خدمات، مختلف طریقوں سے روشناس کرنے کی لگن دراصل ان کے والدین کی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ ہے۔ میں ان کے والد محترم سید فتح علی صاحب سے اکثر ان کے دولت کدہ پر ملا کرتا تھا۔ نہایت پرکشش شخصیت کے مالک تھے، گفتگو نہایت سادگی کے ساتھ کرتے تھے لیکن اس میں ہمیشہ خلوص کی آمیزش ہوتی تھی۔ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ میں ان سے جب بھی ملا، ان کی گفتگو اور اخلاق سے میرے دل میں اپنے بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور جب بھی ان سے مل کر واپس آتا تھا تو اپنے ساتھ مسرتوں کی دولت لے کر آتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان سے بار بار ملنے کی خواہش پیدا ہوتی رہتی تھی۔

رضیہ حامد صاحبہ کے بھائی اور بہن بھی نہایت سنجیدہ اور علم دوست ہیں۔ ان کے بھائی سید افتخار علی سیفیہ کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ وہیں سے ان سے تعلقات پیدا ہوئے تھے وہ نہایت ذہین اور سنجیدہ طالب علم تھے اور آج بھی وہ اپنی ان خوبیوں کے ساتھ زندگی کو خوب تر بنانے میں مصروف ہیں۔

بہنوں میں رابعہ سلطان جو سیفیہ کالج کے شعبۂ حیوانات کی کامیاب استاد ہیں ہمیشہ سے نیک نام رہی ہیں، سب ان کی استاد کی حیثیت سے قدر کرتے ہیں۔ ان کی تین اور بہنیں راحت بدر، رفعت سلطان، عطیہ سلطان نے تو سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں ہمیشہ سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ کلاس میں مسلسل حاضر رہتی تھیں۔ اردو کی اچھی طالب علموں میں انکا شمار تھا۔

رضیہ حامد صاحبہ کے گھر کے اچھے ماحول نے ادب کی خدمت کی راہ اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا، بھوپال کے ماحول نے جذبہ کو تیز سے تیز تر کیا اور ان کے دل و دماغ نے ادب کے میدان میں اترنے کی رہنمائی کی اور وہ آگے اور بہت بڑھتی گئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بھی وہی علم و ادب کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہے۔ میں نے ان کے اس ادبی خدمت سے متاثر ہو کر ''بمبئی سے بھوپال تک'' میں لکھا تھا:

''ڈاکٹر رضیہ حامد بھوپال ہی نہیں ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اپنے رسالہ ''فکر و آگہی'' کو خاص نمبروں کی اشاعت کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔'' (ص ۲۴۲)

اور آج میں اس سے زیادہ پُر زور الفاظ میں لکھ رہا ہوں کہ جو کچھ میں نے اس وقت ان کے بارے میں لکھا تھا وہ اس سے سوا ثابت ہو رہی ہیں وہ آج بھی علم و ادب کی خدمت میں اسی رفتار کے ساتھ مصروف ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی فکر و آگہی سے قارئین کو باخبر ہی نہیں کر رہی ہیں بلکہ اس راہ سے اردو زبان کی اپنے شہر بھوپال کی، اپنے وطن ہندوستان کی اور انسانیت کی خدمت کرنے میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں۔ ان کے لئے دل سے دعا نکلتی: تم سلامت رہو ہزار برس

رضیہ حامد صاحبہ سے متعلق تاثرات کے اختتام پر یہ بھی لکھتا چلوں کہ یہ بھی ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں سید محمد حامد صاحب جیسے نیک سیرت، انسان دوست اور ادب نواز شریکِ حیات ملے۔ جنہوں نے ان کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ہر قدم پر رہنمائی اور مدد کی۔ جس کی وجہ سے تمام مراحل کو وہ آسانی کے ساتھ طے کرتی ہوئی اور تیز رفتاری کے ساتھ مشکلات پر قابو پاتی ہوئی کامیابی کی منزلوں سے گزرتی رہیں۔ اس موقع پر آج ہی انھیں بھی دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے قلبی مسرت محسوس کر رہا ہوں، دعا ہے کہ وہ ہمیشہ صحتمند رہیں۔ آمین۔

☆☆☆

سابق نوابی ریاست بھوپال پوری دنیا میں اس لئے مشہور ہے کہ ریاست کی ڈھائی سو سالہ تاریخ میں پانچ بیگمات نے ڈیڑھ سو سال سے بھی کچھ زیادہ حکمرانی کی۔ پوری دنیا میں مع یورپ و امریکہ جہاں عورتوں کے حقوق اور آزادی کی بہت بات کی جاتی ہے کہیں بھی اتنے طویل عرصے تک خواتین کی حکمرانی کی مثال نہیں ملتی۔ بیگمات بھوپال کی طویل حکمرانی کی وجہ سے یہاں کی خواتین میں بیدار مغزی پیدا ہوئی۔ علم و ہنر اور شعر و ادب کی طرف رجحان ہوا اور خواتین نے ہر میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ غیر منقسم ہندوستان میں پہلی خلا باز خاتون بھی بھوپال نے پیدا کی۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی اولین چانسلر بھی نواب سلطان جہاں بیگم بنیں۔ علم و ادب کے میدان میں بھی خواتین حصہ دار ہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم تاجورؔ سے عصرِ حاضر تک ہر دور میں یہاں کی خواتین اپنی موجودگی اور اہمیت درج کراتی آئی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ (رضیہ حامد) ہیں۔ رضیہ حامد کی ایک شخصیت میں کئی شخصیات ضم ہیں۔ وہ ادیب ہیں شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی ہیں اور اعلیٰ پائے کی نقاد و محقق بھی۔ مستزاد یہ کہ بلند پایہ صحافی اور ناشر بھی ہیں۔ تخلیق علم و ادب میں ہمہ وقت منہمک رہنے کے باوجود دیندار اور پابند صوم وصلوۃ ہیں۔ سعادتِ حج سے بھی بار یاب ہو چکی ہیں۔

(کوثر صدیقی کے مضمون ''دُخترِ بھوپال ڈاکٹر رضیہ حامد کا بحیثیت صحافی ایک اجمالی جائزہ'' سے اقتباس)

ڈاکٹر بشیر بدر (بھوپال)

ڈاکٹر رضیہ حامد۔منفرد تنقید نگار خاتون

ڈاکٹر رضیہ حامد تک میری رسائی اس وقت ہوئی جب وہ غیر معمولی شہرت کی مالک تھیں، سہ ماہی فکر و آگہی کی ایڈیٹر تھیں۔ایک پردہ نشین خاتون کا معیاری ادبی رسالہ نکالنا اپنے آپ میں بہت قابلِ قدر کارنامہ تھا۔ کوئی ادبی محفل چاہے وہ تنقید کی ہو یا غزل کی ان کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلایا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کوشش کر کے ان تک پہنچا تو مجھے حیرت بھی ہوئی کہ وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں کے بھی حالاتِ زندگی سے ایسے ہی واقفیت رکھتی ہیں جتنا کہ وہ سر سید احمد خاں یا نواب سلطان جہاں بیگم کے متعلق معلومات رکھتی ہیں۔ دراصل ڈاکٹر رضیہ حامد کا ایسے شہر سے پیدائشی تعلق ہے جہاں کی خواتین تعلیم کے میدان میں بہت سے کمالات دکھا چکی ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہیں ہوگا کہ نواب سلطان جہاں بیگم کے بعد بھوپال میں اگر کوئی خاتون تعلیم و ادب کے لئے کوشاں ہے اور جو دہلی نوئڈا میں بھی سرگرم عمل رہیں تو وہ ڈاکٹر رضیہ حامد ہیں۔انہوں نے اپنے زیرِ نگرانی فکر و آگہی کے بڑے نمبر نکالے جس میں فکر و آگہی بشیر بدر نمبر ان کا خاص نمبر نکالنے کا پہلا قدم تھا اس کے بعد کئی اور نمبر مثلاً علی گڑھ نمبر، بھوپال نمبر، رفعت سروش نمبر، بیکل اتساہی نمبر، اوپیرا نمبر وغیرہ۔

غرضیکہ جب میں ڈاکٹر رضیہ حامد تک پہنچا، اس وقت شاستری نگر میرٹھ میں آگ لگی ہوئی تھی اور میں اپنے ان دوستوں کے گھر وقت گزار رہا تھا جو رضیہ حامد صاحبہ کی تنقیدی نظر کے بڑے مداح تھے۔ یہ پردہ نشینی کی حالت میں ملیں۔انہوں نے تو مجھے خوب جی بھر کے دیکھا ہوگا لیکن میں رضیہ صاحبہ کو نہیں دیکھ پایا تھا۔اس وقت وہ میرا نمبر نکالنے کا پروگرام بنا چکی تھیں اور کام کی ابتدا کر چکی تھیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے میری تمام بے ترتیبیوں کو جس ترتیب سے فکر و آگہی کا نمبر نکال کر یکجا کیا وہ اپنی جگہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور صرف انہیں کا کارنامہ ہے۔ کیوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے رسائل پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ یہ جانتی تھیں کہ نقوش لاہور، سویرا لاہور، ادبِ لطیف لاہور، فنون کراچی، شاعر بمبئی جیسے مستند پرچوں میں بشیر بدر کا کلام بہت اہمیت کے ساتھ چھپتا ہے۔ وہ محنت سے کبھی نہیں گھبرائیں غالباً آج بھی وہی ہمت اور استقلال ان میں موجود ہے۔ان کا یہ خاص نمبر ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں ڈپلیکیٹ چھپ کر خوب مقبولیت پا رہا ہے۔

یہ باتیں تقریباً پچیس تیس سال پرانی ہیں تب سے ان کے فکر و فن میں غیر معمولی پختگی اور تبدیلی ضرور آئی ہے اور انہوں نے ہندوستان کے کئی شاعروں، ادیبوں کو اردو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

بلاشبہ ڈاکٹر رضیہ حامد تنقید کی پوری تاریخ میں جو خواتین نقاد اب تک اللہ کی عطا ہیں ان میں زندہ جاوید رہیں گی۔ ان کے فکر و فن اور کارناموں کے ذکر کے بغیر تنقید کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہوگا۔اس میں دو رائے نہیں کہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے پائے کی نقاد خاتون ہندوستان سے لیکر پاکستان تک مجھے نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر رضیہ حامد سخن فہم تو ہیں ہی اس کے علاوہ اعلیٰ دماغ کے ساتھ ایک نرم و نازک پاکیزہ دل رکھتی ہیں۔انہوں نے صرف مجھی کو نہیں بلکہ اور ادبی دوستوں کو بھی اپنے فکر و فن سے سرفراز کیا۔اردو ادب میں عالمی شہرت حاصل کرنے میں جن لوگوں نے ان کے لئے ایثار کیا اس میں ان کے شوہر ڈاکٹر سید محمد حامد اور ان کے چاروں بچے عامر، عاصم، عاطف اور بیٹی صالحہ حامد ہیں۔ اللہ نے ڈاکٹر رضیہ حامد کو جس علمی قابلیت سے نوازا اس سے بڑھ کر ان کو انعام سعادت مند اور ہونہار بیٹوں کی شکل میں دیا۔ڈاکٹر رضیہ حامد اسلامی تہذیب کے دائرے میں رہتی ہیں۔انہوں نے پردہ نشینی اختیار کرتے ہوئے حیات و کائنات کے ہر لمحہ کو اور آنے والی تبدیلیوں کو نظر میں رکھا۔ رضیہ حامد روایتوں پر نظر رکھتے ہوئے جدیدیت پر بھی نظر رکھتی ہیں، اور جو لوگ جدید برائے جدید لکھتے ہیں ان کو وہ قبول نہیں کرتیں اور اس سلسلے میں ان کی نظر قابلِ تعریف ہے کہ وہ نئے خیالات اور پرانی روایات کے خوب صورت امتزاج کو بڑی خوبی سے پرکھتی ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے ایسے لکھنے پڑھنے والوں کو ادبی حلقوں میں نمایاں ہونے میں مدد کرتی ہیں جو ادبی سیاست کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کئی طلباء اور طالبات کو تعلیم کی طرف رغبت دلائی اور تعلیم حاصل کروانے میں ان کی بھرپور مدد کی۔ بلاشبہ ہندوستان اور پاکستان کے تنقید نگاروں میں ان کا اپنی کاوشوں سے پیدا کیا ہوا ایک منفرد مقام ہے۔

اللّٰھمّ زد فزد

☆☆☆

کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے لیکن رضیہ حامد کے بارے میں یہ کہاوت اس کے برعکس ہے۔آپ کی کامیابی کے پیچھے آپ کے شوہر نامدار جناب ڈاکٹر سید محمد حامد صاحب کا ہاتھ ہے۔آپ بحیثیت انجینئر بھیل (BHEL) میں اعلیٰ عہدے پر بھوپال میں فائز تھے۔ ۱۹۷۹ء میں آپ کا تبادلہ دہلی ہو جانے کے سبب پورا گھر نقل مکانی کر کے دہلی میں سکونت پذیر ہو گیا۔رضیہ حامد نے تشنگی علم و ادب کی تسکین کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔خوبئ قسمت سے اس وقت پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبہ اردو تھے۔دوسرے اساتذہ میں ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر شمیم حنفی، صغرا مہدی جیسی شخصیات تھیں جنہوں نے آپ کے ذوقِ علم و ادب کو مزید جلا بخشی۔ جامعہ کا ماحول بہت اچھا تھا سیمینار وغیرہ خوب ہوتے تھے جن میں ملک اور بیرون ملک کی بڑی شخصیات شریک ہوتی تھیں۔

(**کوثر صدیقی** کے مضمون ''**دُخترِ بھوپال ڈاکٹر رضیہ حامد کا بحیثیت صحافی ایک اجمالی جائزہ**'' سے اقتباس)

سلطانہ مہر (برمنگھم)

ڈاکٹر رضیہ حامد

یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرتِ آدم کی تخلیق کی اور اُسے قوتِ گویائی عطا کی اورعلومِ زندگی سے آراستہ کیا تو انھوں نے کونسی زبان بولی ہوگی؟

''عربی''؟ یہ سوالیہ نشان ہے اور میری سوچ کے مطابق حضرت آدمؑ نے کوئی بھی زبان بولی ہواُس نے ترقی کی اور پھر زبان نے بتدریج ارتقائی منازل طے کیں اور اپنے جغرافیائی ماحول کے مطابق زبان اس سانچے میں ڈھلتی چلی گئی جس میں اُسے ڈھالا گیا۔ یوں ایک زبان کی کئی شاخیں بنیں اور اپنے اپنے علاقوں کی زرخیزی لئے ہوئے کئی زبانیں وجود میں آ گئیں۔ ان کو وجود میں لانے والے انسان نے بھی ترقی کی کئی منزلیں سرکیں اور آج بھی کر رہا ہے۔ ہم سب ایک طرح سے''مقلدین'' میں سے ہیں اور ہمارے حصّے میں جو زبان''اردو'' آئی ہے ہم دامے درمے قدمے سخنے اس کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔

ہم ہی میں سے ایک محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد بھی ہیں۔ ایک خاتون ہونے کے ناطےان پرحصولِ علم کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ بچوں کی نگہداشت، شوہر کی خاطر داری اور جملہ گھریلو امور نمٹانے کا بار بھی تھا۔ اور الحمدللہ کہ انھوں نے یہ ساری ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان وادب کی آبیاری کے لئے بھی تن دہی سے کام کیا۔ اپنا جریدہ''فکر وآگہی'' پابندی سے شائع کیا اور اس کے کئی ضخیم نمبر بھی شائع کئے۔

میں نے جب بھی کسی رسالے میں ڈاکٹر رضیہ حامد کا کوئی مضمون پڑھا تو سوچا مجھے اس خاتون سے ملنا چاہئے۔ مگر نہ میں بھوپال جا سکی اور نہ وہ مجھ سے کراچی میں مل سکیں۔ پھر میرے امریکہ جانے کے بعد تو منزلیں اور بھی کٹھن ہوگئیں۔ مگر بالمشافہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود مجھے ان کے مضامین کی تلاش رہتی ان کی تحریر پڑھ کر مجھے گمان گزرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خاتون کو تخلیقی صلاحیتیں بڑی فیاضی کے ساتھ ودیعت کی ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک وجدانی کیفیت بھی ہے اور ذہن کو متحرک رکھنے والی قوت بھی۔ کچھ تخلیقات ایسی ہوتی ہیں کہ پہلے دن کے مطالعہ میں سب کچھ نہیں دیتیں، کچھ تخلیقات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ پہلی بار کے مطالعہ میں قاری ان سے

بڑی حد تک مستفید ہو جاتا ہے۔ لیکن چند تخلیقات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ہر مطالعہ میں قاری ان سے مستفید ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کی چند تصنیفات کا شمار بھی ایسی ہی تحریروں میں کیا جا سکتا ہے کہ ان کا مطالعہ جتنی بار کیا جائے فکر کے پرت ہر بار کھلتے چلے جائیں۔ ان کے سہ ماہی مجلّہ کا نام بھی''فکر وآگہی'' ہے۔ جو دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد یہ رسالہ گزشتہ اٹھارہ (۱۸) سال سے شائع کر رہی ہیں۔ انہوں نے ''فکر وآگہی'' کے تحت بھوپال نمبر، بیکل اتساہی نمبر، بشیر بدر نمبر، اوپرا نگاری (اردو) اور رفعت سروش نمبر' تالیف اور شائع کئے۔ علاوہ ان کے ڈاکٹر رضیہ حامد نے نواب صدیق حسن خان پر تحقیق کی۔ ان کی دوسری تحقیقات بعنوان'' محمد احمد سبزواری۔فن اور شخصیت''، ''بھوپال درپن (ہندی)'' اور ''معاون حج'' (اردو، ہندی) شائع ہو چکی ہیں۔

خود ڈاکٹر رضیہ حامد اور ان کے شریک حیات محترم ڈاکٹر سید محمد حامد میکینکل انجینئر ہونے کے ساتھ ہی عربی زبان میں ایم۔اے کی سند رکھتے ہیں۔ دونوں مل کر اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کے دن بھوپال (مدھیہ پردیش، ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ دورانِ تعلیم ان کی شادی ۸ مئی ۱۹۶۴ء کو سید محمد حامد، بی ایس سی انجینئرنگ (علیگ) سے ہوئی۔ ڈاکٹر رضیہ کے جدّ امجد ایران سے ہندوستان آئے تھے، دہلی اور بھوپال میں آباد ہوئے۔ رضیہ نسبی طور پر سادات میں سے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کے تین بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے___ سید محمد عامر، ڈاکٹر سید محمد عاصم اور سید محمد عاطف اور صالحہ شفیع۔ تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور برسرِ روزگار اور اچھے عہدوں پر بیرونِ ملک خدمات انجام دے رہے ہیں۔

میری ان سے ملاقات کی خواہش بھی پوری ہوگئی۔ ڈاکٹر رضیہ حامد مجھ سے ۱۹۹۹ء میں دہلی میں محترمہ انور نزہت کے گھر پر ملی تھیں۔ میرا قیام نزہت کے گھر پر تھا۔ ان دنوں میں پی. ایچ. ڈی. کرنے کے شوق میں گرفتار تھی۔ ڈاکٹر تنویر علوی صاحب کا مشورہ تھا کہ دہلی جاؤں اور دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں۔ محترمہ رضیہ حامد نے بھی مشورہ دیا کہ میں پکا ارادہ کر لوں تو کوئی کام مشکل نہیں ہوگا۔ مگر جب میں لوٹ کر لاس اینجلس پہنچی تو میری بی اے اور ایم اے (صحافت) کی اسناد غائب ہو چکی تھیں اور جیسا میرا اندازہ ہے میرے کسی اپنے نے ہی کسی کو کنیڈا کی شہریت دلانے کے لئے انہیں'فروخت' کر دی تھیں۔ پروفیسر سحر انصاری نے مشورہ دیا تھا کہ میں جامعہ کراچی میں درخواست دے کر اور فیس جمع کرا کے ان کی کاپی حاصل کر سکتی ہوں۔ سو میں نے ارادہ تو باندھا تھا لیکن کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ پی ایچ ڈی کرنے کی خواہش ترک کر دی۔

ذکر تھا ڈاکٹر رضیہ حامد کا، مدھم لہجے میں گفتگو کرنے والی خاتون کا، جو مجھے بتا رہی تھیں کہ وہ ماضی

میں بھی اور آج بھی اُسی توانائی سے خانہ داری کی جملہ ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق مطالعہ کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور مسلسل علمی کاموں میں مصروف رہتی ہیں اور اب بھی روزانہ چار پانچ گھنٹے مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد افسانے بھی لکھتی ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''لمحوں کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ملاقات کے دوران ان سے میں نے ادب کے حوالے سے کچھ سوالات کئے میں نے اُن سے اُن کے پسندیدہ ادیبوں کے نام پوچھے جن کی تحریروں نے ان کے دل میں جگہ پائی۔ڈاکٹر رضیہ کہنے لگیں'' جن ادیبوں کو زمانہ یاد رکھے گا ان کی فہرست کافی طویل ہے۔مگر چند نام یہ ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری، عبد الرحمٰن بجنوری، سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی نعمانی، سر سیّد احمد خان (اگرچہ ان کے کارنامے انیسویں صدی سے سامنے آئے)، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ''۔

میرا اگلا سوال تھا، فکشن کو'جدیدیت' نے نکھارا سنوارا یا مجروح کیا؟ رضیہ کا جواب تھا،''بے شک فکشن لکھنا ایک آرٹ ہے۔اور اردو میں فکشن نگاروں کی کمی نہیں۔ پریم چند سے لے کر کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی تک ایک کہکشاں ہے۔ان کے بعد قرۃ العین حیدر نے فکشن میں اپنا لوہا منوایا ہے لیکن میرے نزدیک ان پر جدیدیت کی کوئی چھاپ نہیں ہے۔اس رجحان یا تحریک سے متاثر ہونے والے فکشن نگاروں میں نئی نسل کی جو فہرست سامنے آتی ہے ان کا کوئی کارنامہ ہنوز قابل قدر نہیں ہے جس سے وہ اپنے پیش رووں پر سبقت لے گئے ہوں''۔

اردو میں ناول نگاری کے تنزّل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا''اس صدی میں زندگی کی رفتار نسبتاً تیز ہے اور آدمی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ طویل ناولوں کا مطالعہ کر سکے۔اس کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا نے عوام الناس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے۔دوسری طرف آج کا ادیب معاشی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بحرانِ زندگی کے جدید طریقوں اور میکینزم (Mechanis ساخت و فنی پہلو) کی وجہ سے ان حالات کے دباؤ کا شکار ہے۔اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے کسی نئے نظامِ فکر کی تلاش فضول ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ہمارے کلاسیکل نظام میں اس کی جگہ موجود ہے۔روحانی بحران کا سب سے معتبر علاج مذہبی اقدار کو بروئے کار لانے میں ہے۔روحانی بحران دور ہوگا تو ذہنی آسودگی خود بخود میسّر آئے گی''۔

سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا،''معیاری ادب کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے اور زندگی کے گوناگوں مسائل کو حل کرنے میں کس حد تک مثبت رول ادا کرتا ہے۔

برِّصغیر سے باہر جو ادیب رہتے ہیں ان میں سے بیشتر کا پیشہ برصغیر کے ادیبوں کی طرح ادبی کاموں سے جڑا ہوا نہیں ہے۔شاعری کی نسبت نثر نگاری زیادہ توجہ اور وقت چاہتی ہے۔میں یہ نہیں کہتی کہ غیر ممالک

میں موضوعات کی کمی ہے۔

اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں سے لفظ اخذ کرتی ہے لیکن اس سلسلے میں توازن کی ضرورت ہے جس سے زبان کا بنیادی مزاج مجروح نہ ہو۔غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ کو اردو میں داخل کرنا اردو کی خدمت نہیں ہے۔اب رہی نئے علوم کی بات، تو علوم کی معلومات کے ساتھ انگریزی الفاظ خود بخود اردو میں داخل ہو رہے ہیں اور یہ مستحسن بات ہے۔میرا خیال ہے ایسی کوئی شعوری کاوش نہیں کی جائے جس سے انگریزی الفاظ کا اردو میں داخلہ ممنوع ہو۔مگر بات صرف توازن کی ہے''۔

اردو کے فروغ کے حوالے سے ہم باتیں کر رہے تھے۔ڈاکٹر رضیہ حامد نے بتایا،''ہندوستان میں اردو کی فروغ کے لئے بہت سی اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں۔'قومی کونسل برائے فروغ اردو' کلاسیکی کتابوں کو چھاپ کر کم قیمت پر فروخت کرتی ہے تاکہ مطالعہ کا رجحان بڑھے۔اردو میں کمپیوٹر کلاسیں شروع کی گئی ہیں۔ عموماً گورنمنٹ اسکولوں میں نہیں مگر چند اسکولوں میں''تیسری زبان'' کے طور پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔اب یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ اگر وہ اردو سے محبت کرتے ہیں تو اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں لکھائیں، اور جہاں تک رسم الخط کا سوال ہے جو اردو نہیں پڑھ رہے ہیں وہ یا تو رومن یا دیوناگری میں پڑھیں گے۔دیکھئے قرآن کے ترجمے دیوناگری رسم الخط میں آ رہے ہیں۔ ہندی ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لئے اس میں چھپی کتابیں خوب بکتی ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر ادیبوں کی کتابیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں ترجمہ ہوتی ہیں یا دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوتی ہیں۔ یہ ہی دیکھئے کہ بھوپال اردو کا مسکن رہا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بھوپال میں اردو کے لئے کام نہیں ہو رہا ہے۔عثمانیہ یونیورسٹی کے تراجم اب عصری تقاضوں پر پورے نہیں اُترتے۔اب اردو میں نئے سرے سے کون کام کرے گا؟ مہاراشٹر، اُتر پردیش، گجرات، بنگال تک اردو میڈیم کے اسکول ہیں تو لیکن مستقبل میں اردو کہاں تک باقی رہے گی کچھ کہا نہیں جا سکتا''۔

۱۸رمئی ۲۰۰۳ء کے دن ڈاکٹر رضیہ حامد اور ڈاکٹر محمد حامد کے لئے کراچی کے ایک معروف جریدے''طلوعِ افکار'' کے مُدیر محترم حسین انجم نے ایک محفل سجائی جس کی صدارت کے فرائض سید علی اکبر رضوی نے انجام دیئے۔دیگر شرکائے محفل میں ڈاکٹر حسین جعفر سردار زیدی، ڈاکٹر شکیل نواز رضا، احمد زین الدین (مدیر'روشنائی') حیدر امام، ڈاکٹر حسین جعفر، فرحت علی، مصطفیٰ جمال، نور محمد شیخ، اور حسنہ زیدی شامل تھے۔اس موقع پر سوالوں کے جواب میں ڈاکٹر رضیہ حامد نے اردو کے فروغ کے حوالے سے کہا''بے شک اردو میں تنقید کی کمی ہے۔ بیشتر نقاد اپنے ذہن میں کچھ اصول رکھ کر اس کسوٹی پر ادب کو پرکھتے ہیں۔جب کہ ہونا چاہئے کہ ہر تخلیق کو پڑھنے کے بعد اس کے حسن و قبح کا جائزہ لیا جائے اور تنقید کے سوتے تخلیق سے پھوٹیں۔

میکانکی تنقید سے اردو کو نقصان ہو رہا ہے۔اس کی وجہ سے نئے تخلیق کار تنقید سے بے زار نظر آتے ہیں۔اردو میں یہ کام تسلی بخش نہیں ہو رہا ہے اور ترجمہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جارہی ہے۔ یہ زبان کے لئے مضر ہے۔ علاقائی زبانوں کا ترجمہ تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کیوں کہ اس سے اپنے ہی ملک کے ادب اور سماج کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں اور ملک میں ادبی ہم آہنگی کی فضا قائم ہو سکتی ہے''۔

میرے لئے یہ مقام باعثِ فخر وانبساط ہے کہ ایک لجنڈ ادیب وشاعر جناب رفعت سروش اردو ادب کی ایک معتبر خاتون کی ادبی خدمات پر ایک کتاب بعنوان ''نذرِ رضیہ حامد'' مرتب کر رہے ہیں۔اردو ادب میں اب تک تو ایسا خوشگوار ''حادثہ'' اور ''واقعہ'' رونما نہیں ہوا کہ کوئی مرد ادیب اپنی ہم عصر خاتون کو اس کی زندگی میں خراجِ تحسین پیش کرے۔ یہ روایت بھی رفعت سروش قائم کر رہے ہیں۔ان کا یہ ارادہ ہی باعثِ فخر و تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حوصلے بلند رکھے اور وہ یہ کام کر گزریں کہ یہ آسان کام نہیں۔ کیونکہ میں اس راہِ پُر آفات سے کئی بار گزری ہوں۔ میں نے میرے عہد میں موجودہ شعرأ،شاعرات ونثر نگاروں کے آٹھ تذکرے لکھے ہیں۔ایک سوالنامہ بنا کر ان کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بہت سوں نے میرے ساتھ بے حد تعاون کیا اور چند نے گریز کیا۔لیکن وہ آٹھ تذکرے میں نے شائع کئے کہ اب وہ حوالے کے کام آتے ہیں۔ جناب رفعت سروش کا یہ کام بھی ''حوالے'' کا کام ہے اور دیگر ادیبوں کے لئے مشعلِ راہ بھی کہ وہ آگے بڑھ کر ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔میں محترمہ رضیہ حامد کو مبارکباد دینا چاہتی ہوں کہ ان کے پچاس مضامین اور بائیس جریدوں وکتب پر کیا ہوا کام اردو ادب کے قارئین کے لئے ایک بیش قیمت ورثہ ہے۔جو ڈاکٹر رضیہ حامد کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رکھے گا۔

☆☆☆

''فکر و آگہی'' کے بھوپال نمبر کو پڑھ کر رضیہ بہن کے گاگر میں ساگر بھرنے کے فن پر اظہار رائے کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ ''رضیہ حامد اگر فکر و آگہی کی مدیرہ نہ ہوتیں تو شاید کسی عظیم الجثہ جہاز پر امیر البحر ہوتیں''۔اب ان کا یہ علی گڑھ نمبر دیکھ کر میں امیر البحر بلکہ کسی بحرِ ذخار میں جانے والے مشّاق غوطہ زنوں کے لشکرِ جرّار کا سربراہ تک بنائے جانے کے لئے ان کی مکمّل صلاحیت کا مزید چشم دید گواہ بن چکا ہوں۔ان کے اس نا قابلِ فراموش کارنامے کے لئے پوری علی گڑھ برادری کی طرف سے میں انہیں ہدیہ تہنیت، اب جب کہ وہ دہلی سے ہجرت کے لئے پابہ رکاب ہیں، دہلی کے مقابلے میں بھوپال میں ان کے فعّال تر مستقبل کے لئے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

(پروفیسر ڈاکٹر طاہر محمود کے مضمون ''بھوپال کی ایک ادبی نگینہ ساز خاتون: ڈاکٹر رضیہ حامد'' سے اقتباس)

رشید انجم (بھوپال)

ادب اور صحافت کی جاوداں نقیب۔ڈاکٹر رضیہ حامد

آپ نے دیکھا ہوگا، آبادیات سے نزدیک ساحل سمندر پر درخت اگا دئے جاتے ہیں۔ یہ درخت نہ تو پھل دار ہوتے ہیں اور نہ ان کی ٹہنیوں پر خوشنما پھول کھلتے ہیں۔ان درختوں کو (Mangrove) مین گرو کہتے ہیں۔ان کی خاصیت ہوتی ہے، سمندر کی نمکینیت کو اپنے اندر جذب کر لینا اور زمین کی اندرونی زرخیزیت کو نمکیات سے محفوظ رکھنا۔

خلّاقِ کائنات نے ہر انسان کو اس کا شخصی تناظر بھی دیا ہے۔ یہ شخصی تناظر دیکھیں تو محدود مگر اس کی وسعت لامحدود بالکل سمندر کی مانند۔ جو انسان اجتماع شعور کے باز آفرین مقاصد سے سرفراز ہوتے ہیں، وہ زمانے کی گرم اور حابس شوریدگی سے خود کو محفوظ رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ ہنر بالکل اسی مین گریو درخت کی مانند ہوتا ہے جو اس کے شخصی تناظر کے گرد ایک حصار قائم رکھتا ہے تا کہ اس حصار میں رہ کر وہ تخیلات، افکار اور تخلیقی صلاحیتوں کی اس وقت تک پرورش کرے جب تک زمانہ اس کی ذات کی طلسماتی قوت کو قبول نہ کرے اور جب زمانہ اس کے اوصاف کی تصدیق کر دیتا ہے تو گرم اور حابس شوریدگی اپنا اثر کھو دیتی ہے اور اس کی زرخیزیت کو پھلنے پھولنے کے لئے شفاف ہوائیں میسر آجاتی ہیں۔رضیہ حامد کی شخصیت بھی اسی شفاف تحریر سے عبارت ہے۔

ریاست بھوپال کی تاریخ سے جو شخص بھی واقف ہے وہ بھلا سید فتح علی صاحب کے خاندانی اوصاف سے ناواقف کیسے رہ سکتا ہے۔سید فتح علی صاحب مرحوم کے یہاں یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو جس بچی نے جنم لیا اس کی پیشانی سے آئندہ زمانوں میں نئی سحر کا نور بیدار تھا۔اسی مناسبت سے اس بچی کا نام سیدہ رضیہ سلطان فتح علی رکھا گیا اور ہر گزرتے وقت نے ثابت کر دیا کہ اس خاتون نے سلطانہ رضیہ کی طرح زمینیں تو قابو نہیں کیں، ہاں علمی، ادبی اور صحافتی علاقوں کو ضرور فتح کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برٹش استبداد اپنے سانحۂ ارتحال پر نوحہ

خوانی کی تیاریوں میں مصروف ہو چکا تھا۔ تاریخ زمین کو اس کی گل پوشی سے محروم کر کے لہو رنگ ہونے کا مژدہ سنا رہی تھی۔ ملک تحریکِ آزادی کا پرچم اٹھائے تقسیمِ ملک کی سمت گامزن تھا۔ اور انسانِ عدم تشدد کے پرچم تلے خونی داستان کو رقم کرنے کے لئے اپنے ناخنوں کو تیز کر رہا تھا۔ اس کی شر خیز سرشت اس کی ازلی طلب کی پیاس سے تشنہ بہ لب فضا قہر ساماں کر چکی تھی۔ قسّامِ ازل ریاست بھوپال کے وجود پر اختتامیہ مُہر ثبت کر چکا تھا۔ ان کرب خیز ساعتوں میں سیدہ رضیہ کی پرورش ہوئی۔ محلوں کی آسائش ضرور حاصل رہی مگر خاندان کی وجاہتی روایت ان کی زندگی کا مصورانہ شاہکار بنی۔ ملک آزاد ہوا۔ شادیانوں نے آدمی کی نوحہ گر آواز بھی سنی لیکن بھوپال ریاست تمام آلام سے محفوظ رہی اور پھر بالآخر انضمام نے ہر راحت کو کلفت میں تبدیل کر دیا۔

ان تمام آفات میں سیدہ رضیہ سلطان کا بچپن معصومیت کی منزلیں طے کرتا رہا۔ آزاد ہندوستان نے ریاستوں کی خودمختاری سلب کر لی۔ تمام ریاستوں کا وجود بہ یک قلم جنبش ختم ہو گیا لیکن ہاتھی معذور ہو کر بھی ہاتھی ہی رہتا ہے۔ سید فتح علی صاحب نے اپنی اولادوں کو ان آفات سے محفوظ رکھا۔ سیدہ رضیہ سلطان تعلیم کے مدارج طے کرتی گئیں۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے گریجویشن کیا۔ ۱۹۷۲ء میں عربی میں ایم۔ اے اور ۱۹۸۲ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں۔ اور ڈاکٹریٹ کا ادبی اعزاز انہیں حاصل ہو گیا۔ ۱۹۸۳ء میں انہوں نے اردو لٹریچر میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور ادب عالیہ کی اُس صف میں شامل ہو گئیں جس صف نے انہیں نسائیت (Feminism) کے ساتھ فنی آہنگ (Artistic Rythm) کے منصب پر فائز کر دیا۔

۱۹۶۴ء میں ان کی شادی سید محمد حامد صاحب سے ہو گئی۔ رشتوں کے توسط سے دو اعلیٰ خاندان ایک دوسرے کے نزدیک آئے تو سیدہ رضیہ سلطان، رضیہ حامد میں ضم گئیں۔

رضیہ حامد ایک باصفات خاتون ہیں۔ سادہ دل، سادہ مزاج، اور سادہ لباس۔ تصنع کا کوئی دخل نہیں۔ نہ رکھ رکھاؤ میں نہ گھریلو روش میں۔ طہارتِ نفس کا عمل جس زندگی میں ہو وہ زندگی مغلوب نہیں ہوتی۔ اس کی صفات کے دائرے شخصی جمال سے خوشبوؤں کے جزیرے آباد کرتے ہیں۔ گھر اور گھر سے باہر جب آدمی ایک جیسی شے کو اپنی جہد کی تحریک بناتا ہے تو اس کی سفیرِ جہات میں فاصلوں کی کدورت رکاب کی پابند نہیں بنتی۔ نہ اس کی رفتار میں لغزش کا امکان آتا ہے، نہ سوچ متزلزل ہوتی ہے۔ نہ وہ اپنے بدن پر دھوپ کی تمازت کا بار محسوس کرتا ہے اور نہ روح اضطراب کا شکار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس کا مزاج ایک مرکز پر مذکور رہ کر اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ وہ زندگی برائے زندگی یا زندگی برائے بندگی کا خوگر نہیں ہوتا بلکہ اس کے نزدیک زندگی برائے عمل، زندگی برائے جہدِ مسلسل اور زندگی برائے تعمیرِ کردار ہوتی ہے۔ وہ دنیا زادنہ بن کر دنیا آشنا بنتا ہے۔ آفاق شناس رہ کائنات کی رفقوں پر اپنا عکس تحریر کرتا ہے۔ ایسے لوگ کائنات کی بساط پر اپنے مہرے خود

سجاتے ہیں اور وہ مہرے ہوتے ہیں اس کے ثمر آور خواب، اس کی ذات کی لذت اور ان کے شباہتی رشتے ایسے لوگ بہت میانہ روی سے اپنی ثابت قدمی کو واضح کرتے ہیں اور پھر آٹھہرتے ہیں اس مرتبہ پر جہاں خود شناسی ان کی صداقت کی ضامن بنتی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد ایسی ہی خاتون ہیں۔ وہ مکمل طور پر خاتونِ خانہ ہیں لیکن جب محفلوں میں آتی ہیں تو ان کی آنکھوں میں صحیفوں کی تجلی روشن رہتی ہے اور ان کا سراپا حرفِ تقدیس کی نظارگی سے مہکتا ہے۔ یہ کردار کا وہ وصف ہے جو صرف مشرقی عورت کی ذات سے وابستہ رہا ہے اور رضیہ حامد ایسی ہی خاتون ہیں جن کا ظاہر باطن اور باطن ظاہر ہے۔ وہ جب بھی کسی محفل میں شرکت کرتی ہیں تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ابھی ابھی حامد صاحب کو کھانا کھلا کے اور دستر خوان سمیٹ کر آ رہی ہیں۔ بیچارے بیوٹی پارلر تاکتے ہی رہ جاتے ہیں اور وہ مصلیٰ نما دوپٹے میں چہرہ لپیٹے اپنی کار میں ہر بیوٹی پارلر کو حسرت زدہ چھوڑ کر زن سے گزر جاتی ہیں۔

رضیہ حامد کو میں نے اس وقت جانا جب وہ ''فکر و آگہی'' کا بھوپال نمبر شائع کرنے جا رہی تھیں جرنلزم کی ڈگر بڑی ہی دشوار گزار اور صبر آزما ہوتی ہے۔ صحافی کو قدم قدم پر بندشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بے صدا مراحل اس کی راہ میں حائل رہتے ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ رضیہ حامد کے چہرے پر فکر کی کوئی ہلکی سی لکیر بھی نہیں ابھری۔ ان کا چہرہ ان کی روشن اور صحت مند آنکھوں کی طرح ہر وقت مسکراتا رہا۔ جو پاکیزگی کا پرتو میں رضیہ حامد کے سراپے میں دیکھا وہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملتے وقت جہاں لطفِ گفتگو کا احساس دل میں جاگزیں ہوتا ہے وہیں ان کی تصنع سے پاک شخصیت کا احترام بھی آنکھیں قبول کرتی ہیں۔ میں انہیں جیک لنڈن سے تشبیہ دیتا ہوں۔ جیک لنڈن کی طرح ہی انہوں نے ادب کو صحافت سے جوڑنے میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر دیا۔ جس طرح جیک لنڈن نے Journalism اور Literature کی درمیانی سرحدی پابندی کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ رضیہ حامد نے اردو ادب کا صحافت سے رشتہ جوڑ کر جیک لنڈن کی انقلابی رفتار کو مقصدیت اور معنویت دی ہے۔ وہ بہترین صحافی ہیں یہ تو ثابت ہو ہی چکا ہے۔ ان کے مضامین میں بھی ان کے فکری احساس کی جھلک ملتی ہے۔

تنقیدی، تحقیقی اور تبصراتی مضامین سے ان کے لکھنے کی ابتداء ہوئی۔ یہ مضامین ملک کے بیشتر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے دہلی سے سہ ماہی ''فکر و آگہی'' جیسے خالص ادبی میگزین کا اجراء کیا جو دراصل بھوپال کو مستقر رکھ کر شائع ہوتا رہا۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف بھوپال بلکہ مدھیہ پردیش کی پہلی خاتون مدیر ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ ۱۹۸۲ء سے ۲۰۰۵ء تک ''بشیر بدر نمبر'' رفعت سروش نمبر''، اوپیرا نمبر، بکل اتساہی نمبر، بھوپال نمبر، علیگڑھ نمبر، محمد احمد سبزواری نمبر اور ارمغانِ اختر سعید خاں، جیسے ضخیم علمی اور معلوماتی نمبر سہ ماہی ''فکر و آگہی'' کے شائع کرنے میں رضیہ حامد نے اپنی تمام تخلیقی اور صحافتی

صلاحیتوں سے کام لیا۔سید محمد حامد صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی ان کو حاصل رہی ہے اور اسی رہنمائی میں ان کا پبلیشنگ ادارہ باب العلم ایک نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔ سہ ماہی فکر و آگہی کے ان نمبرات کی اشاعت کے علاوہ ان کی کئی کتابیں بھی منظرِ عام پر آ کے دادِ وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔ نثر میں ہی انہوں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔نثر کی بیشتر اصناف کے خطوط کو ابھارنے،سنوارنے اور معنویت دینے میں ہی انہوں نے اپنی قوتوں کو صرف کیا (مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے شاعری میں خود کو آزمانے کی کوشش نہیں کی)۔ ان سے ہٹ کر وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے اکّیس افسانوں کا مجموعہ ''لمحوں کا سفر'' اردو اکادمی مدھیہ پردیش نے ۱۹۸۲ء میں ایک پبلیشنگ پروگرام کے تحت شائع کیا تھا۔ یہ ان کے مختصر افسانوں کا انتخاب ہے۔

''دیدار کی پیاس، اندھیرے اجالے، نشانت، عاشی، بند پلکوں کے خواب کھلی آنکھوں کا غم، طوفان سے ساحل تک، ایں قصۂ پارینہ را، یہ قربتیں یہ فاصلے، ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی، خواب حقیقت، سوزشِ پنہاں، خالی خالی دامن، موجِ تلاطم، اضطرابِ پیہم، لمحوں کا سفر، صدا بصحرا، آتشِ خاموش، فردوسِ گم گشتہ، لمحوں کی صلیب، تشنہ تشنہ، اور مٹی کا سفر۔

چونکہ رضیہ حامد کی شخصی وجاہت ان کی Personality کا وہ حصہ ہے جو ان کی ذات کو Dignity (شانِ عظمت) دیتا ہے۔ یہی ان کے تشخص کی انفرادیت بھی ہے یہ حقیقت ہے کہ جاذب نگاہ چہرے، کشادہ پیشانی اور نرم روشن آنکھیں بہترین اور مہربان انسان ہونے کی علامت ہوتی ہیں۔ قدرت نے رضیہ حامد کو ان تمام زیوروں سے آراستہ کیا ہے۔ اسی لئے ان کے افسانے بھی متوازن ہیں۔ ان کی کہانیوں میں Vision ہے۔ تناسب ہے اور نسائی معیار ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا جو Structure کھڑا کرتی ہیں اس کی دیواریں سیدھی اور سپاٹ ہوتی ہیں تا کہ ان دیواروں (کہانی کا پلاٹ) پر جب لفظوں کا روغن چڑھایا جائے، جملوں کی مینا کاری کی جائے تو کوئی داغ نہ چھوڑ سکے۔ اس میں ہلکی ہلکی چمک ہو جو آنکھوں کو خیرہ نہ کر سکے۔ انہیں نرم حریری بصارت کی ٹھنڈک سے آشنا کر دے۔

رضیہ حامد کی کہانیاں روایتی کہانیاں ہیں۔ زندگی سے فرار کی کہانیاں ہیں۔ ان کے کردار حالات سے بزد آزما نہیں ہوتے ان سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ داخلی تحریکات کی شدّت کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن جوش و خروش انہیں بغاوت پر نہیں اکساتا۔ حالات سے سمجھوتہ اٹھتے ہوئے طوفان کو ساحل تک پہونچنے سے پہلے ہی رخ بدلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں سوچ کا کیفی جذبہ ضرور ہے مگر وہ فکری سر جوش سے خود کو بچا کر لے جاتی ہیں۔ ساری کہانیوں کا فارم ایک ہی ہے۔ سیدھی سادھی تحریر (بالکل ان کی شخصیت کی طرح سے) کوئی پیچیدگی نہیں۔ رومانی، مسائل اور سماجی ناانصافیاں کبھی ترازو کا پلڑا جھکاتی ہیں اور کبھی Balance میں لے

آتی ہیں۔ کردار اور ان کے آس پاس سانس لیتا بوجھل سا ماحول جس میں ربط تو ہے مگر تیز ترین لمحات میں بھی سکوت، سراغِ زیست پانے سے منکر نظر آتا ہے۔ متوسط اور متمول طبقات کی باہمی کشمکش ہے مگر اعتدال کے ساتھ لہجہ مانوس ہے مگر Loud thinking سے گریزاں۔ ان سب کے باوجود رضیہ حامد اپنے افسانوں میں پوری طرح منعکس ہوتی ہیں۔ وہ نپے تلے زاویوں سے مسائل کو حل کرتی ہیں، شبیہ کو پہچان دے کر محسوسات کی کائنات کو تخلیقی لہجہ اور فن کو اسلوبی ہیئت دیتی ہیں اور یہ ایک کہانی کار کی وہ خوبی ہے پڑھنے والا افسانہ نگار کو ہر سطر میں محسوس کر لے۔ اسے تصنع کا گمان نہ ہو۔ قاری اور قلم کار کے مابین جب یہ رشتہ قائم ہو جائے تو سمجھئے اس نے اپنی محنت کا صلہ پا لیا۔ پھر اسے کسی دانشور، کسی مکتبۂ فکر اور کسی اکادمی سے تمغہ پانے کی کیا حاجت؟ رضیہ حامد اپنی کہانیوں کے توسط سے قاری کو اپنا دوست بنانے کے ہنر سے بخوبی واقف رہی ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کئی ادبی اور تعلیمی اداروں کی رکن بھی ہیں۔ ۱۹۸۴ء سے ۲۰۰۶ء کے درمیانی سالوں میں انہیں ملک گیر اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ وہ حج کی سعادت سے بھی سرفراز ہوئی ہیں۔
(اس طرح وثوق سے کہا جا سکتا ہے، وہ اردو علم و ادب کے نزدیک ہی نہیں، اللہ کی قربت بھی حاصل کر چکی ہیں) انہوں نے انگلینڈ، سعودی عرب، پاکستان اور متحدہ عرب امارات کے بھی سفر کئے ہیں۔

ان کی چار بہنیں ڈاکٹر رابعہ سلطان، ڈاکٹر راحت بدر، ڈاکٹر رفعت سلطان، ڈاکٹر عطیہ سلطان اور بھائی ڈاکٹر سید افتخار علی ہیں۔ یہ سب ان کے والدین کی بہترین تربیت اور دعاؤں کا ثمر ہیں۔

ان کے تین بیٹے سید محمد عامر، ڈاکٹر سید محمد عاصم، اور سید محمد عاطف ہیں جو مختلف ممالک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

وہ شخص بے حد خوش نصیب ہوتا ہے جس کی دنیاوی رفتار میں یکسانیت ہو۔ جس کی داخلی زندگی کو خارجی معاملات کی توثیق حاصل ہو اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر رضیہ حامد ایسی ہی خوش نصیب خاتون ہیں۔

☆☆☆

پاکستان کی ایک علمی و ادبی شخصیت محمد احمد سبزواری صاحب ہیں۔ ان کے بارے میں اہلِ پاکستان کو انڈیا کے رستے سے معلومات ملی ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے ان کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ عوام کی سطح پر انڈو پاک کے رشتے بہت گہرے ہیں اور دونوں طرف سے یا کسی ایک طرف سے سیاست کرنے کے نتیجہ میں محبت کے ان رشتوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔ اس کتاب سمیت **ڈاکٹر رضیہ حامد اپنی بے لوث ادبی خدمات کے حوالے سے ہمیشہ ایک اہمیت کی حامل رہیں گی۔**
(اقتباس از ''محمد احمد سبزواری۔فن و شخصیت۔ایک جائزہ'' تحریر: **حیدر قریشی**)

پروفیسر اظہار الحسن (علیگڑھ)

لمحوں کا سفر۔۔۔ایک نظر میں

ڈاکٹر رضیہ حامد کا افسانوی مجموعہ ''لمحوں کا سفر'' پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ لمحوں کا سفر صدیوں کے سفر پر مسلط ہے اور ایک سچے انسان کی اقدار کو قدم بہ قدم آگے بڑھاتا ہوا گامزن ہے۔ انسانیت، ایثار و قربانی ملنساری، رواداری، روایت پرستی اور انسان دوستی کا پیغام دیتا ہوا، منزل بہ منزل ٹھہرتا ہوا، کہانیوں کا یہ کاررواں ایک ابدی سکون کی تلاش میں رواں دواں ہے۔ آیئے ہم بھی اس کے دشوار گذار راستوں اور پر خار پگڈنڈیوں سے برہنہ پا گذر کر دیکھیں۔ شعری مجموعوں میں شعراء کرام حمد و نعت سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں مگر ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنا نثری سفر بھی حمد سے شروع کیا ہے اور اسی خوبصورت پیرائے میں افسانوی انداز میں حمد کہہ کر افسانوی مجموعہ میں اضافہ کیا ہے۔ آخری پیراگراف پڑھ کر قاری کا دل اپنے رب کے سامنے جھک جاتا ہے اور ''دیدار کی پیاس'' اس کے دل کو تڑپانے لگتی ہے۔

مصنف کی ذات کا پرتو کسی نہ کسی شکل میں، اس کی تحریروں میں اپنی جھلکیاں چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ لکھتے وقت مصنف اپنی ذات کو چاہے ہزاروں کلومیٹر دور رکھے مگر اس کی پرچھائیاں، دبے پاؤں، چپکے چپکے، انجانے طور پر اسی طرح شامل ہو جاتی ہیں کہ خود اس کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی مصنف کی عادات و اطوار، جذبات و خیالات کے بارے میں معلومات کرنا چاہیں تو ہم اس کی تحریریں پڑھیں اور ان تحریروں کی سیڑھیوں کے ذریعہ اسی کے خیالات و جذبات کی بلند و بالا یا پست عمارت تک پہنچنے میں مدد لے سکتے ہیں۔

'لمحوں کا سفر' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنے قلم کے ذریعہ ان احساسات و جذبات کو زبان دی ہے جو بے زبان تھے ان دیوی دیوتاؤں پر آرزوؤں اور تمناؤں کی بلی چڑھائی ہے جو انسانیت کے خون کے پیاسے تھے۔

'نشانت' ایک ایسے ہی جہیز اور دولت کے لالچی دیوتا کی کہانی ہے جو اپنے پیار و محبت اور وعدوں کو جہیز کی قبر میں دفن کر دیتا ہے اور اپنی محبوبہ جو بعد میں بیوی بن کر اسی کی چھتر چھایا میں آجاتی ہے اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور محبت کے عوض جہیز کی فرمائش کرنے لگتا ہے بالآخر یہ محبت و ایثار کی دیوی خوشی کے ساتھ،

اپنے محبوب نما پتی کو دعاؤں کے ساتھ چھوڑ کر خودکشی کر لیتی ہے۔

عائشہ بھی ایک ایسی ہی بیوی پرست شوہر کی کہانی ہے۔ جو اپنے سہاگ سے زیادہ دولت کو ترجیح دیتی ہے اور اپنے تین بچوں کے باپ اور شوہر کو دیارِ غیر میں صرف اس لئے ڈھکیل دیتی ہے کہ ہر ماہ ایک کثیر رقم اس کے بینک بیلنس میں اضافہ کرتی رہے گی۔ اور شوہر بے چارہ عائشہ عائشہ کہتا ہوا اپنی جوانی کے پھول جدائی کے جنگل میں مرجھا کر اپنے جذبہ محبت کو تسکین دیتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کی کہانی کا ہیرو یا ہیروئن دونوں ہی مایوسی، لاچاری، اور بے بسی کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اندھیرے، اجالے، بند پلکوں کے خواب، کھلی آنکھوں کے غم، طوفان سے ساحل تک، ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی خواب خواب حقیقت۔ بیانیہ اسلوب کے یہ تمام افسانے محرومیوں، ناکامیوں، مایوسیوں اور انسانی لاچاریوں کے گرد گھومتے ہیں اور ان کہانیوں کے ہیرو اپنے جذبہ قربانی اور ایثار کی صلیبوں پر بہت مطمئن نظر آتے ہیں۔ روایت سے بغاوت ان کا شیوہ نہیں ہے بس۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے'' والی بات ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کا قلم بغاوت، شجاعت اور بہادری کا علم کیوں بلند نہیں کرتا۔ احتجاج کا پرچم کیوں نہیں لہراتا۔ اپنے جائز حقوق کے لئے وہ جدوجہد نہیں کرتا۔ ہر ظلم کی کڑواہٹ کیوں بخوشی منظور کر لیتا ہے۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اور شکست کھا کر کیوں مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سوچ کر کیوں اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ ''ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی'' ان سوالات کے جواب پانے کے لئے ہمیں ڈاکٹر رضیہ حامد کے کچھ اور شہر گھومنے ہوں گے آیئے آگے بڑھتے ہیں۔

سورشِ پنہاں، جی ہاں دوسرا مہکتا اور مرجھاتا ہوا عنوان۔۔ ساس اور بہو کا روزِ ازل سے چلا آیا تنازعہ۔ یہاں بھی بے بسی اور لاچاری دامن گیر ہے۔ تعلیم یافتہ بہو، کہانی کار عورت، اور فنکار ہو تو ساس کے ذہن میں شبہات اور خدشات کے جراثیم رینگنے لگتے ہیں۔ وہ کہنے لگتی ہے۔ ''بہت چوٹ کھائی معلوم ہوتی ہے بیٹا کہیں تیرا گھر نہ بگڑ جائے'' ادھر لڑکیوں کا یہ بیان:

''ہم لڑکیاں جب اپنا آپ مٹا کر شوہر اور اس کے گھر والوں کی خدمت اور محبت کرتے ہیں تو کہیں برسوں میں جا کر ان کی طرف سے پیار ملتا ہے۔'' ''میں سوچتی ہوں ایسا کیوں ہے؟ کیا جھکنا جھکتے رہنا، ٹوٹ ٹوٹ کر اپنا آپ سمیٹنا کیا صرف لڑکیوں کا حصہ ہے۔''

یہ وہ سچ ہے جو صدیوں سے اپنی سچائی کا پرچم لہراتا آرہا ہے۔ آج جب کہ بین الاقوامی سطح کی عورت کے تحفظ کی کمیٹیاں بن چکی ہیں، اس کے باوجود عورت کی مجبوری اور مرد کی خودمختاری اپنی جگہ دونوں مستحکم ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے ان لڑکیوں کے جذبات و احساسات کا بڑی فراخ دلی سے اور سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے اور

پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے، دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

''دور سے بعض لوگ کتنے مہذب اور اچھے لگتے ہیں۔لیکن قریب جانے پر انکا ملمع اتر جاتا ہے۔تب معلوم ہوتا ہے جو آئیڈیل بنایا تھا وہ ٹوٹ گیا۔'' تجربات کی کسوٹی پر پرکھا ہوا یہ کندن جیسا جملہ کس قدر سچا ہے۔ جب یہ آئیڈل ٹوٹتا ہے تو کوئی آواز نہیں ہوتی، کوئی چرچہ نہیں ہوتا، کسی کے کانوں پر کوئی جوں تک نہیں رینگتی مگر جس کے خرمن پر یہ بجلی گرتی ہے وہ یوں تباہ ہو جاتا ہے کہ دھواں تک نہیں اٹھتا اور باقی رہ جاتا ہے راکھ کا ڈھیر۔ جسے کوئی بھی ہوا کا آوارہ جھونکا منتشر کر دیتا ہے۔

خالی خالی دامن، اضطراب پیہم۔موج تلاطم میں بھی دامن خالی رہ جاتا ہے موجِ تلاطم سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے اور باقی رہ جاتا ہے اضطراب پیہم۔ان کہانیوں میں بھی ناکامی اور مایوسی کا منھ دیکھتے دیکھتے دامن میں خشک آنسوؤں، مردہ آرزؤں اور ناکام تمنّاؤں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

لمحوں کا سفر وہ افسانہ ہے جس نے پورے مجموعہ کو اپنا نام دیا ہے۔ضبطِ عشق کی انتہا وہ ہوتی ہے جب انسان کا سب کچھ لٹ جائے اور وہ آہ تک نہ بھرے۔عرشی کے محبوب عدیل کی شادی طے ہو جاتی ہے اور عرشی کے دل میں چھپی محبت کا لاوا اُبل کر پھوٹنے کو بیقرار ہونے لگتا ہے اور وہ سوچتی ہے ''خود کردہ را علاج نیست۔'' مگر وہ اس لاوے کو آوارہ بہنے کے لئے نہیں چھوڑتی اور اپنی تحریروں کے غار میں انڈیل دیتی ہے۔ وہ پچھتانے لگتی ہے ''میں بھی کتنی پاگل ہوں میں نے اپنی محبت کے خوشگوار پھول اس وقت تم کو دئے جب تم کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔میں نے تمہاری قدر نہیں کی، مجھے تہی دست ہی ہونا تھا۔''

ڈاکٹر رضیہ حامد کے قلم کا یہ انصاف کہ اپنی ذات کے لئے بھی معافی کا خانہ نہیں ہے بلکہ سچائی کو سجا کر اور سنوار کر سولی پر چڑھایا جائے تا کہ اپنی ذات کے لئے انصاف اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرنے میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

صدا بصحرا۔گونجتی ہوئی پالیکا بازار تک پہنچتی ہے اور کچھ مسکراہٹ کے ساتھ چائے کا ذکر آتا ہے۔یہ حصہ مجموعہ کا وہ حصہ ہے جہاں پہنچ کر خوشی کا احساس ہوتا ہے مگر صحرا میں نظر آیا ہوا یہ نخلستان بھی سراب ثابت ہوتا ہے۔اور نزدیک جا کر معلوم ہوتا ہے کہ آگے انتظار کی لمبی چوڑی سڑک ہے اور پھر وہی صحرا نوردی، انتظار کی لذت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔بشیر بدؔر کے ایک مشہور شعر سے شروع ہونے والی کہانی ''آتشِ خاموش'' اسم بامسمیٰ ہے۔جاگتی دنیا سے شروع ہو کر قیامت کے دن ملنے کا وعدہ کر کے اختتام پذیر ہوتی ہے۔

فردوسِ گم شدہ۔شوہر اور بیوی کی محبت کے موضوع پر ایک خوبصورت کہانی ہے۔مگر انجام اس کا وہی ہے، جو اس کی دوسری بہنوں کا ہوا ہے۔ابدی جدائی___ حسرت و یاس کا دامن یہاں بھی بہت وسیع ہے۔

محبت انسان کا پیدائشی حق ہے۔محبت کی کامیابی یا ناکامیابی دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں۔ایک سرخرو کرتی ہے، تو دوسری لافانی بناتی ہے۔محبت میں ناکامی کا دیا لمحہ لمحہ جلتا رہتا ہے اور نکھرتا رہتا ہے۔جدائی کی سیپ پر سسک سسک کر سانسیں پوری کرتا ہے اور آخری سانس کے ساز پر جب وہ وصال کا نغمہ سنتا ہے تو فرطِ مسرت سے پھڑک کر گل ہو جاتا ہے۔''لمحوں کی صلیب'' اور ''تشنہ تشنہ'' افسانوں کا سفر بھی کچھ اسی طرح شروع ہوتا ہے۔اور جب محبت زندگی بخشنے آتی ہے تو مسافر اس قدر تھک چکا ہوتا ہے کہ اسے ابدی نیند آجاتی ہے۔

لمحوں کا سفر۔غموں، مجبوریوں اور لاچاریوں کا سفر ہے۔جس کی ہر کہانی کے اہم کردار خوشی کے شادیانے سننے کی تلاش اور آرزو کرتے کرتے مایوسیوں اور اداسیوں کی وادی میں کھو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے ان افسانوں کی تخلیق، دل کی گہرائیوں کی سچائی کے ساتھ، بڑی ایمانداری سے کی ہے۔وہ انسانیت، اپنائیت، محبت، ایثار، قربانی کے جذبات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ہنر جانتی ہیں۔دکھ درد، ظلم و ستم، ناانصافیاں، الزام تراشیاں کو خندہ پیشانی سے سہہ کر مسکراتے رہنے کا پیغام دیتی ہیں۔ان کا قلم قتل و غارت گری، خوں ریزی، بغاوت اور تشدّد کے خلاف انسان دوستی کا سبق دیتا ہے۔

''لمحوں کا سفر'' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے کہیں بھی فرط مسرّت کی کلی نہیں مسکراتی، یہ کہانیاں قاری کے دل میں سوز و گداز پیدا کرتی ہیں اور غمزدہ مظلوم انسانوں کے لئے جذبۂ ہمدردی کا علم بلند کرتی ہیں اور بشیر بدر کے شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا، بہتا ہوا پانی ہے

☆☆☆

''آپ کے افسانہ نگاری کی ابتداء بھی دلچسپ ہے۔آپ کی ایک استانی نے چھٹے کلاس میں علامہ راشد الخیری کے طرز پر ایک کہانی لکھ کر لانے کا ہوم ورک دیا۔رضیہ حامد کی لکھی کہانی جس نے پڑھی اسی نے تعریف کی چنانچہ حوصلہ یاب ہو کر افسانہ نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔اس کے بعد کئی افسانے لکھے جو اسکول کے میگزین سے لے کر مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ان افسانوں کا ایک مجموعہ ''لمحوں کا سفر'' عنوان سے مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا مگر اس کے بعد افسانہ نگاری کی طرف سے توجہ کم ہو گئی۔آپ نے زیادہ تر توجہ تنقید و تحقیق اور فکر و آگہی کی اشاعت پر مرکوز کر دی۔''

(کوثر صدیقی کے مضمون ''**دُخترِ بھوپال ڈاکٹر رضیہ حامد کا بحیثیت صحافی ایک اجمالی جائزہ**'' سے اقتباس)

ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی)

ڈاکٹر رضیہ حامد کا زندہ جاوید کارنامہ

نقوشِ بھوپال

بھوپال ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی، لیکن تاریخی، علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے یہ چھوٹی سی ریاست غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی۔ موجودہ بھوپال قدیم بھوپال سے بہت مختلف ہے۔ اب یہاں وہ قدیم تہذیب مٹتی جارہی ہے۔ خوش نما عمارتوں کو وقت اپنی دھول میں تیزی سے چھپا رہا ہے۔ ہماری نئی نسل میں بہت کم لوگ ہیں جو بھوپال کی اہمیت سے واقف ہوں گے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے ''نقوشِ بھوپال'' نام سے کتاب مرتب کر کے قدیم بھوپال کو زندہ وجاوید بنا دیا ہے۔ ان کی مرتبہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں قدیم بھوپال کے ہر ممکن پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں باون صفحات پر مشتمل ایک سو پچیس کے قریب تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ یہ تصویریں مدھیہ پردیش کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، نواب خاندان کی اہم شخصیتوں اور تاریخی عمارتوں پر مشتمل ہیں۔

کسی زمانے میں ہاکی بھوپال کا مقبول ترین کھیل تھا اور اس ریاست نے ہاکی کے بہت مشہور کھلاڑی پیدا کئے ہیں۔ اس کتاب میں ان میں سے بہت سے کھلاڑیوں کی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں۔

کتاب میں بھوپال کے مختلف پہلوؤں پر سو سے زائد مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں بھوپال ریاست کا جغرافیہ دیا گیا ہے اور پھر بھوپال میں پیدا ہونے والی سبزیوں، دالوں، پھلوں، عمارتی لکڑیوں والے درختوں، چربی دار تیل فراہم کرنے والے پودوں اور دوسرے نباتات کی فہرست دی گئی ہے۔

محمد احمد سبزواری نے اپنے مضمون میں راجہ بھوج سے لے کر موجودہ عہد تک بھوپال کی سیاسی تاریخ بیان کی ہے بھوپال کی اہم شخصیتوں مثلاً رانی کملاپتی، نواب شاہجہاں بیگم، نواب سلطان جہاں بیگم، مولانا برکت اللہ وغیرہ پر الگ مضمون لکھے گئے ہیں۔ ریاست بھوپال کی مہریں، ریاست بھوپال کے ٹکٹ اور سکّے، جیسے مضامین بھی اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ بھوپال کی اہم تاریخی عمارتوں، باغوں، تفریح گاہوں اور سیر گاہوں پر

ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا ہے جس میں چودہ مضامین شامل ہیں۔ بھوپال کی صنعتوں پر بھی ایک الگ سیکشن قائم کیا گیا ہے جس میں بھوپال کی اہم صنعتوں کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک اور سیکشن میں بھوپال کی علمی سرگرمیوں پر ایک گوشہ مرتب کیا گیا ہے، ان میں بھوپال کی علمی تاریخ، بھوپال میں اردو تعلیم، بھوپال کے چند ذاتی کتب خانے، اقبال اور بھوپال جیسے مضامین شامل ہیں۔ بھوپال کی لسانی اور ادبی خدمات پر ایک بہت بڑا سیکشن قائم کیا گیا ہے جس میں پہلے تو بھوپال کی زبان، بھوپال کا لسانی جائزہ، بھوپالی اردو، بھوپالی اردو اور چند تاثرات'' وغیرہ جیسے مضامین شامل ہیں اور پھر تقریباً پچیس مضامین میں بھوپال کی شعری اور نثری خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک الگ سیکشن میں بھوپال کی ہاکی اور شکار پر مضامین شامل ہیں۔

بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم کو اپنے عہد کی علمی، ادبی اور دینی سرگرمیوں میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایک طرف انجمن ترقی اردو (ہند) جیسے اداروں کو مالی تعاون دیا تو دوسری طرف دارالمصنفین جیسے ادارے کی سرپرستی کی۔ درالمصنّفین کا واقعہ بہت دل چسپ ہے مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ء میں سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا اعلان کیا اور مسلمانوں سے اس عظیم تالیف کے لئے مصارف کی اپیل کی تو بہت سے لوگوں نے دل کھول کر مالی تعاون دیا۔ یہ نواب سلطان جہاں بیگم کی عظمت تھی کہ انھوں نے حکم صادر فرمایا کہ اس مقصد کے لئے جتنے روپیوں کی ضرورت ہے وہ اپنے خزانے سے دیں گی۔ یہ حکم پا کر شبلی نے جتنی رقم وصول کی تھی وہ سب واپس کر دی اور نواب سلطان جہاں بیگم کے مالی تعاون پر انحصار کیا۔ اس کتاب میں دارالمصنّفین اور ریاست بھوپال کے عنوان سے مولانا شاہ معین الدین ندوی کا ایک مقالہ ہے جس میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اب تک بھوپال پر ایسی اہم کتاب نہیں لکھی گئی۔ ہم اس کتاب کے لئے اس کی مرتّبہ ڈاکٹر رضیہ حامد اور رفعت سلطان کے علاوہ ان تمام حضرات کو مبارک باد دیتے ہیں جن کے مضامین نے اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت کا حامل بنایا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں بھوپال کی طرح اور بھی کئی تاریخی شہر ہیں۔ مثلاً دہلی لکھنؤ، حیدرآباد، رامپور اور لاہور۔ لاہور پر نقوش'' نے ''خاص نمبر'' شائع کیا تھا، جو اگرچہ بہت اچھا تھا لیکن ''نقوش بھوپال'' کے ہم پلہ نہیں تھا اور باقی شہروں پر اس طرح کی کتابیں لکھنے یا مرتب کرنے کی توفیق کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان شہروں کے ادیبوں اور مورّخوں کو غیرت دلانے کے لئے یہ کتاب کافی ہے۔ دہلی والا ہونے کے ناتے کم سے کم مجھے واقعی شرم آئی کہ ابھی تک میں نے یا کسی اور دہلی والے نے دہلی پر اس طرح کا کام نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے اب یہ کتاب ہم سب کے لئے ایک مشعل راہ کا کام کرے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضیہ حامد

آسماں تری رفعتوں پہ ناز کرے

(والد محترم سید فتح علی صاحب مرحوم کے حوالے سے)

اپنے بچپن کے واقعات وحالات کو یاد کرتی ہوں تو سب سے پہلے شیش محل میں اپنا گھر یاد آتا ہے۔ ہمارا گھر شیش محل کے کونے پر موتی مسجد کے سامنے واقع تھا (یہ گھر تو اب بھی ہے) اوپر کے کمرے کی کھڑکیاں، دروازہ کے اندر کھلتی تھیں اور ایک کھڑکی کھرنی والے میدان یعنی حال اقبال میدان کی جانب۔ شیش محل سے ملا ہوا دروازہ، اور ایک طویل چھت کے بعد دوسرا دروازہ تھا جو موتی مسجد کے اختتامی حصّہ کے مقابل تھا یہ دروازے اب توڑ دئے گئے ہمارے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ کی آدھی محرابیں ابھی میری بات کی گواہی کے لئے موجود ہیں۔ موتی مسجد کے سامنے والے حصہ میں اوپر ایک بارہ دری بھی ہے یہ بھی ابھی شکستہ حالت میں اپنے خوبصورت آثار کی جھلک دکھا رہی ہے۔

میری پیدائش غالباً اسی مکان میں ہوئی والد صاحب نواب حمید اللہ خاں کے پرائیوٹ آفس سے منسلک ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں مگر انکی شفقت محبت اور توجہ مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔ ہمارے گھر میں ماشااللہ میرے ناز اٹھانے والے کئی افراد تھے والدہ کے علاوہ میری تین پھوپیاں اور دو خالائیں جو والد اور والدہ دونوں کی سگی خالہ کی بیٹیاں۔ ایک اور رشتہ کی پھوپی اور بڑے ابا ہم سب ساتھ رہتے تھے۔ اب سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ والد صاحب کنبہ پرور تھے۔ دادا میاں سید حافظ امجد علی صاحب کی پینشن ہوگئی تھی۔ تایا صاحب اور والد صاحب کے بچپن میں ہی ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور وہ دونوں ماں جیسی شفیق ہستی سے محروم ہو گئے تھے۔ دادا میاں کی والدہ نے انکی دوسری شادی رشتہ داروں میں ہی کردی۔ دوسری دادی بی سے ہماری پھوپیاں اور چچا تھے۔ پھوپیاں زیادہ تر ہمارے گھر رہتی تھیں چچا بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ والد صاحب کبھی نواب صاحب کے ساتھ باڑی۔ بسیر میں اور کبھی چکلود میں رہتے تھے۔ اندرون خانہ میری والدہ کی ذمہ داری اور بیرون خانہ میرے تایا اور چھوٹے ماموؤں کی۔ دادا میاں بھی اکثر گھر کی خیر خبر لینے آجاتے تھے۔

پھر نواب صاحب کے لندن پیرس اور سوئز رلینڈ کے چکر لگنے لگے والد صاحب ان کے ساتھ۔ اب گھر میں انکا وقت بہت کم گزرتا تھا۔ مگر اپنے مستقر سے روانہ کردہ ان کے خطوط بتاتے تھے کہ وہ کسی بھی شخص سے غافل نہیں۔ گھر سے کتنے ہی دور ہوں۔ دادا میاں، نانا میاں۔ والدہ۔ خود ان کے چچا۔ بڑے بھائی غرض ہر ایک سے یہ ذکر کہ بشرط فرصت گھر اور بچوں کی خبر گیری کرلیا کریں۔ اپنی اور سب عزیز و اقارب کی خیر و عافیت سے مطلع کرتے رہیں۔

میرے بھائی ایک بہن کا انتقال ابتدائے عمر میں ہی ہوگیا۔ والد صاحب انکی بیماری کے وقت باہر تھے بھائی کا نام جاوید مسعود تھا اس کے انتقال کے وقت غالباً چکلود میں تھے یہ میرے بہت بچپن کی بات ہے ہم لوگ اس کو چاند کہتے تھے۔ شاید دفن کے وقت والد صاحب آ گئے تھے۔ مگر چھوٹی بہن روبینہ کی طبیعت کافی عرصے سے خراب تھی جس زمانہ میں اس کی طبیعت بہت خراب تھی والد صاحب کو نواب ساجدہ سلطان نے دہلی طلب کرلیا۔ جو بھی اشد ضروری کام ہوں وہ والد صاحب اور ساجدہ سلطان کو معلوم ہونگے مجھے تو بس یہ یاد ہے کہ جب بھوپال سے ان کو روبینہ کے انتقال کی خبر دینے کے لئے فون کیا گیا تو معلوم ہوا فتح علی صاحب کو بیگم صاحبہ نے اسپتال بھیجا ہے۔ جہاں ان کی بیٹی میٹرنٹی وارڈ میں داخل تھیں۔ خیریت دریافت کرنے یا روپے لیکر۔ دو گھنٹہ بعد والد صاحب نے فون کر کے کہا کہ میں نہیں آسکتا آپ لوگ اس کو دفن کر دیں۔ اتفاق سے ہمارے بڑے ابا جن کو ہم لوگ سب بھائی صاحب کہتے تھے وہ بھی کسی کام سے کئی دن سے لکھنؤ گئے ہوئے تھے ان کو یہ غم رہا کہ میں ناحق لکھنؤ گیا کام پھر ہو جاتا میں نہیں جاتا تو روبینہ بچ جاتی۔ موت کا وقت معین ہے مگر انسان کیا کیا سوچتا ہے۔

والد صاحب کا معمول تھا کہ دادا میاں کی مزاج پرسی کے لئے دو ایک روز کے وقفہ سے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ اور جب بھوپال سے باہر جانا ہوتا تھا خاص طور سے یورپ تو ان سے مل کر ضرور جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ خفیہ سفر پر یورپ جا رہے تھے چپ چاپ دادا میاں سے مل کر چلے گئے اس زمانہ میں دادا میاں کی طبیعت خراب تھی والد صاحب کو انکی طرف سے بہت فکر تھی تقریباً ایک ہفتہ یا اس سے بھی کم عرصہ میں وہ واپس آ گئے مگر بھوپال میں انکو اتنی مہلت نہیں ملی کہ دادا میاں کے پاس زیادہ وقت گزار سکیں جس کا ہمیشہ افسوس کرتے تھے۔ ایک دن والد صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی ڈاکٹر نے کوئی انجکشن لگایا جو پک گیا۔ انکو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں میری چھوٹی بہن رفعت چند ماہ کی تھی والدہ کبھی گھر کبھی اسپتال کے چکر میں پڑ گئیں۔ بھائی جان نیم بے ہوش اور ادھر دادا میاں نے دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ خدا کی مصلحت وہی جانے والد صاحب دادا میاں کی آخری صورت بھی نہیں دیکھ سکے۔ ان کے انتقال کی خبر بھی ان کو کئی دن بعد دی گئی۔

والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے تمام خاندان کی ذمہ داری کو اپنی ذمہ داری سمجھا اور اپنی بہنوں کی

شادیاں اپنے گھر سے کیں پھوپی زاد بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں کی، خالہ زاد بہنوں کی شادیاں کیں، اور بھائیوں کو بھی پڑھنے میں ہر ممکن مدد کی۔ اپنی اولاد سے زیادہ انکا خیال کیا۔

اپنے بچپن کی ایک بات میں بھول نہیں پائی۔ بچپن سے یہ خیال تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں گی غالبا آٹھویں کلاس میں تھی جب والد صاحب انگلینڈ سے ایک ڈسیکشن باکس میرے لئے لائے یہ الگ طرح کا تھا۔ ایک خاکی کپڑے میں الگ الگ خانہ بنے ہوئے تھے ان میں سب چیزیں الگ الگ رکھی ہوئی تھیں اور وہ لپٹ کر گول ہو جاتا تھا۔ سائنس کا مضمون اس زمانہ میں نویں کلاس سے شروع ہوتا تھا۔ یعنی آرٹس اور سائنس سیکشن الگ ہو جاتے تھے۔ میرے چھوٹے چچا جو مجھ سے عمر میں کچھ بڑے تھے نویں کلاس میں سائنس پڑھ رہے تھے انہوں نے کہا مجھے یہ والا ڈسیکشن باکس چاہئے۔ والد صاحب نے اٹھا کر دے دیا۔ میری آنکھوں میں آج بھی وہ ڈسکیشن رول گھوم رہا ہے مگر ہماری ہمت نہیں تھی کہ ہم احتجاج کرتے۔ والدہ اس معاملہ میں بڑی سخت ہیں انھوں نے ہم بھائی بہنوں کی تربیت بہت اعلیٰ اقدار کے ساتھ کی ہے۔ ہم سب جو کچھ ہیں وہ اپنی والدہ کی بدولت ہیں۔ ورنہ آج دیکھ لیجئے جہاں والد صاحب کا ڈر نہیں یا وہ باہر کمارہے ہیں ان کے بچے صرف عیش کرنا جانتے ہیں علم سے ان کی دوستی دور کی ہی ہوتی ہے۔

والد صاحب جامہ زیب تھے جو پہن لیتے ان پر کھل اٹھتا تھا انہیں پرانے پیوند لگے کپڑے پہنے میں کوئی عار نہیں تھا۔ کپڑے بہت سلیقے اور اہتمام سے پہنتے تھے۔ شیروانی ٹوپی۔ بند گلے کا سوٹ کبھی ٹائی بھی باندھتے تھے ہم رنگ موزے، جیب میں اچھے قسم کا پین اور ایک پینسل ہمیشہ رہتی تھی۔ کھانے یا کپڑے پہننے میں بد سلیقگی ان کو پسند نہیں تھی۔

والد صاحب اپنے حالات کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ مگر مطالعہ کے شوق نے ان کی ذہنی فراست کو جلا بخشی۔ والد صاحب کا حافظہ قوی تھا بچپن کا پڑھا ہوا ایسا یاد تھا کہ ہم لوگوں کو جامیٹری کی تھورم فرّاٹے سے سمجھا دیتے۔ الجبرا پڑھا دیتے۔ اردو فارسی کے بے شمار شعر اور حکایتیں ان کو یاد تھیں، جو گفتگو میں شامل رہتی تھیں۔ بچپن میں ہم میں سے کوئی بھی قرآن پاک پڑھتے میں کہیں اٹک جاتا یا غلط پڑھتا تو وہ دوسرے کمرے سے اس کو ٹوک کر صحیح بتایا کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ حافظِ قرآن ہیں؟ مسکرائے اور کہا نہیں، حافظ تو نہیں ہوں مگر قرآن پاک کی غلطی بتا سکتا ہوں۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔

والد صاحب اور تایا صاحب دونوں ساتھ رہتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو قرآن پاک بلند آواز میں پڑھنے کی عادت تھی۔ ہم نے کبھی ان کو دھیرے قرآن پاک پڑھتے نہیں دیکھا۔ بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں مثالی محبت تھی۔ مگر صد افسوس والد صاحب ان کی تدفین میں بھی شریک نہ ہو سکے کہ دہلی میں نواب ساجدہ سلطان کا کوئی اہم کام دوسرے دن ہونا تھا۔ جس میں والد صاحب کی موجودگی ضروری

تھی۔ کتنا نہ تڑپے ہونگے مگر انھوں نے زبان سے اف نہ کیا۔

والد صاحب کو اردو شعر اور ادب سے دلچسپی تھی اچھا شعر اور نثر ان کو متاثر کرتی تھی۔ ہم بہنوں اور بھائیوں کے ان کے نام لکھے خطوط میں جو تحریر ان کو پسند آتی اس کی تعریف کھل کر کرتے تھے۔ پڑھنے میں دل لگانے کے لئے انھوں نے ہم لوگوں کے لئے طرح طرح کے انعام مقرر کئے تھے۔ پہاڑا یاد کرنے پر انگلینڈ سے لائی ہوئی ٹافی تو آج بھی یاد ہے۔ پہاڑا بیچ میں سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ ریڈیو کے مشاعرے ایسے سنتے جیسے شاعر سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کی اس ادا نے ہم لوگوں میں بھی کسی حد تک شعر فہمی پیدا کی اور ہماری ادب میں دلچسپی بڑھی۔ غالبؔ ان کے پسندیدہ شاعر تھے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی انھوں نے ''دیوانِ غالبؔ'' اور ''مسدسِ حالیؔ'' اسپتال میں منگوا کر پڑھیں۔ دیوانِ غالبؔ پڑھ کر اس کے اشعار کی تشریح بھی کرتے جاتے۔ مسدّس پڑھ کر روتے تھے جب خود نہیں پڑھ پاتے تو کسی سے پڑھوا کر سنتے تھے اور اس شخص کے تلفظ میں اگر کوئی غلطی ہوتی تو اس کو درست کرتے جاتے۔ یا پھر بد مزہ ہو کر اس کو پڑھنے سے روک دیتے تھے۔

گالی گلوچ، ترش کلامی، طنز کرتے ہم نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم بھائی بہنوں کو بھی ادب تمیز اور تہذیب کا درس دیتے تھے۔ ہم لوگوں نے کبھی مہترانی کو خالی مہترانی نہیں کہا بلکہ مہترانی بائی، موچی صاحب، لکڑ ہارے صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ محل پر کام کرنے والے اکثر لوگ ہمارے چچا اور تایا تھے اور وہ لوگ بھی ہم سب سے اسی طرح ملتے اور برتاؤ کرتے تھے جیسے وہ ہمارے اپنے رشتہ دار ہوں۔ ہماری بری بات پر ٹوکتے، غلطی پر تنبیہہ کرتے تھے اور والد صاحب ان کے اس فعل سے خوش ہوتے تھے۔

مجھے یاد ہے جب والد صاحب اپنی موٹر سائکل پر گھر سے نکلتے (اس وقت بھوپال میں صرف دو موٹر سائکلیں تھیں ایک والد صاحب کے پاس، دوسری احسان صاحب کے پاس یہ دونوں گاڑیاں نواب صاحب کے ساتھ انگلینڈ سے آئی تھیں جہاں یہ لوگ بھی ان کے ہمراہ تھے) تو ٹرافک کانسٹیبل سلوٹ کرتا تھا شیش محل کے برابر دروازے پر ایک ٹرافک کانسٹیبل کھڑا رہتا تھا۔ ہم لوگ ان سے بھی رشتہ جوڑ لیتے تھے۔ کوئی مما تھے کوئی چچا۔ تو تڑاخ سے بولنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ نہ کبھی والد صاحب اور نہ والدہ نے ہم لوگوں سے تو تڑاخ سے بات کی۔ ہمیشہ ادب تمیز سے گفتگو کرنے کی تلقین کی۔ ان کا کہنا تھا بچوں سے جیسے بولو وہ ویسے ہی جواب دیں گے ان کی عادت اسی طرح کی پڑے گی اچھی تربیت عمر کی ابتداء سے ہی ہونا چاہئے۔ دھیمی آواز میں بات کرتے چیخ کر بات کرنا پسند نہیں تھا۔

والد صاحب نے ہمیشہ اپنے بڑوں کی عزت اور توقیر کی۔ دادا میاں کے انتقال کے بعد دادی بی کی خبر گیری، چچاؤں کی تعلیم کی فکر، وہ تو باہر رہتے تھے مگر امی اور تایا صاحب کو برابر خطوط سے ان مسائل کی طرف برابر متوجہ کرتے رہتے تھے۔ نہ صرف اپنے بلکہ غیروں کے بچوں کو بھی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی

کرتے تھے۔کوشش کر کے سلطان جہاں ایجوکیشن ٹرسٹ سے وظیفہ دلواتے اپنی جیب سے خفیہ مدد تو جاری ہی رہتی تھی ۔امریکہ، انگلینڈ اور نا معلوم بھوپال کے وہ طالب علم دنیا کے کن کن گوشوں میں ہیں جو والد صاحب کے احسانات کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔

والد صاحب کی خواہش تھی کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اللہ کا کرم ہے کہ ہم سب بہنیں اور بھائی ان کی زندگی میں ہی تعلیم کی اعلیٰ استاد سے بہریاب ہو گئے تھے۔اور سب اپنے اپنے گھروں میں شادکام ہیں جس سے والد صاحب کو ذہنی سکون اور دلی اطمینان حاصل تھا۔میرے بچے عامر، صالحہ، عاصم، وعاطف ان کے بڑے چہیتے تھے،نواسا نواسی جو ٹھہرے۔کتنی ہی مصروفیت ہوتی اگر وہ لوگ نانا میاں کو کچھ سنا رہے ہیں کوئی اسکول کا قصہ، یا اپنا سبق فوراً متوجہ ہو کر سنتے ،شاباشی دیتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔میرے چاروں بچوں کو انھوں نے پڑھایا بھی۔ میں جب ۱۹۷۴ء میں حج کرنے گئی تھی تو چاروں کو والدہ اور والد صاحب کے سپرد کر گئی تھی۔ بچے ددھیال سے بھی ہلے ہوئے تھے۔آدھی رات کو بھی کوئی بچہ دادی کے پاس جانے کا کہتا تو والد صاحب یا بھیا کوئی بھی ان کو لے جاتے۔یا بہلاتے کہ صبح لے جائیں گے اور وعدے کے مطابق عمل کرتے۔ چھٹیوں میں بچوں کے ڈرامے ہوتے سامنے سامعین میں نانا میاں، نانی اماں اور خالائیں (گھر میں موجود مہمان جو بھی ہوتا، ہمارے گھر میں اللہ کی رحمت تھی) سب بیٹھ کر دیکھتے اور بچوں کا حوصلہ بلند ہو جاتا۔کبھی بچے اسپورٹ میٹ کرتے والد صاحب ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے میدان میں تماشائی بنے بیٹھے ہوتے۔ پھر اپنا کام کیسے پورا کرتے یہ ان کا ہی دردِ سر تھا۔نواسے نواسی تو اپنی مصروفیات میں ان کو شریک کر کے سرفخر سے بلند کئے خوشیوں سے بھرے دل کے ساتھ اپنے اسکول یا گھر روانہ ہو جاتے۔

ہمارے گھر میں ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کوئی مہمان نہ ہو، کھانا ایک دو نفر کا زیادہ ہی پکتا تھا کہ کھانے کے وقت کوئی آ گیا تو وہ بھوکا نہ جائے اور اس پر ہی بس نہیں والد صاحب کہتے بھئی فلاں (ہم، میں سے کوئی یا پھر امی) خالد میاں/حامد میاں یا کوئی آئے ہیں سردی کا موسم ہے چائے پی لی جائے۔کبھی انڈوں کا حلوہ، کبھی گاجر کا حلوہ اور اس پر ڈالنے کے لئے بلائی منگوائی جاتی۔آنے والا اپنے آپ کو وی۔آئی۔پی۔تصور کرتا۔اور دلی خوشی کے ساتھ واپس ہوتا۔

والد صاحب بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ نام ونمود سے دور، ان کے مزاج کی سادگی کی ایک مثال سناؤں۔ ریاست کے مرج ہونے سے پہلے نواب حمید اللہ خاں نے اپنے اسٹاف کو کئی باغات اور زمینیں عنایت کیں۔ والد صاحب سے انھوں نے کہا کہ تم احمد آباد آ کر رہو ایک بنگلہ اور کار تم کو بھی دے دیتا ہوں۔ والد صاحب نے عاجزی اور انکساری سے ان کی اس عنایت کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور کہا ’’سرکار میں شہر میں ہی ٹھیک ہوں۔میرے بوڑھے والدین شہر میں ہی رہتے ہیں۔ میں اکثر آپ کے ساتھ سفر میں ہوتا

ہوں۔ بیوی بچوں اور والدین کی نگہداشت میں دقّت ہوگی‘‘۔ یہ والد صاحب کی بلند ظرفی تھی ورنہ لوگ تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ والد صاحب کے مضبوط اور بلند کردار کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔

والد صاحب کو بھوپال کی تاریخ اور خاص طور سے نواب حمید اللہ خاں کے دور کے حالات و واقعات ایسے یاد تھے کہ وہ سن، تاریخ، دن، وقت اور جگہ کی نشاندہی کے ساتھ ان کو بیان کرتے۔احتیاط کا یہ حال تھا کہ کبھی سرکاری راز زبان پر نہیں لائے، جو بات بھی بتاتے بہت محتاط انداز میں۔بھوپال کی تاریخ سے دلچسپی ان کی وجہ سے ہی ہم سب بہنوں و بھائی کو ہوئی۔ وہ نواب حمید اللہ خاں کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا انسان میں خوبیاں تلاش کرو۔ وہ فرشتہ نہیں کہ غلطی نہ ہو۔خوبیوں سے اس کی صحیح قدر وقعت سامنے آتی ہے انھوں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔ اگر کسی شخص نے ان سے کوئی برا سلوک کیا تو اس کے بعد انھوں نے اس شخص کے ساتھ ضرور نیکی کے سلوک میں اضافہ کر دیا اور یہی رویہ انھوں نے ہم لوگوں کو بھی سکھایا۔ بدلہ لینے سے ہمیشہ منع کیا۔اور معاف کرنے کی تلقین کی۔

ایک مرتبہ بیمار ہو کر کسی پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں داخل تھے۔ شفایاب ہونے کے بعد (آم کی جو فصل اس وقت تیار تھی) اپنے گھر کے پیڑوں سے اچھے آم کافی تعداد میں تڑوا کر ڈاکٹر کو بھیجے اور کہا کہ آپ کی خصوصی توجہ سے مجھے صحت کامل حاصل ہوئی۔ میں بہت خلوص کے ساتھ اپنے گھر کے آم آپ کو بھیجتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی کا کوئی مقولہ بھی تحریر کیا۔ڈاکٹر اپنی فیس، اسپتال کے چارجز سب وصول کر چکا تھا ان کے اس خوش اخلاقی اور بلند ظرفی سے بہت متاثر ہوا۔

والد صاحب شہرت کی منزل سے بہت آگے تھے انھیں نہ شہرت کی تمنّا تھی اور نہ صلہ کی پرواہ۔اپنے فرائض سے ان کو عشق تھا اور ان کی بہتر طور پر ادائیگی ان کا شوق ٹھہرا، جس میں وہ آخر دم تک مصروف اور کامران رہے۔ اسی لئے انھوں نے قلبِ مطمئن کے ساتھ زندگی بسر کی۔غرض کے والد صاحب بحیثیت انسان، بحیثیت والد بڑی خوبیوں کے حامل تھے۔مہر و محبت، لطف و کرم، صدق و صفا کے پیکر تصنع اور ریاکاری کے تمام تر منزہ۔اور یہی درس تمام زندگی والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے ہم بھائی اور بہنوں اور ہم سب کے بچوں کو دیا۔جس کی تھوڑی بہت جھلک شاید آپ سب کو ہم میں نظر آ جائے۔ والد صاحب مرحوم اور والدہ صاحبہ کے لئے ہمارے ساتھ خیر کی دعا کریئے اللہ تعالیٰ والد صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور والدہ صاحبہ کو صحت و تندرستی کے ساتھ بے شمار خوشیاں اور طویل عمر عطا فرمائے۔ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے ہم سب کو بھی نیک ہدایت دے کہ ہم اس عظیم دولت کی قدر کر سکیں۔آمین۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضیہ حامد

وراثت

ناھید نے خبریں سننے کے لئے ریڈیو کھولا۔خبروں کو نشر کرنے والی خاتون کہہ رہی تھیں کہ میونسپل کمشنر کی منظوری کے بعد راج محل کا ایک حصہ توڑ دیا جائے گا۔ پورے محل کو توڑنے کا عمل دھیرے دھیرے ہوگا۔کل اس تجویز پر غور کرنے کے لئے کمشنر نے ایک میٹنگ بلائی ہے۔'' ناھید سوچ میں گم ہوگئی۔

راج محل شہر کی سب سے قدیم عمارت دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اپنی رونق کھو چکی تھی اس کے باوجود عمارت پُرشکوہ اور سر بلند کئے راہ گیر کو ماضی کی عظمت سے روشناس کرا رہی تھی۔ مغل دور کی اس یادگار کو ہر شخص دیکھتا اور اس کی شکستگی پر افسوس کرتا مگر خود کے وسائل کی کمی کے باعث صرف ہاتھ مل کر رہ جاتا۔

ناھید اسکول پڑھانے جاتے ہوئے اس عمارت کو ضرور نظر میں رکھتی تھی اسکو بچپن سے ہی آثار قدیمہ سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔اسکول میں خالی وقت میں اکثر بچوں کو تاریخ سے متعلق باتیں بتاتی اور راج محل کے متعلق تو بہت زیادہ ذکر کرتی تھی وہ چاہتی تھی کہ اسکو دوبارہ اسی حالت میں لے آیا جائے جیسا کہ وہ ایک صدی پہلے تھا۔ریڈیو میں خبریں سننے کے بعد ناھید نے اپنی پرنسپل سے اسکا ذکر کیا ٹیچرس کی میٹنگ میں اس بات پر غور وفکر اور تبادلہ خیال ہوا اور طے کیا گیا کہ ایک درخواست کمشنر آرکائیوز کو بھیجی جائے کہ راج محل کا تحفظ اور جدید تزئین کاری ضروری ہے۔ یہ ہماری تہذیب وتمدّن کا انمول حصہ ہے۔فوراً ہی ایک درخواست سرکار کو روانہ کر دی گئی۔

ناھید نے اپنے کلاس میں جب راج محل کے ایک حصہ کو توڑنے کی بات کا ذکر کیا تو بچے بھی فکرمند ہوئے اور ناہید سے طرح طرح کے سوال کئے راکیش نے کھڑے ہو کر کہا۔میم کیا ہم لوگ اس کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟۔۔۔۔ضرور کر سکتے ہیں ہم لوگوں نے اسکول کی طرف سے ایک درخواست بھیجی ہے۔اس کے علاوہ ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ ایک فنڈ قائم کیا جائے اور اس میں جو چاہے چندہ دے سکتا ہے۔ اس رقم سے ہم لوگ جا کر کسی بھی تاریخی عمارت کی صفائی ستھرائی کروا سکتے ہیں۔حکومت کو کام کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ناہید نے تفصیل سے جواب دیا۔

میم۔میرے پاس تو صرف ایک روپیہ ہی ہے کیا میں اس کو فنڈ میں جمع کروادوں۔حسیب نے بہت معصومیت سے سوال کیا۔

بے شک تم اپنی طرف سے چھوٹا سکہ بھی دے سکتے ہو۔ بلاشبہ تم سب کو ہی آگے جا کر بڑے کام کرنا ہیں۔ چند دن بعد ناہید نے دیکھا کلاس کی دیوار پر کئی چارٹ اور فوٹو اس ہدایت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں کہ ہمیں اپنی وراثت کو محفوظ کرنا ہے۔ بچے اپنی اپنی پسند کے رنگوں سے ان کو سجا کر لائے تھے۔ناہید بچوں کے اس کام سے خوش ہوئی۔اس نے بچوں کو اسکول کے خالی وقت میں کسی تفریحی مقام پر لے جانے کی پرنسپل سے اجازت لے لی۔بچوں کل ہم باؤلی والے باغ پکنک پر جائیں گے۔ پھر فوٹو بنانا۔ناہید نے باؤلی والے باغ سے متعلق معلومات اکٹھی کرلیں تاکہ ان کو پڑھانے اور بتانے میں آسانی ہو۔

ناہید اپنے کلاس کے بچوں کے ساتھ مل کر کبھی اسکول کا باغ ٹھیک کرتی اور کبھی لائبریری لے جا کر بچوں کو تاریخ کے کتابیں نکال کر پرانے محلات، مندر اور مسجد کے متعلق بتاتی۔بچوں کو پڑھائی کے علاوہ خاص قسم کی یہ ایکٹیوٹی بہت پسند آئی۔کچھ عرصہ بعد رات کی خبریں سنتے ہوئے ناہید کے لئے یہ اعلان بڑا جان لیوا ہوگیا کہ کل راج محل کا ایک حصہ توڑ دیا جائے گا۔ ناہید چند منٹ سکتہ زدہ رہ گئی۔سوچتے سوچتے رانی کے سر میں شدید درد اُٹھا اور وہ بستر پر ڈھے گئی۔دوسرے روز جس وقت یہ خبر اسکول پہنچی کہ ناہید میم بیمار ہوگئیں اور آج راج محل کا ایک حصہ توڑ دیا جائے گا۔بچوں نے بآواز بلند کہا کہ ہم اپنی ٹیچر کو صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمام ٹیچرس نے طے کیا کہ بچوں کی ریلی نکالی جائے اور راج محل کی شکستگی کو دور کرنے کے متعلق ایک تجویز کمشنر کو پیش کی جائے ناہید کے کلاس میں سے سب سے زیادہ ڈسپلے کارڈ ملے۔

ریلی کی شکل میں بچوں کا جلوس مع ٹیچرس کے راج محل پہنچا۔مزدور دیوار توڑنے کے لئے کدالی مار رہے تھے راکیش نے دوڑ کر ایک مزدور کے ہاتھ پکڑ لئے۔نہیں۔نہیں۔ ہمارا راج محل مت توڑو۔راکیش نے بلند آواز میں کہا اس کو دیکھ کر دوسرے بچوں کی ہمت بندھی اور دوسرے مزدوروں کو کام کرنے سے روک دیا گیا۔ پولس اور سرکاری افسران موقع پر پہنچ گئے۔

بچوں کی اس دیدہ دلیری، بہادری اور مستقل مزاجی کے لئے ان کی تعریف کی گئی ان بچوں کے احتجاج کی وجہ سے غور وفکر کے بعد کام میں تبدیلی کرنے کے لئے سرکاری سطح پر رضامندی کا اظہار کیا گیا، اس کے بعد بچوں کی ریلی اسکول واپس چلی گئی۔اسکول کی پرنسپل کو حکومت کی طرف سے بچوں کی بہادری اور سوجھ بوجھ کی تعلیم دینے کے لئے بہترین اسکول کا سرٹیفکٹ دیا گیا۔ ناہید بچوں کی اس ہمت اور محبت ودلچسپی کی خبر سے بہت خوش ہوئی اس روز وہ اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اسکول نہیں جا سکی تھی۔حکومت کی طرف سے ناہید کو بہترین ٹیچر کا ایوارڈ دیا گیا۔

ناہید اور اس کے کلاس کے بچوں کا یہ معمول بن گیا کہ وہ ہفتہ میں ایک دن کسی تاریخی مقام پر جا کر اسکو دیکھتے اور معلومات اکٹھی کرتے۔انہوں نے عہد کیا کہ اپنی وراثت کی حفاظت کرنا ہے اور دوسروں کو اسکی طرف متوجہ کرنا ہے۔اس کے لئے چھوٹے بڑے ہر شخص کو ان کے کام میں شامل ہونے کی آزادی دی گئی اور پھر

''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا''۔

ڈاکٹر رضیہ حامد

زندگی کے ہزار رنگ

گھنٹہ گھر کی آواز نے نادیہ کو چونکا دیا۔اوہ !نمعلوم کتنی رات گزر گئی سامنے تالاب کے پانی پر روشنی کا عکس جھلملا رہا تھا۔اسے لگا ابھی چند لمحے پہلے ہی اسکی بیٹی فارہہ نے اسکو اس منظر کی دلکشی کی طرف متوجہ کیا تھا۔لیکن فارہہ کہاں گئی ؟۔ہاں۔میں نے اس کو سونے کے لئے کہہ دیا تھا۔فارہہ نے کتنے جوش سے کہا تھا'' امی ذرا ادھر آیئے۔پانی پر روشنی کا عکس کیسا جھلملا رہا ہے''۔اور میرے کانوں میں آواز گونجنے لگی تھی۔''یہ رونی صورت کیوں بنائے رہتی ہو، ہر وقت آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ۔آخر تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔یہی نا کہ تم بہت ستم رسیدہ ہو''۔سجاد کی غصہ سے بھری آواز نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

نہیں !میں نے ایسا تو نہیں سوچا تھا سجاد۔مگر میں جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے لاڈلی تھی، گھر کی ذمہ داریوں سے جلد تھک جاتی تھی۔اس پر تینوں بچوں کی جلد جلد آمد نے مجھے چڑچڑا بنا دیا تھا۔

تم کو شاید یاد ہو میں بڑی شریر اور چلبلی ہوا کرتی تھی ہر ایک پر کمنٹ کرنا، ہر کھیل میں حصہ لینا۔زندگی کو بھرپور طور پر خوش خوش گزار رہی تھی۔میری منزل ابھی بہت دور تھی مجھے پڑھنے سے عشق تھا پڑھنا اور خوب پڑھنا میرا شوق۔مگر۔ابو نے تم کو میرے لئے پسند کر لیا۔انہوں نے میری خواہش کو کوئی اہمیت نہ دی۔اور میں اپنی کتابیں، اپنے بچپن کے شوق سب چھوڑ کر تمہارے گھر آ گئی۔

اماں ابا کی چاہت، شفقت اور تمہاری بھرپور توجہ نے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے کیا کھویا۔تمہیں پانے کی خواہش میں میں یہ بھول گئی کہ 'ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں'۔

سعدیہ، رافع اور پھر فارہہ کی آمد نے مجھے گھن چکر بنا دیا۔اماں اور ابا تو مجھے گھر لا کر ایسے مطمئن ہوئے کہ سعدیہ کی آمد کے بعد ہی حج کرنے کا ارادہ کر بیٹھے۔ان کے جانے کے بعد میری ذمہ داریاں بڑھ گئیں اس پر رافع کی آمد دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا سنبھالنا اور گھر کی صفائی ستھرائی کی فکر، کھانا پکانا اور ہر آئے گئے کی خاطر کرنا۔میں اتنی تھک جاتی کہ تمہاری آمد کے وقت تک مزاج میں جھنجھلاہٹ خود بخود آ جاتی۔کام

والی ماسی نے دیکھا کہ میں بچوں میں مصروف رہ کر اسکے کام کی طرف توجہ نہ دے سکونگی، صفائی میں جلدی، برتنوں کو دھونے میں لاپرواہی برتنی شروع کر دی تم ہمیشہ سے صفائی پسند۔تمہارا موڈ بھی بگڑنے لگا۔ذرا ذرا سے بات پر میرے اوپر خفا ہونا شروع کر دیتے۔

اپنے ہر کام کے لئے مجھے آواز دینا تمہاری عادت بن گئی تھی۔ہاں ابتداء میں مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔اگر کبھی تم آواز نہیں دیتے تو میں تم سے شکوہ کرتی۔مجھے تمہارے کام کر کے خوشی ہوتی تھی۔لیکن چند سالوں بعد میں تمہاری آواز سے بھی پریشان ہونے لگی۔بچوں کو دیکھوں، چولھا دیکھوں کہ تمہارے آواز دینے پر دوڑی کمرے میں چلی جاؤں۔اس بھاگ دوڑ میں کام خراب تو ہونے ہی لگے تھے۔تم کو آفس جانے میں دیر ہو جاتی اور کبھی تو تم صرف چائے کا ایک گھونٹ پینے کے بعد پیالی میز پر یونہی چھوڑ کر روانہ ہو جاتے۔تمہاری اس حرکت پر مجھے تکلیف ہوتی ،نمعلوم دن میں کب تک تم بھوکے رہو گے، میں سوچ سوچ کر کڑھا کرتی اور غصہ اپنے اوپر یا بچوں پر نکلتا۔کام والی بھی میرے غصہ کی زد میں آ جاتی۔دھیرے دھیرے مجھے تمہارے بھوکے جانے پر غصہ آنے لگا ہاں تم پر غصہ۔

ہماری لڑائی کی ابتداء بھی اسی سے ہوئی تھی تم کہتے'' مجھے تمہارا خیال نہیں''۔''میں جان بوجھ کر تمہارے وقت کا خیال نہیں کرتی''۔کبھی کہتے'' میں تم کو نظر انداز کرتی ہوں''۔ہماری لڑائی سے بچے بھی چڑچڑے ہو گئے ہر وقت ایک دوسرے کی شکایت لئے میرے سر پر کھڑے نظر آتے۔

بچوں نے اسکول جانا شروع کیا تو مجھے ذرا سکون ملا۔مگر۔ایک ذمہ داری اور بڑھ گئی، بچوں کا ہوم ورک کروانے کی۔رات کو سونے سے پہلے ان کے بیگ تیار کر کے رکھنا، اسکول کا یونیفارم پریس کر کے ہینگر میں لٹکانا بھی میری ڈیوٹی۔تم نے سجاد!! بچوں کے کاموں سے اپنا مقابلہ کر کے مجھے حیران کر دیا۔تمہارے بار بار کے کہے جملے مجھے پریشان کرنے لگے۔''کیوں اب بچوں کی تیاری کیسے فکر سے کرتی ہو۔میرے کام کے لئے تو تم کو تھکن کا احساس ہونے لگتا تھا۔''اور اگر کبھی بچوں کے کام میں کسی سبب سے کوتاہی ہو جاتی یا ہوم ورک پورا نہ ہونے پر اسکول سے شکایت آ جاتی تو پھر بھی میں قصوروار ٹھہرتی۔مجھے تو کہیں بھی جائے پناہ میسّر نہیں تھی۔اماں ابا کے انتقال کے بعد میں اور تنہا ہو گئی۔

کمر توڑ مہنگائی نے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے۔تم مجھ سے پہلے ہی دور ہو گئے تھے۔ایک روز تم نے دھماکہ کر دیا۔میں یہ نوکری چھوڑ کر دوبئی جا رہا ہوں۔

''اک دم۔کیسے یہ سب ہو گیا''۔میں نے گھبرا کر پوچھا۔''ہم اکیلے کیسے رہیں گے۔ابھی تو بچے چھوٹے ہیں''۔یہ سنتے ہی تم اک دم آگ بگولہ ہو گئے۔''احمق عورت۔بچے چھوٹے نہیں بڑے ہو گئے۔سعدیہ دسویں میں ہے، رافع نویں کلاس میں اور فارہہ آٹھویں کلاس میں پڑھ رہے ہیں۔مجھے بچوں کی شادی

کرنا ہے، تعلیم دلانا ہے۔ اپنی پوری کمائی تمہارے ہاتھ میں رکھ کر میں مطمئن تھا کہ کچھ تو پس انداز کیا ہوگا تم نے مگر۔ کیا ہے تمہارے پاس سوائے اس گھر کے۔ اب تم عیش کرنا۔ تم کو تو سکون نصیب ہوگا۔ میرا کیا ہے جی لونگا ___ اور سجاد تم چلے گئے۔

تمہارے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا تمہارا وجود ہم سب کے لئے کتنا اہم اور ضروری ہے۔ اب میری ذمہ داری اور بڑھ گئی گھر اور باہر سب مجھے ہی دیکھنا تھا۔ گھر سنورتا گیا اور میں بجھتی گئی تمہارے بغیر میں کتنی ادھوری ہوگئی تھی۔

پانچ سال بعد تم سعدیہ کی شادی میں آئے تھے میں تم کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی لوگ تو باہر جا کر سرخ و سفید ہو جاتے ہیں۔ ہشاش بشاش گھر آتے ہیں مگر تم وقت سے پہلے بوڑھے لگنے لگے۔ کمزور کتنے ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا یہ سب کس کی وجہ سے ہوا؟ ہاں میں ہی غلطی پر تھی میں نے تم کو بے سکون کر دیا۔ مگر مجھے اپنی ایسی کوتاہی نظر نہیں آئی کہ میں اپنے آپ کو مجرم قرار دیتی۔ ہم سب نے تم سے اصرار کیا کہ اب دوبئ سے واپس آجاؤ۔ تم کسی طرح بھی فوراً واپس آنے کے لئے راضی نہیں ہوئے۔ تمہارا کہنا بھی صحیح تھا کہ جب تک رافع کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی اسکو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے جسکے لئے تمہارا باہر رہنا ضروری ہے۔ آجکل پیسے کے بغیر نہ اچھی تعلیم مل سکتی اور نہ ہی پُرسکون زندگی گذاری جاسکتی ہے۔

تم چلے گئے۔ سعدیہ اپنے گھر کی ہوگئی اور میری تنہائی میں اضافہ ہوگیا، میں نے کتابوں میں سکون ڈھونڈنا چاہا مگر ___ کتابوں میں کتنی دیر کھو سکتی تھی۔ مجھے لگتا تم جیسے مجھے آواز دے رہے ہو اپنے کسی کام کے لئے۔ مگر تم تو مجھ سے کوسوں دور تھے۔ نظر کتاب سے ہٹ کر تمہارے فوٹو پر جا رکتی جو ہماری شادی کے بعد تم نے بہت شوق سے بڑا کر کے فریم کروایا تھا۔ اس میں تمہارے چہرے پر خوشی کے رنگ، آنکھوں میں پیار کے دیپ جلتے صاف نظر آرہے ہیں اور میرے چہرے پر شرم و حیا کے جذبات کے ساتھ ایک سکون بھی ہے۔ اب وہ سکون کہاں کھو گیا۔ میں سوچنے لگتی

رافع کے ایم بی اے کرنے کے بعد بچوں کی ضد پر تم واپس آگئے۔ کمزور کمزور سے، کھوئے کھوئے۔ اپنے آپ سے غافل۔ مگر میرے اور بچوں کے لئے متفکر۔ میں پشیمان ہوگئی، بچے پریشان ہوگئے۔ میری تیمارداری محبت اور پشیمانی نے تم کو صحت کی طرف لوٹنے میں مدد کی، تو بچوں کی محبت اور شوخ و شریر چہل پہل نے تمہارے دل و دماغ کو خوشگوار احساس سے بھر دیا۔ تم میں زندگی سے دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔

میں سرخرو ہوگئی تم نے میری ذمہ داریوں کو سمجھا اور ان کے بہتر طریقہ پر نبھانے کے لئے مجھے سراہا۔ مجھے تو تمہاری خوشی تمہارے اطمینان کی ضرورت تھی تمہاری محبت کی نظر ہی میرا انعام ٹھہرا۔

ہمارا گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا سعدیہ کے بچے جب آجاتے گھر میں کلیاں چٹکنے لگتیں، تمہارے

چہرے پر گزرا زمانہ لوٹ آتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے سعدیہ اور رافع کے ساتھ تم مصروف ہو جاتے تھے۔ فارہہ کے آتے آتے تمہارا موڈ تبدیل ہوگیا تھا۔ آج بھی فارہہ تم سے لاڈ بھرا شکوہ کرتی ہے 'پاپا کو مجھ سے بالکل محبت نہیں بس باجی اور بھائی سے ہے''۔ تم بڑھ کر اسکو گلے لگا لیتے اور کبھی پیشانی چوم لیتے ہو، فارہہ کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اسے معلوم ہے تم اس سے بہت محبت کرتے ہو۔

رافع کو بہت اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اور تمہاری خوشی دیدنی تھی میں اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ تم نے بڑے مان سے کہا تھا اب رافع اور فارہہ کی شادی کی تیاری کرو۔ گھر میں کچھ چہل پہل ہونا چاہئے۔

رافع نے میری پسند پر اطمینان کا اظہار کیا۔ میں اور فارہہ اس مہم کا آغاز کرنے کی فکر میں تھے کہ رافع کو کمپنی کی طرف سے ایک کشادہ اپارٹمنٹ رہائش کے لئے دیا گیا۔ آج ہم اسی اپارٹمنٹ میں اپنی پہلی رات گزارنے کی تیاری کر رہے تھے جو فارہہ نے تالاب میں روشنیوں کا عکس دیکھ کر مجھے آواز دے لی تھی۔

کیا سوچ رہی ہو' نادی' سجاد کی آواز پر میں چونک اُٹھی۔ 'جی بس ایسے ہی کھڑی تھی' میں نے گھبرا کر کہا۔ ایسا نہ ہو سجاد کا دل میری سوچ سے دکھ جائے۔

'سامنے دیکھ روشنیاں کیسی جھلملا رہی ہیں اس اندھیرے کو ختم کرنے میں اس روشنی کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ ہماری زندگی سے سخت دھندلاہٹ اس روشنی نے ختم کر دی بس اب سورج کی روشن کرنوں کا انتظار ہے' سجاد نے مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

'انشاء اللہ رافع' فارہہ اور سعدیہ کی فیملی ہمارے اُبھرتے سورج کی کرنوں سے روشن روشن بہت تابناک ہوگی' میں نے بہت اطمینان اور سکون سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اسی وقت رافع اور فارہہ نے ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں قید کر لیا۔ سجاد کی مسکراہٹ خوش آئند زندگی کی نوید دے رہی تھی۔ میرے ساتھ رافع اور فارہہ بھی مسکرانے لگے۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضیہ حامد کی ادبی شناخت ابتدائی دور میں ایک شاعرہ کی حیثیت سے تھی لیکن وہ اس پُر پیچ اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر جانے کے بجائے جب ایک دوراہے پر پہنچیں تو بہت تیزی کے ساتھ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی اور اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ راستہ شاید انہیں خوش نہیں آئے گا اور انہوں نے اپنی راہ تبدیل کرتے ہوئے نثر نگاری کو اپنے افکار، خیالات، تجربات اور مشاہدات کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہوئے افسانہ نویسی کا آغاز کیا اور بہت کم عرصے میں اپنے افسانوں کی پہلی کتاب ''لمحوں کا سفر'' اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کی جس کی مشاہیر نے خاطر خواہ پذیرائی کی اور ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کی۔ (**عشرت قادری** کے مضمون سے اقتباس)

ڈاکٹر رضیہ حامد

سہارا

ٹی وی پر خبریں آ رہی تھیں فیروز کا کا نے شہر میں ہو رہے لوٹ مار اور فساد کی خبریں سنتے سنتے اپنی بہو کو اپنے آس پاس دیکھا۔ وہ آس پاس دکھائی نہیں دی تو آواز دیکر پوچھا بہو اکمل ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ اس کے آنے کا وقت تو ہو گیا۔ جی۔ بابا۔ آتے ہونگے۔ شاید راستے میں کوئی مل گیا ہوگا۔ میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں۔ نیلم نے جواب دیا۔

ہاں بیٹی۔ سکھی رہو۔ اس وقت چائے کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ بچے ببلی اور بابی کدھر چلے گئے۔ فیروز کا کا نے اپنے پوتا اور پوتیوں کو سامنے نہ دیکھ کر فکر مندی سے پوچھ لیا۔ اور کہا۔ بہو۔ ذرا دھیان رکھا کرو۔ آجکل بچے بہت غائب ہو رہے ہیں۔ یہ ٹی وی بڑی بڑی خبریں دیا کرتا ہے۔ کئی طرح کے فسادی گروہ شہر میں آ گئے ہیں ایسی خبر ہے۔

ببلی پڑوس میں بچوں کو پڑھانے گئی ہے گڑیا اور بابی باہر کھیل رہے ہیں۔ نیلم یہ کہتی ہوئی چائے بنانے چلی گئی۔

اکمل نے گھر میں داخل ہوتے ہی چاء کی خوشبو محسوس کی تو فوراً نیلم کو پکار کر بولا کہ میری چائے بھی بابا کے پاس ہی لے آؤ اور تم بھی چولھا بند کر کے آ جاؤ کچھ بات کرنی ہے۔

''آ گیا میرا بیٹا۔ جگ جگ جیو''۔ اکمل کے سلام کا جواب دیتے ہوئے فیروز کا کا نے اسکو دعا دی اور پوچھا۔ آج بڑی دیر کر دی راستے میں کوئی گڑ بڑ تو نہیں تھی؟؟

بابا۔ آج لوکل میں دینو کا کا مل گئے تھے۔ وہ میرے ساتھ ہی اترے تو پلیٹ فارم پر ہی ہم لوگ کھڑے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ دینو کا کا ببلی کے لئے کسی لڑکے کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ ببلی کی شادی کرنے کا کب تک ارادہ ہے میں نے ان کو کہا کہ کوئی بھلا۔ شریف۔ کماؤ لڑکا ملے گا تو ہم ببلی کی شادی جلد کر دیں گے۔ مگر کا کا ہماری حالت تو آپ کو معلوم ہے جہیز کے نام سے ہم تھوڑا بہت ہی کر سکیں گے۔ بابا۔ میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ ابھی ہمارے دو چھوٹے بچے اور ہیں جو اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اکمل نے بابا کے پاس چائے پینے کے لئے بیٹھتے ہوئے کہا

'سنو ببلی کے پاپا۔ لڑکا اچھا ہو تو اک دم منع مت کرنا۔ ہم کہیں سے ادھار لے لیں گے اور بابا۔ اگر آپ صحیح سمجھو تو یہ مکان گروی رکھدیں گے۔ دھیرے دھیرے چھڑا لیں گے، نیلم نے آگے تک کا پلان بتایا۔

'نا۔ نا۔ بہو۔ مکان گروی رکھنے یا بیچنے کی مت سوچنا۔ سر پر اپنی چھت ہے بھلی بری جیسی ہے، اپنی تو ہے۔ ہم روکھی سوکھی کھاتے ہیں گروی رکھنے کے بعد ہر مہینہ اسکی قسط کہاں سے ادا کریں گے اور پھر سود بڑھتا جائے گا۔ نا۔ بابا۔ ایسا نہیں کرنا۔ پہلے اکمل سے لڑکے کے بارے میں پوچھ تو لینے دے۔

ہاں تو اکمل تو بتا۔ دینو نے کیا بتایا۔ لڑکا کیا کرتا ہے؟ کیسا ہے؟ اور کہاں تک پڑھا ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ فیروز کا کا نے تفصیل جاننا چاہی۔

بابا۔ یہیں بمبئی میں رہتا ہے۔ بی۔ کام پاس ہے کسی دوکان سے مال اُٹھا کر گھروں گھر جا کر بیچتا ہے۔ آگے اپنا بزنس شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ دینو کا کا بتا رہے تھے کہ اس کے بابا نے اس سے کہہ دیا ہے کہ ہم نے تم کو پڑھا دیا اب تمہاری بیوی جو لائے اس سے بزنس کرنا۔ محنت کرنا اور عیش کرنا۔ ہم سے مت مانگنا!!۔

بابا۔ میں تو دینو کا کا کی بات سن کر سکتہ میں رہ گیا۔ جب انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ 'بولو ان لوگوں کو ببلی کا بتا کر تیرے گھر بھیج دوں؟ اپنی ببلی اتنی سندر ہے۔ میں نے سوچا لڑکا محنتی ہے۔ گبرو جوان ہے۔ آگے ترقی کرے گا دونوں سکھی رہیں گے'۔ اکمل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

آپ نے یہ سب سن کر انکو آنے سے روک تو نہیں دیا۔ نیلم نے بے صبری سے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ بابا سے پوچھ کر دو اک روز میں بتاؤنگا۔

بابا آپ بتائیں میں ان کو کیا کہوں؟ دینو کا کا لڑکے کی بہت تعریف کر رہے تھے مگر جہیز کے نام پر بزنس کے لئے پیسہ ___ اتنا روپیہ ہم کہاں سے لائیں گے پھر شادی میں جو خرچ ہوگا وہ الگ۔ اس سب کے باوجود شادی تو کرنا ہے۔ ببلی کی عمر زیادہ ہو گئی تو کوئی آئے گا بھی نہیں۔ اگلے مہینہ انیس سال کی ہو جائے گی۔ اکمل نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

تو فکر مت کر سب ٹھیک ہو جائے گا پہلے ان لوگوں کو آنے تو دو شادی اکدم تو نہیں ہو جاتی سال چھ ماہ کی مہلت تو ملتی ہی ہے۔ چل اُٹھ تھکا ہارا آ رہا ہے۔ نہا لے۔ تازہ دم ہو جائے گا۔ ببلی بھی ٹیوشن پڑھا کر آتی ہوگی۔ تیری ماں تو تیرہ سال کی تھی جو بیاہ کر آئی۔ تیرے لئے بھی ایسی ہی دلہن ڈھونڈتی تھی میں نے منع کر دیا کہ کچھ پڑھنا لکھنا بھی آتا ہو لڑکی کو ایسی بہو تلاش کر۔ شکر ہے کہ نیلم اُسکو پسند آ گئی اور اس نے آٹھ جماعت تک پڑھا بھی ہے۔ بس پھر کیا تھا جھٹ شادی کر کے بہو لے آئے۔ اور دیکھ اِسی کی وجہ سے آج ببلی نے بارہ جماعت تک پڑھ لیا۔ تو نے دیکھا گھر کی لکشمی کا پڑھا لکھا ہونا کتنے فائدے دیتا ہے۔ زندگی میں کئی موڑ آتے ہیں۔ علم کی روشنی راستے کی دشواری کو آسان بنا دیتی ہے۔ فیروز کا کا نے تعلیم کی اہمیت بتاتے ہوئے اچھی خاصی تقریر کر دی۔

نیلم مسکراتی ہوئی کھانا بنانے اُٹھ گئی اور اکمل آگے کی زندگی کے بارے میں سوچتا ہوا اُٹھ گیا۔

دینو کا کا کو اکمل کے جواب کا انتظار تھا۔ انہوں نے فوراً لڑکے کے والد بابر مرزا کو فون سے سب بتا دیا اور اکمل کے گھر آنے کے لئے تاریخ اور وقت مقرر کرنے کے بعد اکمل کو بتا دیا۔ اکمل نے دینو کا کا کو بھی اُس روز اپنے گھر آنے کے لئے کہا۔

نیلم اور ببلی نے مل کر گھر صاف کیا۔ گھر کیا تھا بس ایک بیڈروم فلیٹ اس کا ڈرائنگ روم تھوڑا بڑا اور کھلا کھلا تھا جس میں ایک طرف فیروز کا کا کے لئے دیوان ڈال کر بستر لگا دیا تھا۔ اچھے وقتوں میں فیروز کا کا نے اپنے گاؤں والی زمین بیچ کر بمبئی میں یہ فلیٹ خرید لیا تھا۔ نیلم نے احتیاط سے رکھی اپنے جہیز میں ملی پھولدار چادر و غلاف نکال کر دیوان پر بچھائی اور تکیئے پر غلاف چڑھا دیئے، صوفے کے کشن ببلی اور نیلم نے مل کر کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے تھے وہ بھی کبھی کسی مہمان کی آمد پر نکال کر چڑھائے جاتے تھے۔ ان کو نکال کر کشن پر چڑھا دیئے۔ کمرے میں دیوار پر لگے کارنس پر مصنوعی پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ بس کل یہی سجاوٹ تھی پھر بھی کمرہ اچھا لگ رہا تھا۔

اپنے بتائے ہوئے وقت پر بابر مرزا اپنے بیٹے بشر کے ساتھ آ گئے اور دینو کا کا بھی اسی وقت پہنچے۔ فیروز کا کا کو بشر پسند آ گیا۔ اور بابر مرزا کو ببلی بھی اچھی لگی۔ بشر بھی بار بار سب کی نظر بچا کر ببلی کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ یہ کہہ کر چلے گئے کہ بشر کی ماں کو بخار آ گیا ہے اس لئے وہ نہیں آ سکی اُس سے بات کر کے آپ کو جواب دیں گے۔ ہمیں تو آپ کی ببلی پسند آئی ہے۔ نیلم اور اکمل ببلی کو دیکھ کر مسکرا دیئے ببلی جھینپ کر کچن میں چلی گئی۔ فیروز کا کا کے چہرے پر فکرمندی کی لکیریں واضح ہو گئیں تھیں۔

ہفتہ دس دن بعد دینو کا کا نے بتایا کہ بابر مرزا اور انکے گھر والے یہ رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں کہ کس دن آ کر لڑکی کو شگن کی مٹھائی کھلا دیں اور انگوٹھی پہنا دیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کچھ شرائط بھی رکھی ہیں۔ اکمل نے فوراً ان کی بات کاٹ کر کہا کہ کا کا آپ کو تکلیف تو ہوگی گھر آ جاؤ تو بابا کے سامنے تفصیل سے بات کر کے اُسی وقت آپ کو جواب دے دیں گے۔

اچھا تو پھر ٹھیک ہے میں اتوار کو آؤنگا۔ چھٹی بھی ہے اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ دینو کا کا فوراً راضی ہو گئے۔

اکمل کا دل یہ سن کر خوش ہوا کہ ببلی ان کو پسند آ گئی اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکنیں یہ سن کر بے ترتیب ہو گئیں کہ ببلی کی شادی کرنے کے لئے کچھ شرطیں بھی ماننی ہونگی۔

اتوار کو دینو کا کا صبح ہی صبح اکمل کے گھر آ گئے۔ چائے ناشتہ کے بعد بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ دینو کا کا نے بتایا کہ بابر مرزا نے کہا ہے کہ لڑکے کو جوڑے کے نام سے دو لاکھ روپئے دیئے جائیں۔ اس کے علاوہ اپنی لڑکی کو وہ جو دینا چاہیں دیں۔ گھر کا سامان تو آجکل سب ہی دیتے ہیں اس سلسلہ میں انکی کوئی مانگ نہیں ہے۔ دوسری شرط یہ ہے وہ تھوڑے باراتی لائیں گے بارات کا کھانا اچھا اور سب باراتیوں کو کوئی اچھا تحفہ

بھی دیا جائے۔ بس اور کوئی شرط نہیں ہے۔ دینو کا کا نے اپنی بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔

بھائی دینو۔ لڑکی کی شادی۔ اتنی گمبھیر مسئلہ کیوں بنتی جا رہی ہے۔ ہماری تمہاری بھی شادیاں ہوئیں۔ بہنوں کی بھی شادیاں ہوئیں۔ مگر اب زمانہ کا چلن ہی بدل گیا۔ سب سے پہلے بارات اور باراتیوں کی بات کو لیں۔ ان کی بھلی مانسی ہے کہ کم باراتی لانے کی بات کرتے ہیں۔ وہ باراتی زیادہ لے آئیں کھانا سب کو کھلا دیں گے۔ تم تو ہمارے اپنے ہو تم سے کیا پردہ، بارات کے کھانے کے لئے گھر میں کھانے کی چیز الگ الگ وقت میں خرید کے رکھ لیں گے صرف پکوانے کا خرچ اس وقت آئے گا۔ مگر تحفے تو سب کو ایک جیسے دینا ہیں وہ الگ الگ نہیں خریدے جا سکتے۔

بھائی لڑکے کو جوڑے کے لئے دو لاکھ کی بات میرے گلے نہیں اُتر رہی۔ ہم لڑکی کو زیور کپڑا، برتن بھاڑے دیں گے۔ ہاں بجلی کا بڑا سامان ہم نہیں دے سکیں گے۔ مگر لڑکے کو اسکوٹر سلامی میں دے دیں گے۔ حالانکہ ہمارے لئے وہ بھی بڑی بات ہوگی۔ فیروز کا کا نے اپنی معاشی حالت کے پیش نظر ذرا تفصیل سے گفتگو کی۔

بھائی فیروز تم صحیح کہتے ہو۔ مگر کیا کیا جائے بابر مرزا کسی طرح کم کرنے پر تیار نہیں۔ میں پہلے ہی کوشش کر چکا ہوں۔ دینو کا کا نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

بھیا دینو۔ چل ایسا کرتے ہیں ہم تم مل کر ان سے اس سلسلہ میں بات کرتے ہیں۔ میں ان سے گزارش کرونگا، اپنی پریشانی بتاؤنگا۔ شاید مان جائیں۔ تو پھر کوئی دن طے کر لیں کب چلنا ہے۔ لوکل ٹرین پکڑ کر میں اِدھر سے آ جاؤنگا تم اپنے دفتر سے تھوڑا پہلے اُٹھ کر اُدھر ہی آ جانا۔ واپسی دنوں کی ساتھ ہو جائے گی۔ فیروز کا کا نے مسئلہ کو طے کرنے کا پختہ ارادہ ظاہر کیا۔

دینو کا کا نے دو دن بعد جانا طے کیا۔ تھوڑی دیر باتیں کر کے وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نیلم اور اکمل نے کہا کہ ہم دونوں بھی آپ کے ساتھ چلیں مگر فیروز کا کا نے انکو منع کرتے ہوئے کہا کہ۔ نہیں۔ مجھے اکیلے جانے دو۔ میں ببلی کی شادی اُسی لڑکے سے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھ سے جو کچھ بن پڑا کرونگا۔ وہ بھلے لوگ ہیں۔ میری بات سن کر کچھ تو سوچیں گے۔ ہم اپنا جگر کا ٹکڑا دے رہے ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا ہے۔ تم مطمئن رہو اور اپنا کام کرتے رہو۔ فیروز کا کا کی باتوں سے نیلم کو کافی تسلی ہوئی۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق دینو کا کا نے جانے کی تیاری کی سفید کلف لگا کرتا، پاجامہ پہنا جو انہوں نے خاص خاص موقع کے لئے ابھی سلوایا تھا۔ ان کے پاس ایک انگوٹھی رکھی رہتی تھی جسکو وہ کوئی مہم پیش آتی جب ہی پہنتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انگوٹھی ان کے لئے مبارک ہے۔ نیلم سے بولے بہو ذرا میری انگوٹھی تو الماری میں سے نکال کر دے دو۔ آج تو اس مسئلہ کو حل کرنا ضروری ہے ورنہ وہ لوگ کہیں اور لڑکی ڈھونڈ نے لگے تو بڑی پریشانی ہو جائے گی۔

نیلم نے جلدی سے جا کر بڑے سے سفید نگ والی انگوٹھی انکو لا کر دے دی جو انہوں نے فوراً پہن لی۔

سب بچوں کو پیار کر کے گلے لگا کر دعائیں دیں۔ ببلی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے ببلی تیرے لئے تو میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی پینشن بیچ دونگا۔ تو بس دعا کر یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے۔ سکھی رہے میری بچّی۔ یہ کہہ کر ببلی کی پیشانی پر پیار کر کے فیروز کاکا روانہ ہو گئے۔

فیروز کاکا کے جانے کے تھوڑی دیر بعد پڑوس کا ایک بچہ بھاگا ہوا آیا۔ اس نے بابی کو بتایا کہ بمبئی میں لوکل میں بم دھماکے ہوئے ہیں۔ تم اپنا ٹی وی تو کھولو۔ نیلم نے سنا تو گھبرا کر ٹی وی کی طرف دوڑی۔ ابھی تو بابا ٹرین میں ہی ہونگے۔ اکمل کے آنے کا بھی وقت نزدیک ہے کیا ہوگا؟ خبروں کے سننے کا ہوش کہاں۔ بچوں کو گھر میں رہنے کا کہہ کر نیلم قریب کے اسٹیشن پہونچی۔ وہاں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ زخمیوں کو اسپتال لے جایا جا رہا ہے اور جو گ مر گئے ان کی لاشیں بھی اسپتال پہنچ رہی ہیں۔ نیل روتی ہوئی اسپتال پہنچی کیونکہ جس ٹرین کو حادثہ ہوا تھا اسی میں تو فیروز کاکا کو سفر کرنا تھا۔ اسپتال پہنچ کر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ مرنے والوں کے ورثاء کو حکومت ابھی ۲۵ ہزار روپیہ دے گی اور بعد میں ۵ لاکھ دینے کا علان کیا ہے۔ زخمیوں کو ۴۰ ہزار روپیہ دینے کا اعلان ہوا ہے۔

نیلم حیران پریشان ایک ایک زخمی کے پاس جا کر دیکھ رہی زیادہ تر لوگوں کے چہرے اور پیر زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ ایک جگہ نیلم رک کر کھڑی ہو گئی سفید کرتا پاجامہ پہنے ایک شخص شدید زخمی ہوا تھا خون زیادہ بہنے کی وجہ اسکا چہرہ پہچان میں نہیں آ رہا تھا مگر ہاتھ میں انگوٹھی ___ نیلم ٹھٹھک گئی۔ کچھ دیر سوچا اور بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اُتار لی اور آگے بڑھ گئی۔ دوسرے مریضوں کے پاس لوگ آ جا رہے تھے۔ کوئی کسی کی گھڑی اُتار رہا تھا، جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ شاید وہ ان کے رشتہ دار ہوں، یا پھر نفس سے مجبور ___ بے حس لوگ۔ نیلم جو بے حد حساس، ہمدرد کہی جاتی تھی اس کا شمار بھی اس وقت انہیں لوگوں میں ہو گیا۔

نیلم نے مردہ گھر میں جا کر ان لاشوں میں سے سب سے خراب لاش کو فیروز کاکا کی لاش قرار دے کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر اور اسپتال کے عملے نے تسلی دلاسہ دیا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جایا جا چکا تھا کہ اکمل پریشان اسپتال پہنچا۔ نیلم کو روتا پیٹا دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہونے لگے نیلم۔ بابا۔ بابا کہاں ہیں۔ تم بولتی کیوں نہیں۔ اکمل نے نیلم کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

بابا۔ ہائے۔ بابا۔ ہمارے لئے شہید ہو گئے۔ ببلی کی خوشی کے لئے انہوں نے اپنی جان دیدی۔ ببلی کے پاپا۔ ہم اکیلے رہ گئے۔ نیلم زاروقطار روتی ہوئی بولی۔ اکمل وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

پوسٹ مارٹم کے بعد لاش انکے سپرد کر دی گئی۔ حکومت کی طرف سے اکمل کو اسپتال میں ہی ۲۵ ہزار روپیہ نقد دیئے گئے۔ مرنے والوں کے وارثین کو لاش دینے کے ساتھ ہی امدادی رقم دی جا رہی تھی۔ محلّہ میں کہرام مچ گیا۔ فیروز کاکا سب کے بہت ہمدرد تھے۔ نیلم نے روتے ہوئے بتایا کہ بم دھماکہ میں لوگ کیسے کیسے بری حالت میں اسپتال میں پڑے تھے ان کے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ فیروز کاکا کو وہ صرف ان کی انگوٹھی کی وجہ سے پہچان پائی۔ نیلم انگوٹھی کو بار بار چومتی اور روتی جاتی تھی۔

اکمل بڑا بے چین تھا کئی مرتبہ زخمیوں کو دیکھنے اسپتال گیا۔ نیلم بھی ایک مرتبہ ضد کر کے اس کے ساتھ اسپتال گئی مریضوں کے لئے پھل بھی لے گئی۔ گھومتے گھومتے ایک پلنگ کے پاس رک کر اکمل نے نیلم کو بتایا کہ یہ مریض مجھے بابا جیسا لگتا ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں میں کانچ کے باریک باریک ریزے چبھ جانے کی وجہ سے آنکھوں کی روشنی ختم ہو گئی۔ زبان دانتوں کے بیچ آ کر زخمی ہو گئی تھی۔ بہت زیادہ زخمی ہونے کی وجہ سے اسکا چہرہ بگڑ گیا۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اب یہ شخص دیکھنے۔ سننے اور بولنے سے محروم رہے گا۔ دھماکے کی وجہ سے اس کے کان بھی متاثر ہوئے ہیں۔ نیلم نے دکھ کا اظہار کیا اور اپنے پاس سے لائے ہوئے پھلوں کے عرق کی ایک تھیلی وہاں رکھ کر آگے بڑھ گئی۔ پھر بولی

ببلی کے پاپا۔ ان زخمیوں کے گھر والے تو آتے ہونگے۔ ہاں آتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا مگر ان بوڑھے بابا کے پاس کوئی نہیں آتا۔ اکمل نے دکھ سے کہا۔

تو پھر۔ یہ کہاں جائیں گے۔ نیلم نے فکر کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ بوڑھوں کے گھر ''سہارا'' کے سکریٹری آئے تھے ایسے لوگوں کو جن کا کوئی نہیں وہ 'سہارا' لے جا کر رکھیں گے، ان کی دیکھ بھال کریں گے۔ حکومت ان کا خرچ اُٹھائے گی۔ اکمل نے دکھی دل سے کہا

'چلو پھر ٹھیک ہے۔ نیلم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ میں سوچتی تھی انکو اپنے گھر لے چلیں۔ بابا سمجھ کر رکھ لیں گے مگر۔ 'سہارا' میں جو آرام ملے گا وہ ہمارے گھر کہاں۔ نیلم نے دردمندی کا اظہار کیا۔

پگلی ہے تو تو۔ دوسروں کے لئے پریشان ہو رہی ہے ہم کہاں سے ان کی خدمت کرینگے۔ بابا کی بات دوسری تھی۔ پھر ان کی پینشن بھی تھی۔ وہ بچوں کا خیال رکھتے تھے۔ یہ بیچارہ تو خود مجبور ہے۔ ہم کیا کسی کو سہارا دیں گے۔ بابا کے جانے سے گھر سونا ہو گیا۔ اکمل افسردہ ہو گیا۔

ہائے بابا۔ نیلم نے ماتھا پکڑ کر بابا کو یاد کیا۔

ببلی کے پاپا۔ بابا کہا کرتے تھے کہ ببلی مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے اُس روز بھی جاتے وقت کہہ رہے تھے کہ 'ببلی تیرے لئے میرا دل بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ اور جاتے وقت ایسا کر گئے کہ ببلی کی شادی ان کی مرضی کے مطابق اب آسانی سے 'بشر' کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔ بس حکومت کے پیسہ دینے کی دیر ہے۔ ہائے۔ بابا۔ تم نے ہمیں کس طرح 'سہارا' دیا۔ ہمیں تو تمہارا سہارا بننا تھا۔ تم خاموش چلے گئے۔ نیلم اپنے بچوں کو لپٹا کر رو رہی تھی اور اکمل سوچ رہا تھا۔ بابا۔ مجھے ایسے پیسے ببلی کی شادی کے لئے نہیں چاہئے تھے۔ آپ ساتھ ہوتے ببلی کی شادی بھی کہیں نہ کہیں ہو جاتی اب آپ کی کمی میری زندگی میں ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ ہم صرف آپ کے لئے دعا کر سکتے ہیں جو کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

ماہیے امین خیال۔لاہور

نیناں کھوئے کھوئے
کئی دل لے ڈوبے
ترے گالوں کے ٹوئے

آنکھوں میں کاجل ہے
دل کو بچا رکھنا
بجلی سنگ بادل ہے

رنگ اس کے پیارے ہیں
چندا جیسی کے
پیروں میں تارے ہیں

اس دل میں سمائی ہے
جیون کے مندر کی
جو مورت بھائی ہے

کوئی اس کے تول نہیں
اکھ مستانی ہے
زلفوں کا مول نہیں

گل گُرتا جالی کا
نخرہ قیامت ہے
اس موتیوں والی کا

آ دل میں کر ڈیرا
تیری اداؤں پر
دل جھوم اُٹھا میرا

ہونٹ اس کے گلابی ہیں
جانِ بہاراں کی
آنکھیں بھی شرابی ہیں

وہ کتنا سندر ہے
بھیگا بدن اُس کا
خوشبو کا سمندر ہے

دل اپنا ہار دیا
آنکھ کے کہنے پر
گوری پہ وار دیا

کچھ کاجل بہہ گیا ہے
روتی آنکھوں کا
اک منظر رہ گیا ہے

کب دل پر ہے قابو
مارہی ڈالے گا
ان آنکھوں کا جادو

گالوں کی لالی ہے
موری سجنیا کی
ہر بات نرالی ہے

چہرہ وہ دمکتا ہے
اس کے مقابل میں
کب چاند چمکتا ہے

کب بات یہ گوڑی ہے
چاند کہاں ہے یہ
تری ٹوٹی چوڑی ہے

محبوب وہ کیسا ہے
اکھیاں مدھ بھریاں
رنگ چندن جیسا ہے

بگڑے ہوئے تیور ہیں
نخرے والی کے
سب ناز ہی زیور ہیں

سرکنڈے ڈھابوں کے
جھیل سی آنکھوں میں
پر ہیں سرخابوں کے

ماہیے امین خیال

کیا ماہیے ڈھولے ہیں
مکھ مہتاب ترا
اور نین مولے ہیں

اک بات بتا جوگی
دل سے دعا نکلی
منظور نہ کیوں ہوگی

ہم سے بھی کہا ہوتا
مفت میں مل جاتا
دل ہم سے لیا ہوتا

ان سا نہ حسیں دیکھا
ہم نے نگران کو
جی بھر کے نہیں دیکھا

دل ایک پیالا ہے
تیری محبت سے
اس کو بھر ڈالا ہے

سرکار! نہیں ہوگا
جان بھی مانگو تو
انکار نہیں ہوگا

تو ہر دَم شادر ہے
تیری آنکھوں کا
کاجل آبادر ہے

کہتی ہے سہیلی کو
سردی لگتی ہے
راتوں میں اکیلی کو

کاجل، غازہ، لالی
چاندنے اوڑھی ہے
چنری تاروں والی

سب روپ، پری جیسا
رنگ اُس گوری کا
ہے تازہ گری جیسا

تن من تاراج کرے
روگ ہو چاہت کا
پھر کون علاج کرے

انکار نہیں بھاتا
عشق میں جان دینا
بے کار نہیں جاتا

رہنے دے دور مجھے
بخشا محبت نے
وہ غم کا شعور مجھے

بل کھاتی دھارا ہے
زلفِ پریشاں کا
اپنا ہی نظارا ہے

گو چاند کا ٹوٹا ہے
پرکھا، جانا ہے
وہ دل کا کھوٹا ہے

میں دیپ ہوں تو باتی
دیکھتے ہی تجھ کو
ہوجاتا ہوں جذباتی

گو چاند کا ہالا ہو
وہ کیا گوری ہے
دل جس کا کالا ہو

گھر میرے آئے ہیں
صدقے جاؤں میں
سنگ خوشیاں لائے ہیں

ماہیے نذیر فتح پوری

(پونہ)

کیا ٹھاٹ ہیں شاہانہ
رہتے ہیں دھرتی پر
پربت سے ہے یارانہ

معتوب نہیں کرنا
سچ کے محافظ کو
مصلوب نہیں کرنا

ہر آنکھ ہے نم، کیا ہے
جس پہ سبھی روئیں
سوچو تو وہ غم کیا ہے

کاغذ پہ نظر بھی رکھ
حرف شناسی کا
تھوڑا سا ہنر بھی رکھ

امکان کو روشن رکھ
گھور اندھیروں میں
ایمان کو روشن رکھ

پامال خیالی سے
دور سدا رہنا
لفظوں کی جگالی سے

ہر وار سے ہٹ کر ہے
معرکہ اپنا تو
تلوار سے ہٹ کر ہے

زردار سے ہٹ کر ہے
پیار کی قیمت تو
بازار سے ہٹ کر ہے

مطلب کے جو بندے ہیں
شہہ پہ ہواؤں کے
رُخ اپنا بدلتے ہیں

موسم کے ستم سہنا
کام غریبوں کا
ہر حال میں خوش رہنا

کیا ساز بجاتی ہے
گیت بہاروں کے
جب بوند سناتی ہے

سچائی سے ٹکرانا
خواب کے جھولوں سے
اترو تو چلے آنا

آنا تھا، نہ آیا ہو
بھول گیا شاید
وہ وعدۂ فردا کو

جو تیرا دوانہ ہو
اس کا کسی دن تو
جنگل میں ٹھکانہ ہو

ہر لفظ رواں لکھو
درد کا افسانہ
لکھو تو جواں لکھو

بیٹھے ہو کناروں میں
ڈوب نہیں جانا
گہرائی کے دھاروں میں

جب نیند ہمکتی ہے
آنکھ میں سپنوں کی
پازیب چھنکتی ہے

کیسی ہے ہوا سمجھو
خوشبو کے جھونکے سے
موسم کی ادا سمجھو

ماہیے افضل چوہان

(مظفرگڑھ)

پنگھٹ پہ اُداسی ہے
لب بھی ہیں تشنہ سے
میری دید بھی پیاسی ہے

ندیا میں باڑ آئی
فصلیں گاؤں کی
اک پل میں اجاڑ آئی

کچھ خواب بنے ہونگے
پیار کے افسانے
تم نے بھی سنے ہونگے

دن بھر وہ سوتا ہے
کیا دکھ ہے اس کو
شب بھر کیوں روتا ہے

ہر شخص یہ کہتا ہے
گاؤں کے پیپل میں
بڑا سانپ اک رہتا ہے

چٹھی جو نہیں آئی
رونے کو گوری
اب ڈھونڈے ہے تنہائی

کیوں ساگ پکایا ہے
اس کے آنے کا
سندیسہ آیا ہے

میں کھاٹ پہ سو آیا
وہ کشتی پہ نہ تھی
میں گھاٹ سے ہو آیا

تندور جلانا ہے
ایندھن گیلا ہے
کھانا بھی پکانا ہے

وہ لے میں گاتا ہے
گوری کے آنے پر
سنگیت سناتا ہے

خوابوں میں کھو جانا
عادت بن گئی ہے
روتے ہوئے سو جانا

آنکھیں ہیں نم گوری
بیٹھے ہیں مدت سے
تیری آس میں ہم گوری

روگی بے چارہ ہے
چُپ اور تنہا سا
فرقت کا مارا ہے

چنگیر پُرانی ہے
ہیر سنا جاؤ
یہ عشق کہانی ہے

رانجھا اک جوگی ہے
ہیر کا کہنا ہے
یہ پیار کا روگی ہے

تالاب ہے پانی کا
بھول نہیں سکتا
میں دور جوانی کا

پائل نہیں پاؤں کی
کاٹتی رہتی ہے
ویرانی گاؤں کی

چوپال ہے گاؤں کی
ٹھنڈک کتنی ہے
برگد کی چھاؤں کی

ماہیے   افضل چوہان

دستک کوئی دیتا ہے
آج بھی دل اپنا
نام اس کا ہی لیتا ہے

راتوں میں، اجالوں میں
ڈھونڈتے ہیں اس کو
اپنے ہی خیالوں میں

میری آنکھ کے منظر میں
تیرے بن جیسے
طوفان سمندر میں

کنگن ہیں کلیّا کے
گوری رہتی ہے
اُس پار تلیّا کے

کوئل نہیں بولے گی
قول کی پکی ہے
کبھی راز نہ کھولے گی

لڑکوں کی ٹولی ہے
چُپ تھی مدت سے
پھر آج کیوں بولی ہے

پیپل کا رستہ ہے
ابرِ کرم! تھم جا
گھر میرا خستہ ہے

خاموشی گاؤں کی
توڑ نہ دے گوری
پائل تیرے پاؤں کی

مٹی کے کھلونے ہیں
قد آور کیا ہوں
وہ لوگ جو بونے ہیں

برگد تلے نلکا ہے
تم کیا لے بیٹھے
وہ قصہ جو کل کا ہے

بلی میری نانو کی
بچوں کو پیاری تھی
گڑیا کبھی بانو کی

ہم شہر نہیں جاتے
لوگ وہاں جا کر
واپس ہی نہیں آتے

کرنال میں کیتھل ہے
بستی سے آگے ہی
اک بانس کا جنگل ہے

درگہ مجھے جانا ہے
نظر نہ لگ جائے
تعویذ اک لانا ہے

مہندی لگی ہاتھوں میں
وصل کی شب ہم نے
بس کاٹ دی باتوں میں

بارات تو آنی ہے
گوری کو ساجن کی
اک بات بتانی ہے

مت آج بھلا دینا
کچھ باتیں کرنی ہیں
بچوں کو سلا دینا

پتھر نوکیلا ہے
بستی بھر میں وہی
بڑا چھیل چھبیلا ہے

ماہیے   افضل چوہان

اک پھول تھا جوڑے میں
سوکھ گیا تو پھر
پھینک آتے ہیں کوڑے میں

اک نقش ہے پاؤں کا
گھور کے دیکھے ہے
بنیا تیرے گاؤں کا

بادل بھی بہت برسے
ساون میں بھی ہم
صحرا کی طرح ترسے

گوری اتراتی ہے
کھول کے زلفوں کو
خوشبو بکھراتی ہے

حسرت ہے یہی اپنی
دل میں جو رہتی ہے
وہ ہوگی کبھی اپنی

گجرے لئے بانہوں میں
آج بھی بیٹھے ہیں
ساجن تیری راہوں میں

اک دیوی اُتری ہے
جگمگ ہے بستی
وہ چاند کی پتری ہے

پتھر کا زمانہ تھا
آج بھی دل میں ہے
جو خوف پرانا تھا

مینار حویلی کا
سکھیوں میں کوئی نہیں
غمخوار سہیلی کا

پانی نہ اُبل جائے
رونا نہیں گوری
کہیں بھید نہ کھل جائے

پانی مجھے پینا ہے
مایوس نہ ہو گوری
تم نے ابھی جینا ہے

بچپن میرا بستے میں
خود کو چھوڑ آیا
ہوں، گاؤں کے رستے میں

تصویر عیاں کر دی
دل کی کہی میں نے
اس نے بھی بیاں کر دی

مشکل سا سوال آیا
دن کے ڈھلتے ہی
پھر تیرا خیال آیا

دنیاؤں سے بالا ہے
ہر شے پہ قادر
وہ خالق اعلیٰ ہے

رنگین کہانی تھی
بس گئی آنکھوں میں
اک روپ کی رانی تھی

آنکھوں میں ستارے ہیں
دل بھی تمہارا اب
اور ہم بھی تمہارے ہیں

تم قائل کر لینا
بے شک جب چاہو
ہمیں گھائل کر لینا

ماہیے
عبدالوحید بسمل
(ایبٹ آباد)

رنگین سرہانے ہیں
سب کو بتادو تم
ہم دوست پرانے ہیں

اب عمر ہے پچپن کی
کیسے بھلادوں میں
وہ یادیں بچپن کی

مرے دل میں ہوتے ہو
رکھ کے سر ساجن
مری باہوں پہ سوتے ہو

تم چھت پر آیا کرو
بس یہ تمنا ہے
مجھے پاس بٹھایا کرو

میں گانا گاتا ہوں
تال پہ ڈھولک کی
دکھ اپنا سناتا ہوں

ماہیے (خاص کیفیت) ریاض اکبر
(آسٹریلیا)

باپ: پھولوں کی ڈالی ہو
آئی نصیبوں سے
تم بختوں والی ہو

بیٹی: (خوشی سے دہراتے ہوئے)
میں بختوں والی ہوں
آئی نصیبوں سے
پھولوں کی ڈالی ہوں

باپ: تم سب سے نرالی ہو
اپنی باتوں سے
دل موہنے والی ہو

بیٹی: میں سب سے نرالی ہوں
اپنی باتوں سے
دل موہنے والی ہو

باپ: سکھ دینے والی ہو
سرد زمانے میں
تم چائے کی پیالی ہو

بیٹی: (کھلکھلاتے ہوئے)
میں چائے کی پیالی ہوں
سرد زمانے میں
سکھ دینے والی ہوں

کئی سال بعد

باپ: (بسترِ مرگ پر)
اک بار تو آ جاتیں
اپنی بچی کو
نانا سے ملا جاتیں

بیٹی:
اتنا مجھے چاہا کیوں
جی میں سمائی کیا
پردیس بیاہا کیوں

(بچی کو سلاتے وقت سسکیاں لیتے ہوئے)
پھولوں کی ڈالی ہوں
سچ بچی آخر
کیا قسمت والی ہوں

میں چائے کی پیالی بس
ٹھنڈے موسم میں
گرمانے والی بس!

ماہیے ریاض اکبر

بھرپور جوانی ہے
ہم نے مل جُل کے
نئی دنیا بسانی ہے

تاروں کی وہ رات کہاں
بھاگتی دنیا کے
لوگوں میں ثبات کہاں

پھر رات اُتر آئی
تیری یادوں کی
برسات اُتر آئی

یہ عشق کے بھید ہوئے
یاد رہی باقی
گو بال سفید ہوئے

پردیس میں جی لیں گے
تم آباد رہو
ہم آنسو پی لیں گے

بازار میں آ نکلے
دولت والوں کے
دربار میں آ نکلے

کردار کہانی کے
کچی دیواریں
ریلے ہیں پانی کے

یہ کس نے چلائے بم
میری بستی کے
لوگوں کے بڑھائے غم

یہ غم ذرا کم ہوں گے
تیری سوچوں سے
جب الفاظ بہم ہوں گے

کیوں دور ہیں گاؤں میرے
روز کے چلنے سے
تھک جاتے ہیں پاؤں میرے

جو ہم نے کہا ماہیا
درد کے موسم میں
کیا تم نے سنا ماہیا؟!

ماہیے
حفیظ انجم
(کریم نگر)

کیوں نیند اُڑاتا ہے
ملتا نہیں ہے جب
کیوں چین چراتا ہے

قصہ ہے کہانی کا
مان بھی لے سچ ہے
کردار کہانی کا

دل ایک سمندر ہے
ہے یہ بہت گہرا
چُپ سادھ لے بہتر ہے

جاؤں گا میں پن گھٹ پر
جائے مری جوتی
زردار کی چوکھٹ پر

بازاری محبت ہے
مفت نہیں ملتی
نام اس کا ضرورت ہے

ملنے میں جھمیلے ہیں
قسمت ہے اپنی
صدیوں سے اکیلے ہیں

ماہیا گیت
سہیل اختر

پھر لوٹ کے کاش آتے
کتنے سنہرے تھے
وہ دن مرے بچپن کے
پھر لوٹ کے کاش......

بس یوں ہی گذر جاتا
کھیل میں سارا دن
کچھ ہوش نہ رہتا تھا
پھر لوٹ کے کاش......

ہر رات کہانی تھی
خواب میں آجاتی
پریوں کی جو رانی تھی
پھر لوٹ کے کاش......

سب کا ہی دلارا تھا
گھر کی خوشی تھا میں
ہر آنکھ کا تارا تھا
پھر لوٹ کے کاش......

چھوٹی سی تھی وہ دنیا
خوشیاں ہی خوشیاں تھیں
وہ سچ تھا کہ تھا سپنا
پھر لوٹ کے کاش......

ماہیا گیت
سہیل اختر

کب آؤ گے من موہن
آنکھ ترستی ہے
درشن کو ترے ساجن
کب آؤ گے......

آئے نہیں اب چینا
تیرے بنا ساجن
کٹتی ہی نہیں رینا
کب آؤ گے......

جلتا ہے مرا تن من
مر ہی نہ جاؤں میں
جلمی ہے بڑا ساون
کب آؤ گے......

یہ پیاس بجھا جاؤ
کیسے رہوں تنہا
اب اور نہ ترساؤ
کب آؤ گے......

اب جان پہ بن آئی
انگ لگا لو تم
یہ اگن ہے ہرجائی
کب آؤ گے......

ماہیا گیت
سہیل اختر

ویران مری راہیں
اشک بھری آنکھیں
رستہ ترا تکتی ہیں
ویران مری......

ہر سانس ہی جلتی ہے
یاد جب آتے ہو
بس جاں ہی نکلتی ہے
ویران مری......

خاموش ہی رہتا ہے
سنگ ہوا ہے دل
ہنستا ہے نہ روتا ہے
ویران مری......

اب کچھ نہیں بھاتا ہے
تیری جدائی میں
ہر کوئی ستاتا ہے
ویران مری......

کب لوٹ کے آؤ گے
بھیج دو سندیسہ
اب کتنا ستاؤ گے
ویران مری......

ماہیا گیت
سہیل اختر

کٹتی ہی نہیں راتیں
دن کے گذرنے پر
یاد آئیں تری باتیں
کٹتی ہی نہیں......

جب چلتی ہے پروائی
درد اٹھے دل میں
بھیگے مری تنہائی
کٹتی ہی نہیں......

جب کوکتی ہے کوئل
ہوک سی اٹھتی ہے
ہو جاتا ہے من بے کل
کٹتی ہی نہیں......

جب آتی ہیں برساتیں
مجھ کو جلاتی ہیں
وہ بھیگی ملاقاتیں
کٹتی ہی نہیں......

کچھ بھی تو نہیں بھاتا
آ کے گلے لگ جا
اب کوئی نہیں شکوہ
کٹتی ہی نہیں......

ماہیا گیت
سہیل اختر

ہم تم نے جو سوچا تھا
کر نہ سکے پورا
اک خواب جو دیکھا تھا
ہم تم نے جو......

تھا تیرا مرا سپنا
پھولوں کی وادی میں
چھوٹا سا ہو گھر اپنا
ہم تم نے جو......

دنیا کی نوازش تھی
ختم ہوئی دل میں
معصوم جو خواہش تھی
ہم تم نے جو......

دشمن ہے خدائی کیوں
پیار کی قسمت میں
ہوتی ہے جدائی کیوں
ہم تم نے جو......

بس خونِ جگر پینا
کوئی نہیں خواہش
یہ جینا بھی کیا جینا
ہم تم نے جو......

ماہیا گیت
رفیق شاہین
(علی گڑھ)

بتلاؤ کہ تم کیا ہو
بُوئے گلاب ہو تم
یا چاند کا جلوہ ہو
بتلاؤ کہ تم کیا ہو

خاکہ ہو مصور کا
راگنی راگ کی
یا گیت کا مکھڑا ہو
بتلاؤ کہ تم کیا ہو

قاتل ہو تمنا کی
جان کی ہو دشمن
یا کوئی مسیحا ہو
بتلاؤ کہ تم کیا ہو

پیکر ہو خیالوں کا
روحِ صداقت ہو
یا خواب ہو، دھوکہ ہو
بتلاؤ کہ تم کیا ہو

مورت ہو محبت کی
پیار کی ہو شبنم
یا کوئی شرارہ ہو
بتلاؤ کہ تم کیا ہو

ہے پیار تو کہہ دو تم
تم ہی سجن، میری
قسمت کا ستارا ہو
بتلاؤ کہ تم کیا ہو

ماہیے   احسن امام احسن

(بھوبنیشور)

کم پیسے کماتا ہوں
پھر بھی غریبی میں
بچوں کو پڑھاتا ہوں

مچھواروں کی بستی ہے
پھر بھی یہاں بچّی
مچھلی کو ترستی ہے

ہر روز بناتا ہوں
میں نئے منصوبے
پھر بھول بھی جاتا ہوں

جب ہوش میں آئے گا
اپنی حقیقت وہ
دنیا کو بتائے گا

ہے بھیڑ کو بھی سہنا
گم نہ مگر ہونا
اشعار نئے کہنا

گندم کا علاقہ ہے
دام ہے دانے میں
اور بھوکا پرندہ ہے

جب لوٹ کے آئے گا
رات گئے گھر وہ
افسانے سنائے گا

ہے کون جو آتا ہے
ذہن کی بستی میں
کہرام مچاتا ہے

ہر آنکھ یہاں نم ہے
شہر یہ کیسا ہے
خوشیوں کا ہی ماتم ہے

راتوں کو جاگتا ہے
اپنے آپ سے ہی
خود دور وہ بھاگتا ہے

جو خواب سجاتا ہوں
ٹوٹ سا جاتا ہے
جب ہوش میں آتا ہوں

تنہائی میں روتا ہے
روز وہ تکیے کو
اشکوں سے بھگوتا ہے

مسموم فضا دیکھو
دورِ ترقّی میں
ہر چہرہ نیا دیکھو

وہ قصّے سناتا ہے
ماں کی طرح بچّے
وہ روز سلاتا ہے

خاموش جو رہتا ہے
اپنی نگاہوں سے
ہر واقعہ کہتا ہے

اک ایسا یہاں گھر ہے
شہر میں پیارا سا
تہذیب کا دفتر ہے

ماہیے   خالد جاویدؔ

(رحیم یار خاں)

چرچا ہے جہانوں میں
ساتھ ہے اللہ کے
نام ان کا اذانوں میں

ہے یہ آقاؐ دعا میری
عجز و محبت سے
کروں صفت و ثنا تیری

ہے بات قرینے کی
خوشبو ملے ہم کو
تیرے شہر مدینے کی

اعزاز بلالی ہے
سرکارؐ کے کاندھے پر
جو کملی کالی ہے

امبر پہ تارے ہیں
ہم نہ ملیں شاید
جیسے دو کنارے ہیں

پل بھر میں ٹوٹے ہیں
کچے دھاگے تھے
جو رشتے چھوٹے تھے

بکھرے سے سپنے ہیں
وہ ہی بچھڑے ہیں
جو میرے اپنے ہیں

کچھ نقش ہیں حیراں سے
کچھ نہ بچا باقی
بس عکس ہیں لرزاں سے

ہر طرف ہے رعنائی
خود کو بچا خالدؔ
ہو جائے نہ رسوائی

جیون تو کھلونا ہے
سب تقدیر میاں
پھر کیسا رونا ہے

زنجیر ہے سونے کی
دل میں وہ بستا ہے
کیا بات ہے رونے کی

ماہی تو سجتا ہے
پہن کے ریشم کو
بڑا اچھا لگتا ہے

جینے کا مزا آیا
پڑھ کے خط اس کا
پھر دل نے سکوں پایا

شیریں، فرہاد کہاں
درد میں انساں کا
دل رہتا ہے شاد کہاں

ساون جب آئے گا
تو نہ اگر آیا
تیرا ذکر ستائے گا

ماہیے غیاث انجم

(بکارو)

پھولوں میں مہک تیری
پاؤں سدا رَبّا
کلیوں میں چٹک تیری

کیا طُرفہ تماشا ہے
دیکھ نہیں سکتی
ہر آنکھ پہ پردہ ہے

ہر چیز سے ظاہر ہے
میں ہوں کہاں منکر
ہر شے پہ تو قادر ہے

برسات کی راتوں میں
ایک عجب لذّت
ہے رس بھری باتوں میں

طیبہ کے نظارے ہیں
سامنے آنکھوں کے
قرآن کے پارے ہیں

ہر شے یہاں پُرنم ہے
آپ کے جانے سے
یہ چاند بھی مدھم ہے

تم کچھ بھی نہیں لانا
درد کے موسم میں
بس گاؤں چلے آنا

سنسان ہے آنگن بھی
تم جو نہیں ساجن
دُھندلا گیا درپن بھی

ان شہری فضاؤں میں
کاش کبھی ملتی
جو بات ہے گاؤں میں

زہراب بھی پیتے ہیں
مردِ مجاہد ہیں
اک شان سے جیتے ہیں

ماہیے
ریحانہ احمد

پائے ہیں یہاں گھاٹے
گلشنِ ہستی سے
ہیں درد ہی بس چھانٹے

نہیں جھگڑا ابل کا ہے
دھوکہ نہیں دینا
سودا یہ دل کا ہے

اک نقطہ تل کا ہے
بیری نہ جانے کیوں
ہوا دشمن دل کا ہے

ہستی کی کیا ہستی
جس میں نہ تو آیا
بستی وہ کیا بستی

جو شہروں کو جاتے ہیں
پان ہیں وہ کھاتے
وہیں دل بھی لگاتے ہیں

یہ دل کی کسوٹی ہے
منظور نہیں کرنی
جو چیز بھی کھوٹی ہے

ماہیے ریحانہ احمد

(کینیڈا)

رنگ رنگ کے رنگ ماہیا
راس نہیں آئے
مجھے دنیا کے ڈھنگ ماہیا

کانٹے جو بوتا ہے
وہ کب گلشن میں
آرام سے سوتا ہے

افلاک پہ تارے ہیں
غم تیری الفت کے
ہمیں جاں سے پیارے ہیں

دل اب بھی نہیں بدلا
نام ترا جپتا
یہ اب بھی رہے پگلا

معلوم یہ ہوتا ہے
سوتی ہیں اکھیاں
پر دل نہیں سوتا ہے

کیوں مکھڑا پھیر لیا
خوف نے دنیا کے
کیا تجھ کو گھیر لیا؟

باتیں نہ گھڑ ماہیا
وعدہ نبھانے کو
حالات سے لڑ ماہیا

ہر لفظ کو تولا تھا
پھر بھی لگا اس کو
میں نے جھوٹ ہی بولا تھا

راتیں یہ سہانی ہیں
دل کی باتیں سب
اب تجھ کو بتانی ہیں

دل ہو گیا خبطی ہے
اس میں بتا مجھ کو
کیا میری غلطی ہے؟

وہ آنکھ ہے ست رنگی
دیکھنے آئیں اُسے
تھل والے اور جھنگی

میرے گال پہ تل ماہیا
ڈھونڈ مجھے لینا
کبھی مال میں مل ماہیا

کب بولا چھلا ہے
اس کے گھنگرو نے
کچھ بھید سا کھولا ہے

دل میرا یہ کہتا ہے
میری طرح وہ بھی
کچھ خوش نہیں رہتا ہے

وعدے جو پرانے ہیں
بے خوف تو آ کے مل
نہیں مجھ کو دہرانے ہیں

نہیں دل میں تنہائی
دور ہے اکھیوں سے
گو برسوں سے ہرجائی

یہ زخم پرانے ہیں
چھیڑ نہ ان کو تو
کیا پھر سے دُکھانے ہیں

ترے قول کھرے ہوتے
یوں مری اکھیوں میں
آنسو نہ بھرے ہوتے

ماہیے ریحانہ احمد (کینیڈا)

دنیا سے نہ ڈر ماہیا
وعدہ کیا تو نے
وہ پورا کر ماہیا

یونہی نہ مجھے روکو
دل سے پاگل کو
اک بار ذرا ٹوکو

گھربار بہا ڈالا
اے سیلِ بلا تو نے
دنیا کو ہلا ڈالا

شب بیلے میں ہوتے ہیں
دنیا کے رکھوالے
درباروں میں سوتے ہیں

میرے پاؤں میں پائل ہے
گھن ترے گاتی ہے
ہوئی تجھ پہ مائل ہے

نیلی ہیں تری آنکھیں
سات سمندر بھی
مل جائیں اگر جھانکیں

آواز ہوئی مدھم
جھک کے کہا اس نے
کچھ قول کریں باہم

پھر ہونے لگی رم جھم
گو مجھ سے محبت ہے
جانا ہے، اُسے تاہم

یہ آنکھ ہوئی کیوں نم
نقشہ جدائی کا
اس میں نہ جائے جم

رستے ہیں بڑے پُرخم
ہاتھ پکڑ لو اب
ہو جائیں کہیں نہ گم

یہ بات ہی سچی ہے
ڈور محبت کی
ہوتی نہیں کچی ہے

انگور کی بیلیں ہیں
دکھ یہ جدائی کے
ہم دونوں ہی جھیلیں ہیں

بیلے کی کلیاں ہیں
زرد دوپہریں ہیں
سونی ہوئی گلیاں ہیں

پربت کو جاتے ہیں
چھوڑ کے یہ دنیا
لو رب سے لگاتے ہیں

رب والے بتاتے ہیں
کھوتے ہیں خود کو
تب اُس کو پاتے ہیں

گھربار ہلا ڈالا
سیلِ بلا نے تو
ساحل ہی بہا ڈالا

پھولوں میں چھپے کانٹے
درد جو سانجھے تھے
اپنوں نے نہیں بانٹے

گھربار وطن چھوڑا
جانے والے نے
پھر منہ ہی نہیں موڑا

کتاب گھر

کتاب میلہ تعارف: حیدر قریشی

میرے منتخب افسانے مصنف: ستیہ پال آنند

صفحات: 263 **قیمت**: 350 **روپے** **ناشر**: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر۔ دہلی ۱۱۰۰۵۱، انڈیا

ڈاکٹر ستیہ پال آنند اردو نظم کے حوالے سے ایک اہم نام سمجھا جاتا ہے۔ ان کی بنیادی شناخت نظم کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی ادبی شخصیت کا ایک مخفی گوشہ حال ہی میں کھل کر سامنے آیا ہے کہ وہ ایک طویل عرصہ سے تھوڑی تھوڑی افسانہ نگاری بھی کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک انہوں نے جو افسانے لکھے، ان کا ایک انتخاب انہوں نے عمدگی کے ساتھ ادبی دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ''میرے منتخب افسانے'' کے نام سے چھپنے والے اس افسانوی انتخاب میں بائیس افسانے شامل کیے گئے ہیں۔

ابتدائی افسانوں میں ہندوستانی فضا کے ملے جلے موضوعات کے افسانے شامل ہیں تو بعد میں مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والی کہانیاں بھی شامل ہوتی گئی ہیں۔ اپنی بدلتی ہوئی فضا کے اعتبار سے یہ ستیہ پال آنند کی ہجرت در ہجرت کی کہانیاں ہیں۔ پاکستان سے انڈیا اور انڈیا سے امریکہ و کینیڈا۔ اپنی نظموں کے برعکس ستیہ پال آنند کی کہانیاں جدید طرز میں نہیں لکھی گئیں، یہ عجیب سی بات لگتی ہے کیونکہ نظم نگاری میں ان کا طرزِ احساس جدید تر ہے۔ تاہم ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ایسی کہانیوں کو ایسے ہی لکھا جانا چاہیے تھا۔ اپنے افسانوں میں یہ انداز اختیار کر کے ستیہ پال آنند بحیثیت افسانہ نگار کامیاب رہے ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ ''میرا نام انجم ہے'' کسی طرح بھی منٹو کے ''کھول دو'' سے کم معیار کا نہیں ہے۔ تقسیمِ برصغیر کے موقعہ پر ہونے والے فسادات پر کئی اعلیٰ پائے کی کہانیاں لکھی گئی تھیں۔ یہ کہانی بھی اعلیٰ پائے کی ہے اور ۱۹۴۹ء میں لکھے جانے کے باوجود اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا جانا ادبی زیادتی ہے۔

ستیہ پال آنند کے پاس اپنی کہانیوں کے لیے نہ تو موضوعات کی کمی ہے اور نہ کرداروں کی۔ واقعات کے تسلسل میں بات سے بات نکالنے کا ہنر بھی انہیں آتا ہے ''زود پشیماں'' کے بوڑھے ہوں یا ''چیچو کی ملیاں کی شہزادی'' کے پاگل، لال بادشاہ اور من بہادر کے بھولے اور کھرے کردار ہوں یا ''پتھر کی صلیب'' کا مصور، ستیہ پال آنند اپنے کرداروں کو ابھارنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اگر نظم نگار ستیہ پال آنند کو بلاوجہ درمیان میں لانے کی کوشش نہ کی جائے تو افسانہ نگار ستیہ پال آنند کی اہمیت سے انکار کرنا مشکل ہوگا۔

بہت کچھ کھو گیا ہے (شاعری) شاعر: ایوب خاور

صفحات: 232 **قیمت**: 250 **روپے** **ناشر**: جہانگیر بکس۔ ۲۵۷ ریواز گارڈن۔ لاہور

''گل موسم خزاں'' اور ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' کے بعد ایوب خاور کا تیسرا شعری مجموعہ ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' شائع ہو گیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ ایوب خاور کے فکری و شعری ارتقا کو واضح کرتا ہے۔ زبان کے تخلیقی برتاؤ میں پختگی پہلے بھی تھی، لفظوں پر ان کی یہ گرفت اب اور زیادہ ہوئی ہے۔ زبان کا تخلیقی برتاؤ لچک کا تقاضا کرتا ہے اور پختگی اس لچک میں رخنہ پیدا کرتی ہے، لیکن ایوب خاور کی عمر بھر کی ریاضت اس پل صراط پر سے چہل قدمی کرتے ہوئے گزرتی گئی ہے۔

نظم و غزل ہر دو کے اظہار میں انہیں یکساں قدرت حاصل ہے۔ نظموں میں ''دعا''، ''التجا''، ''میرے لیے میری بیگم کی طرف سے ایک نظم''، ''بہت کچھ کھو گیا ہے''، ''عکسِ مہتاب'' کی سات نظمیں، ''رقصِ مہتاب''، ''زخمِ مہتاب'' اور ''حاصل لا حاصل'' کے تحت درج نظمیں اپنے اختصاص کی بنیاد پر زیادہ توجہ کھینچتی ہیں۔ تاہم اس سے دوسری نظموں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

غزلوں میں سے چند منتخب اشعار سے ان کی غزل کے سفر کو بخوبی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

کیا نہیں ہے جو سدا رقص میں ہے ۔۔۔ مستقل ارض و سما رقص میں ہے

کون لے کا رہے، کس کی لَے پر ۔۔۔ ایک زنجیر بہ پا رقص میں ہے

اک وحشتِ بے نام نہیں چھوڑتی دل کو ۔۔۔ اک ہجر ہے اور ریت کا اُڑتا ہوا دریا

یہ بلا گھر کی ہے اب اس کا کیا جائے بھی کیا ۔۔۔ اس محبت ہی کے تو پالے ہوئے لوگ ہیں ہم

ہر شخص کی دنیا میں ہے اک حُسنِ دل آرا ۔۔۔ ہر شخص اسی ایک کہانی کے لیے ہے

ایک دہشت درودیوار سے چپکی ہوئی ہے ۔۔۔ لاش کے پاس ہی بچے کے کھلونے پڑے ہیں

حُسن اور عشق کا ایک ہی رشتہ ۔۔۔ درد نیا اور ٹیس پرانی

خیال آیا ہے اب جا کر، ہمیں بھی ۔۔۔ زمانہ ساز ہونا چاہیے تھا

اس مجموعہ کے آخر میں ایوب خاور نے اپنے ٹی وی ڈرامہ سیریلز کے تھیم سانگز کا انتخاب کر کے آٹھ گیت شامل کیے ہیں۔ یہ سارے گیت ادبی شان کے حامل ہیں۔ خاص طور پر (ڈرامہ) ''پرندو لوٹ آؤ۔'' کا گیت بہت ہی پُر تاثیر ہے۔ کتاب کے ساتھ ''نیناں جوگ بھرے'' کا ایک سی ڈی تحفہ بھی منسلک ہے۔ اس میں ایوب خاور کے گیارہ فلمی و ڈرامہ گیت شامل ہیں اور ان کی مقبولِ عام غزل ''سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام'' بھی شامل ہے۔ مختلف گلوکاروں کی آوازوں میں ایوب خاور کی شاعری کو سننے کا بھی اپنا مزہ ہے۔

''بہت کچھ کھو گیا ہے'' میں ایوب خاور نے جو کھویا سو کھویا، لیکن ان کے اس کھونے میں اردو شاعری نے بہت خوبصورت غزلیں، نظمیں اور گیت پا لیے ہیں۔ روایتی جملے کی حد تک نہیں بلکہ واقعتاً ایوب خاور کا یہ مجموعہ اردو شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

میرے ڈرامے لندن میں **مصنف:** **شمس الدین آغا**

صفحات: 364 **قیمت:** 400 **روپے** **ناشر:** ایڈشاٹ پبلی کیشنز ممبئی

شمس الدین آغا ۱۹۶۴ء میں بمبئی سے انگلستان آئے۔بمبئی کی فلم انڈسٹری کی علمی وادبی شخصیات سے ان کے مراسم تھے،خود بھی ڈرامہ کا شوق رکھتے تھے۔سو انگلستان آکر انہوں نے اپنے شوق کو اس رنگ میں پورا کیا کہ خود انگلستان میں اردو تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرنے کے لیے ڈرامہ نگاری بھی شروع کی اور ان ڈراموں کو انگلستان میں اسٹیج پر پیش کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔تب سے اب تک ٹی وی کی آمد کے بعد پاک و ہند کے باشندوں کے مزاج میں بھی فرق آگیا ہے تاہم شمس الدین آغا نے ایسی فضا میں بھی انگلستان میں اردو اسٹیج ڈرامہ کے فن کو زندہ رکھا ہوا ہے۔اس کتاب میں ان کے آٹھ ڈرامے شامل ہیں جو اسٹیج کی اہمیت کے ساتھ اپنی ادبی قدر و قیمت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔۳۴۴ صفحات کے تحریری مواد کے ساتھ ۲۰ صفحات پر ان ڈراموں کی بعض یادگار تصاویر شامل کی گئی ہیں۔انگلستان میں اسٹیج ڈرامہ اور اردو میں ادبی ڈرامہ کے حوالے سے اس کتاب کی خاص اہمیت بنتی ہے اور متعلقہ حلقوں میں یقیناً اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی۔

داستاں در داستاں (ناولٹ) **مصنفہ:** **حمیدہ معین رضوی**

صفحات: 256 **قیمت:** 250 **روپے** **ناشر:** کاروانِ ملت پبلی کیشنز۔اسلام آباد

''داستاں در داستاں''لندن میں مقیم ادیبہ حمیدہ معین رضوی کی تازہ تصنیف ہے۔اس میں اسی نام کا ایک ناولٹ شامل ہے۔ناولٹ کے علاوہ کتاب میں آٹھ افسانے بھی شامل ہیں۔آخر میں ایک فکاہیہ بعنوان ''جوتا''شامل کیا گیا ہے۔اس کتاب میں حمیدہ معین رضوی کا قلم اپنے معمول کے مطابق رواں دواں ہے۔اپنے اردگرد کے اور اپنی زندگی کے بعض موضوعات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ان کے ہاں مجموعی طور پر نصیحت اور بغاوت کی ایک عجیب سی کھینچا تانی ملتی ہے۔اصلاً وہ نصیحت کو اہم سمجھتی ہیں لیکن ڈنڈے کے زور سے کی جانے والی نصیحت کے خلاف بغاوت ضرور کرتی ہیں۔یہ رویہ ان کے ہاں ایک کشمکش سی پیدا کرتا ہے جو ان کے اندر ایک تخلیقی تحرک پیدا کرتا ہے،دوسری طرف یہ رویہ بجائے خود ان کے ہاں ایک اعتدال کو قائم کرتا ہے۔ فکاہیہ''جوتا''سے ان کے مزاج کی شگفتگی اور علمی دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر شاداب احسانی نے پیش لفظ میں کتاب کے جملہ مندرجات کے حوالے سے مناسب باتیں کر دی ہیں۔حمیدہ معین رضوی نے''عرضداشت''کے زیرِ عنوان اپنے ادبی نظریے کی وضاحت کی ہے۔مجموعی طور پر یہ ایک دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔بس عناوین قائم کرتے ہوئے انہیں مناسب طور پر نمایاں نہیں کیا جا سکا۔یہ ایک خامی نہ ہوتی تو کتاب دیدہ زیب بھی کہلاتی۔

فرنٹ سیٹ (انشائیے) **مصنف:** **منور عثمانی**

صفحات: 128 **قیمت:** 160 **روپے** **ناشر:** سانجھ پبلی کیشنز مفتی بلڈنگ۔17/31 ٹیمپل روڈ۔لاہور

منور عثمانی ۱۹۹۵ء سے انشائیہ نگاری کر رہے ہیں اور اسی عشرے کے آخری حصہ میں انہوں نے انشائیہ فہمی کی مختلف جہات پر بھی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔''سفر،راستہ بناتا ہے''کے نام سے ان کی مرتب کردہ کتاب (مطبوعہ سال ۲۰۰۰ء) میں سیر و سفر کے موضوع پر انشائیوں کا ایک انتخاب دیا گیا ہے جو اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔''رشید احمد صدیقی کے انشائی تیور''(مطبوعہ سال ۲۰۰۲ء) میں انہوں نے ایسے اقتباسات کو یکجا کیا ہے جن میں انشائیہ رنگ ملتا ہے۔رشید احمد صدیقی مکمل انشائیہ تو نہ لکھ سکے لیکن انہوں مہذب اور شائستہ مزاح کے ایک نئے ذائقے سے اردو ادب کو آشنا کیا۔منور عثمانی نے رشید احمد کے انشائی تیور یکجا کرتے ہوئے اپنی انشائیہ فہمی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔انشائیہ کی تفہیم کے ان مرحلوں سے گزرتے ہوئے اب ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ''فرنٹ سیٹ''منظر عام پر آیا ہے۔۱۹۹۵ء سے اب تک انہوں نے جو انشائیے لکھے وہ انیس انشائیے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

فرنٹ سیٹ،قائل کرنا،ریڈیو کے حق میں آخری آواز،پیدل چلنا،طنز،ممتحن کی ڈائری،صبح کا تارا،نئے گھر کی خوشگوار بات،لمحۂ موجود کا پھیلاؤ،متفرق پرچیوں پر لکھا میں نے،ایک قابلِ واپسی خط،ایک جاگتی کہانی،رات کی جناب میں،ایک غیر حتمی انٹرویو،تعارف،کم زور لمحہ،باتیں کیا کرو!،دھند میں سفر شروع ہوا،نامۂ اعمال کی دلآویزی۔۔۔یہ انیس انشائیے اس مجموعہ کی زینت ہیں۔''پس نوشت''۔۔''منظر،سفر میں ہے''کے تحت انہوں نے جو گفتگو کی ہے اس پر بھی انشائی رنگ غالب ہے اور سچی بات ہے میں تو اسے بھی انشائیہ قرار دوں گا۔یوں اس مجموعہ میں انیس نہیں،بیس انشائیے شامل ہیں۔

فرنٹ سیٹ کے تمام انشائیے جملہ انشائی اوصاف سے مملو ہیں۔کہیں مزاح کا عنصر غالب ہوا ہے تو یہ غلبہ عارضی ثابت ہوا ہے،انشائیہ نگار جلد اپنی ڈگر پر آجاتا ہے۔ہر چند بعض عناوین میں سفر کا لفظ آیا ہے،سفر بجائے خود تحرک کی علامت ہے لیکن منور عثمانی کے ہاں سفر سے زیادہ سیر و سیاحت کی کیفیت نمایاں ہے۔وہ اپنے موضوع کے ساتھ جیسے سیر کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔سیر کے دوران کہیں پہنچنے کی یا جلد واپس لوٹنے کی جلدی کسی کو نہیں ہے۔نہ انشائیے کے موضوع کو اور نہ انشائیہ نگار کو۔چنانچہ ہر سیر اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ قاری سیر مکمل ہونے پر تھکن کا شکار ہونے کی بجائے تازہ دم ہو جاتا ہے۔یوں ایک کے بعد دوسرا انشائیہ پڑھتا چلا جاتا ہے۔

منور عثمانی اردو کے معروف انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔انشائیہ کی بنیاد کے حوالے سے ان کا مرتب کردہ و مدون کردہ کام ہو یا تخلیق کار کی حیثیت سے انشائیے تخلیق کرنے کا کام ہو،سب قابلِ قدر ہیں۔میں ان کے انشائیوں کے پہلے مجموعہ''فرنٹ سیٹ''کا کھلے دل کے ساتھ استقبال کرتا ہوں!

سرحدِ لفظ نہیں(شاعری) **تصنیف**:**مقیم اثر بیاولی**

صفحات:512 **قیمت**:500 **روپے**،**رابطہ**: روم نمبر ۲۶۱، ایم ایچ بی کالونی، مالے گاؤں ۴۲۳۲۰۳ انڈیا

مقیم اثر بیالوی مالے گاؤں میں مقیم کہنہ مشق شاعر ہیں۔شعر گوئی میں مشاق ہی نہیں پُر گو بھی ہیں۔''لاتقنطو''، ''نغمۂ سنگ''اور''بدن نژاد قبا'' کے بعد ان کا چوتھا شعری مجموعہ''سرحدِ لفظ نہیں'' شائع ہوا ہے۔اس مجموعہ میں ۲۸۰ غزلیں اور ۷ نظمیں شامل ہیں۔تیسرے مجموعے کے بارہ برسوں کے بعد ان کا یہ چوتھا مجموعہ سامنے آیا ہے۔پہلے مجموعوں کو ملا کر دیکھیں یا صرف اسی مجموعے کو پیشِ نظر رکھیں یہ بات واضح ہے کہ مقیم اثر بیاولی کو شعر گوئی پر قدرت حاصل ہے۔ان کی مشاقی کے ساتھ ان کی پُرگوئی بھی ان مجموعوں سے عیاں ہے۔میرا خیال تھا کہ مقیم اثر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہوں گے،اگرچہ ایسا ہی ہے لیکن نظم پر ان کی گرفت بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنی کہ غزل پر۔

مقیم اثر کے کلام میں ایک خاص روانی ملتی ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے چلتی ہے۔ان کی غزلوں سے چند اشعار کسی انتخاب کے بغیر پیش ہیں۔ان سے ان کی غزل گوئی کے عمومی مزاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کہا سنا جو سبھی نے، کہا سنا ہی نہیں ہمارا رنگ کسی اور کو ملا ہی نہیں

بدن کے پیچ و خم میں ڈھے گئے ہم گماں تھا راہ کچھ ہموار سی ہے

میں درِ اسرار پر دیتا ہوں دستک اس لیے روشنی کا راستہ دنیا تجھے مل جائے گا

ریت تھپیڑوں سے گھائل ہے خون میں ڈوبی پیاس مری آخر کب دریا سے جڑے گی جلتی بلتی پیاس مری

قطرہ جب تک نہ بنے خود دریا دریا قطرے میں سماتا ہی نہیں

ایک نظم''لاہوتی جست'' کی چند ابتدائی لائنوں سے ان کی نظم کے تیور دیکھے جا سکتے ہیں۔

''روایت کوش جلووں کے اُفق آلود پتھر کی ر لکیروں کو خدا کہتی سیہ اندھی عقیدت کی ترائی سے اُدھر اک دن ر پروں میں باندھ کر سارے زمانوں کی گھنی مٹی ر مہکتی گونجتی، آتش فشاں آزاد گامی سے ر اچھوتا مشورہ کر کے ر فلک آثار شاہینی اڑانوں کو ر دہکتی آنکھ کی ان پتلیوں کا ہم زباں کر کے ر مری پروازِ لاہوتی میں شامل ہو''

اپنے دوسرے مجموعے سے ہی مقیم اثر اپنے بعض مخالفین کے بارے میں برہمی کا اظہار کرتے آ رہے ہیں۔میں ادبی دنیا کی مقامی سیاستوں کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں۔ہماری تمام تر بے نیازی کے باوجود''غوغائے رقیباں'' کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔تاہم اچھے تخلیق کار کا تخلیقی کام بجائے خود اپنا اجر آپ ہوتا ہے۔مقیم اثر اس حقیقت کو مد نظر رکھیں اور مخالفین کی باتوں سے غصہ میں آنے کی بجائے اس الاؤ کو اپنے تخلیقی عمل حصہ بناتے جائیں، یہی ان کی طرف سے ان کے مخالفین کے لیے بہتر جواب ہوگا۔مقیم اثر جیسے پُرگو شاعر کی شاعری کسی مقام پر رُکنے والی نہیں، سو ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مزید مجموعے بھی جلد ادبی دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔میں ان کی شعری روانی کے قائم رہنے کی دلی آرزو کے ساتھ ان کے مجموعہ''سرحدِ لفظ نہیں'' کا استقبال کرتا ہوں۔

تاثر اور تنقید(مضامین) **تصنیف**:**عبدالرب استاد**

صفحات:124 **قیمت**:200 **روپے**، **ناشر**: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔انڈیا

عبدالرب استاد نوجوان مصنف ہیں،گلبرگہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔اگرچہ جز وقتی طور پر شاعری بھی کرتے ہیں لیکن ان کی بنیادی دلچسپی تحقیق و تنقید سے ہے۔اس سلسلہ میں ان کے مضامین ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔''تاثر اور تنقید'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس سے بحیثیت تنقید نگار ان کی شناخت ہو سکے گی۔''تاثر اور تنقید'' نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ تاثر اور تنقید دونوں کو یکجا رکھتے ہیں، بلکہ دونوں کی یکجائی سے ہی متوازن تنقید کا بہتر تاثر سامنے آتا ہے۔

کتاب میں گیارہ مضامین شامل ہیں جو ان کی دلچسپی کے متنوع ادبی موضوعات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مضامین کے عناوین سے ان موضوعات کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔۱۔''تحریکِ آزادی میں اردو زبان و ادب کا حصہ''،۲۔''مولانا حالی کی ادبی خدمات''،۳۔''پریم چند اور خطبۂ صدارت''،۴۔''محبّئ دکن۔۔ڈاکٹر زور''،۵۔''دکن کا باکمال شاعر سلیمان خطیب''،۶۔''اردو ماہیا۔۔۔''،۷۔''کرناٹک میں اردو غزل''،۸۔''حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری''،۹۔''افسانہ **زرد کتا**:ایک تجزیہ''،۱۰۔''افسانہ **کہانی در کہانی** کا تجزیہ''، ۱۱۔''دیکھیں کیا گزرے ہے۔۔''۔آخری مضمون حمید سہروردی کی نظم''صفر'' کے تجزیہ پر مبنی ہے۔شروع میں کتاب کا پیش لفظ انہوں نے خود لکھا ہے اور آخر میں تجزیہ کردہ تین تخلیقات انتظار حسین کا افسانہ''زرد کتا''،حمید سہروردی کا افسانہ''کہانی در کہانی'' اور ان کی نظم''صفر'' کو بھی شامل کر دیا ہے،تاکہ ان کا تجزیہ پڑھنے والے اصل تخلیقات کو بھی بعد میں پڑھ سکیں اور اپنے طور پر کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہیں تو پہنچ سکیں۔

عبدالرب استاد کے موضوعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ادب سے متعلق مختلف شعبوں میں یکساں دلچسپی رکھتے ہیں اور کسی ایک شعبہ کے ہو کر نہیں رہ گئے۔ان کی تنقیدی سوجھ بوجھ انہیں اپنے مقامی لیکن نامور ادبی لوگوں سے لے کر دور دراز کے ادیبوں تک پہنچاتی ہے۔مولانا حالی سے لے کر محئی الدین زور تک اور پریم چند سے سلیمان خطیب تک وہ اپنے ماحول اور ارد گرد کے ادبی ماضی سے بھی باخبر رہتے ہیں اور جدید رویوں سے جنم لیتی ہوئی تخلیقات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔نئی اصناف ہوں یا ادب کے نئے مسائل وہ ممکنہ حد تک ان سے خود بھی آگاہ رکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک رکھتے ہیں۔عبدالرب استاد کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بطور نقاد فیصلہ سنانے کی بجائے ادب پارے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر جو کچھ جان پاتے ہیں، پیش کر دیتے ہیں۔گویا سمجھنے کے بعد اپنے قاری کو سمجھانے نہیں بیٹھ جاتے۔یونیورسٹی میں اردو کا استاد ہوتے ہوئے ان کے لیے ایسا کرنے کا خاصا خطرہ موجود تھا لیکن ان کا کمال ہے کہ انہوں نے اس نوعیت کی''استادی'' جتانے سے گریز کیا ہے۔

''تاثر اور تنقید'' کا اس لحاظ سے خیر مقدم کیا جانا چاہیے کہ اس میں عبدالرب استاد کی تنقیدی بصیرت کے بہترین امکانات مخفی ہیں۔ان کے اگلے تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں وہ امکانات تدریجاً نمایاں ہوتے جائیں گے اور یقین ہے کہ اردو تنقید میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گے۔سو میں اس مجموعہ کا تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں!

منشا یاد (اسلام آباد)

فرحت پروین کے افسانے

(''منجمد'' سے ''کانچ کی چٹان'' تک)

کہانیاں ہمارے چاروں طرف بکھری ہوتی ہیں لیکن وہ ریت مٹی میں ملے سونے کے ذرات کی مانند نا خالص حالت میں ہوتی ہیں۔ سونے کے ذرات کو چھان پھٹک کر ریت مٹی سے الگ کرنے والے کو نیاریا کہتے ہیں۔ افسانہ نگار بھی کہانیوں کا نیاریا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی دھول میں لتھڑی کہانیوں کو پہچان کر الگ کرتا اور انہیں فن کی کٹھالی میں پگھلا کر خالص سونے کی ڈلی یا زیورات میں ڈھالتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بنی بنائی ڈھلی ڈھلائی کہانی آپ کے ہاتھ لگ جائے اور لگ بھی جائے تو وہ فکشن کی بجائے واقعہ نگاری کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتی یا اگر آپ فکشن کی اہمیت سے ناواقف ہیں تو آپ اسے سچی کہانی کہہ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن کہانی کا حقیقت پر مبنی یا سچی ہونا اس کی کوئی قابلِ داد خوبی نہیں ہے۔ ہاں اسے سچی معلوم ہونا چاہیے۔ کیوں کہ پوئٹک ٹرتھ کی طرح فکشن کا بھی اپنا سچ ہوتا ہے، جو زیادہ موثر ہوتا ہے۔

فرحت پروین کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے سب سے پہلے یہ احساس ہوا کہ وہ ان تمام خصوصیات سے مالا مال ہے جو ایک اچھے، ذہین اور انسانی نفسیات کی تہوں پرتوں سے آشنا افسانہ نگار میں ہونا ضروری ہیں۔ بکھری ہوئی کہانیوں کے ذرات کو چھان پھٹک کر ریت مٹی سے علیحدہ کرنے، اپنے اور دوسروں کے بطون میں جھانکنے، دوسروں کے دکھ درد کو اپنی کھال میں محسوس کرنے اور زندگی کے متنوع رنگوں کا بغور مشاہدہ کرنے کی صلاحیت۔ زندگی کے میلے میں بھٹکتے، گم ہوتے اور گرے پڑے کسی بے نام کردار کو پہچان کر انگلی سے لگا لینا، جھاڑ پونچھ کر، بہتر سے بہتر لفظوں کا لباس پہنانا اور ایک اچھا سا عنوان یا نام دے کر لمبی زندگی جینے کے لیے چھاپے چڑھا دینا۔ جیسے اس نے افسانہ ''منجمد'' میں انسان کے چھ سیکنڈز میں جم جانے والی شدید برف باری میں پوری رات باہر گزارنے والی محنت کش لڑکی کو امر کر دیا ہے۔ یا جیسے بیٹی کی موت کے سبب صفائی کے کام پر نہ آنے والی ''بہانے باز'' برکتے یا بچوں کی تعلیم کی خاطر جدی پشتی غلامی سے نکلنے کی خواہش کرنے والا ''نمک حرام'' بلکہ سوڑ کا بچہ زمان خان اور تنہائی کے کوڑ کباڑ میں کسی پرانی ٹوٹی پھوٹی کار کی طرح پڑی ہوئی ''جنک یارڈ'' کی اماں۔

یوں تو انسانی نفسیات سے اپنی گہری شناسائی کو فرحت نے ہر جگہ برتا ہے کہ اس کے بغیر اچھا افسانہ نگار بننا ممکن ہی نہیں لیکن اس کے کامیاب اور واضح مناظر ہم ملک بدر، سکنک (Skunk) ریستوران کی کھڑکی

سے، آزاد قیدی اور تمغہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اوورسیز پاکستانی ادیبوں کی تحریروں کو میں ہمیشہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں کہ ان میں زندگی اور معاشرت کے ایسے نئے نئے رخ دیکھنے کو ملتے ہیں جو ہمارے لیے انوکھے اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم، ترقی اور آگے بڑھنے کے راستے بند نہیں ہیں لیکن فرد کو آزادی، اقتصادی خود مختاری اور آسائشوں کی چوہا دوڑ نے انسان سے مشین بنا دیا جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

''ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات''

مروت کے ان کچلے ہوئے احساسات کے مناظر بہت سی کہانیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں خاص طور پر شاخِ آہو، بن باس، جنک یارڈ، الجھن، جھوٹی اور تمغہ جیسی کہانیاں مشترکہ خاندانی نظام کے بکھرنے اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کی ہولناک مثالیں ہیں۔ فرحت پروین نے کچھ نئی علامتیں اور استعارے بھی متعارف کرائے ہیں جیسے سکنک، ایمبر، ماتروشکا، صندل کا جنگل وغیرہ۔ ان علامتوں کو انہوں نے ابہام پیدا کرنے یا فیشن کے طور پر نہیں بلکہ معنویت میں گہرائی اور فنی دبازت پیدا کرنے کے لیے نہایت کامیابی اور موثر طریقے سے استعمال کیا ہے۔

میری نظر سے فرحت پروین کا ناول ''برگِ گلِ افسوس'' تو نہیں گزرا لیکن ان کے پہلے مجموعہ ''منجمد'' سے آخری مجموعہ ''کانچ کی چٹان'' تک ان کے فن میں مسلسل اور بتدریج ارتقا نظر آتا ہے۔ شروع میں تو میں ان کی نسبتاً بدیسی معاشرت کی کہانیوں سے متاثر ہوتا تھا لیکن پھر ان کی ساری دیسی بدیسی موضوعات کی کہانیاں، فنی اور فکری رچاؤ اور موضوعات کی رنگا رنگی اپنے حصار میں لینے لگی۔ خاص طور پر انسانی ہمدردی اور نچلے طبقے کے کرداروں کا خارجی اور داخلی مطالعہ اور پیش کش۔ ''کانچ کی چٹان'' میں موضوعات کا تنوع اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعے کی چند ایک کہانیوں کے موضوعات دیکھئے:

پہلی کہانی اگر سات بیٹوں پر بھاری اور قدرت کی کاریگری کا نمونہ بیٹی کی دائمی بے ہوشی کے دوران ہسپتال میں حاملہ کر دیئے جانے اور صدمے سے ماں اور باپ کے چل بسنے کے بارے میں ہے تو دوسری کہانی ایک غریب محنت کش کی ہے جو روکھی سوکھی کھا کر والدین کو سپورٹ کرتا اور گھر کی تعمیر کے لیے فارن سے پیسے بھیجتا رہتا ہے لیکن اپنی صحت کا خیال نہیں رکھ سکتا اور ایک روز کارگو میں اس کا تابوت آتا ہے جسے اس مکان میں ڈیلور کر دیا جاتا ہے جس میں اس (عاطف) نے اپنی زندگی میں قدم نہیں رکھا۔

تیسری کہانی ''آدھی بات'' میاں بیوی کے تعلقات اور مرد کی بالا دستی کے بارے میں ہے۔ شوہر اکثر اپنے ماضی کے معاشقوں کا ذکر کارناموں کی صورت کرتا اور اتراتا رہتا ہے لیکن جب بیوی ویسی ہی کوئی بات کرنا چاہتی ہے تو وہ پوری بات سننے کا بھی روادار نہیں۔ ''سرابوں کی مسافر'' شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جانے اور اپنے منگیتر کی یاد میں زندگی گزارنے کا عہد کر لینے والی ایک نوجوان لڑکی کی وفا اور محبت کی خوب صورت کہانی ہے۔ افسانہ ''کانچ کی چٹان'' ایک فلپائنی لڑکی کی کہانی ہے جو بچوں سے جدا ہو کر اپنے کنبے کی کفالت کے لیے پردیس میں کام کرتی ہے مگر وطن میں بیٹا بیمار ہو جاتا ہے اور مالکن اسے دو سالہ کنٹریکٹ سے پہلے چھٹی پر جانے کی اجازت نہیں دیتی جس کا صدمہ وہ سہہ نہیں سکتی اور اس کی باڈی، ان سب کھلونوں اور تحفوں کے ساتھ جو اس نے

بیٹے کے لیے جمع کر رکھے تھے فلپائن بھیجی جاتی ہے۔ ''تنکا تنکا آشیاں'' آٹھ اکتوبر کے شمالی پاکستانی علاقوں میں زلزلے سے متعلق ایک پرتاثیر کہانی ہے۔ ایک شخص دیارِ غیر سے اپنے علاقے میں زلزلے کی خبر سن کر اپنے گاؤں پہنچتا ہے لیکن اس کے گھر اور کنبے سمیت پورا گاؤں صفحہ ہستی سے نابود ہو چکا ہے۔ رونے دھونے اور استقامت کی دعا مانگنے کے دوران میں وہ رضا کاروں کی باہمی گفتگو سنتا ہے:

''جو ہو چکا اس پر کسی کو قدرت تھی نہ اختیار مگر جو بچ چکا ہے اس کو بچانے کی تو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ پہاڑی علاقے میں سردی شروع ہوگئی تو خیموں کی سخت ضرورت ہوگی ورنہ لوگوں کے بیمار ہونے اور مزید جانی نقصان کا خطرہ ہے''۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی دو سال کی بچت جن کے لیے ساتھ لایا ہے وہ تو رہے نہیں، وہ رضا کاروں سے پوچھتا ہے کہ دو لاکھ میں کتنے خیمے آ جائیں گے۔

''دشمن کا شہر'' کئی برس پہلے لکھی گئی کہانی ہے مگر پاکستان کے شہروں میں جگہ جگہ لگے ناکوں کی موجودہ صورتِ حال پر بھی یہ کہانی اسی طرح منطبق ہوتی ہے جیسی لکھنے کے عہد میں ہوتی تھی۔ ''آفٹر آل'' ایک نوعمر کنواری لڑکی کے غلط راستے پر چلنے اور مردہ بچی کو جنم دینے کی کہانی ہے، جس میں عبرت کے بہت سے مقام آتے ہیں۔

''کھلا آسمان نیلا سمندر'' مختلف قسم کی آنکھوں کے بارے میں ایک اچھی اور خوب صورت کہانی ہے اور ''دائرہ'' میں حقہ بردار مرادا خان بڑے خان کا غصہ بیوی پر اور باپ اس کی ماں پر نکالتا ہے۔

''اٹھو میرے چاند'' میں ایک بیٹے نے پردیس میں اپنی ماں کی آواز ٹیپ بند کر کے رکھی ہوئی ہے جو اسے صبح کو اٹھو میرے چاند کہہ کر جگاتی ہے۔ ''ہاٹ میل ڈاٹ کام''۔ ایک نہایت دلچسپ کہانی ہے جس میں انٹرنیٹ پر شادی شدہ ڈاکٹر اور خاتون ایک دوسرے کو الٹا سیدھا تعارف کراتے اور مشورے لیتے دیتے ہیں۔ آخر میں اصل حقیقت کھلتی ہے۔ ''تیسرا کلمہ'' میں رابعہ بیگم ایک چھوٹی عمر کی ملازمہ سے اپنے پاؤں دبواتی، اس کی گود میں اپنا بھاری پاؤں رکھ کر مالش کرواتی اور ساتھ ساتھ ثواب بھی کماتی جاتی ہے یعنی اسے تیسرا کلمہ سکھاتی ہے۔ ''دھوکے باز'' میں ایک میڈم ایک غریب طالب علم کو داخلے کی رقم دیتی ہے مگر لڑکا وہ رقم پڑھائی کی بجائے بہن کے کینسر کے علاج پر خرچ کر دیتا ہے کہ بہن کے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی۔

'آخری گیت کی موت'' کی بنیاد ایک نازک اور خوبصورت خیال اور جذبے پر رکھی گئی ہے کہ جب محبت چھن جائے تو کہانی کار (فن کار) سے کہانی اور الفاظ بھی روٹھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس مجموعہ میں بہت سے ایسی کہانیاں ہیں جن کے موضوعات میں بے حد تنوع ہے اور اس سے فرحت پروین کے موضوعات کی رنگارنگی، فن کی وسعت اور کہانی کہنے کے فن پر دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ فرحت پروین کی کہانیاں اپنی انہی خوبیوں اور عمدہ اظہار بیان کی وجہ سے اردو فکشن میں ایک نہایت اہم اضافہ ہیں۔ اللہ انہیں ایسی ہی تخلیقی توانائی سے نوازے رکھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

نہال دل پر سحاب جیسے

میں نے پروین شیر کو دور سے بھی نہیں دیکھا، مجھے ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ بارک اوباما کے صدارتی دور میں امریکا میں ایک ہندستانی تارک وطن کی حیثیت میں آباد ہیں اور کبھی لاہور نہیں آئیں۔ میں جنرل پرویز مشرف کا جابرانہ دور گزار کر اب آصف علی زرداری کے صدارتی زمانے میں جمہوری آمریت کے ذائقے چکھ رہا ہوں اور ان ادیبوں اور شاعروں میں شامل نہیں ہوں، جن کی لابی امریکہ میں موجود ہے اور جنہیں امریکا، کا غیر تارک شہری بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے قریباً پانچ سال قبل پروفیسر افتخار اجمل شاہین کے وسیلے سے ان کی شاعری اور مصوری کا پہلا مجموعہ کرچیاں دیکھا تو محسوس کیا کہ میں ان کا پرانا شناسا ہوں۔ میں ان کی نظمیں پڑھتا اور تصویریں دیکھتا تو یوں محسوس کرتا کہ وہ میری محلے دار ہیں اور میرے گرد و پیش کو مشرقی آنکھ سے دیکھ کر نظم اور تصویر میں منعکس کر رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی جب یہ حقیقت اپنے پر کھولتی کہ پروین شیر تو امریکہ میں آباد ہیں، تب بھی مجھے مایوسی نہ ہوتی کیوں کہ تارک وطن کی حیثیت میں بھی انہوں نے اپنی ذات کو وطن کے لمس سے محروم نہیں کیا۔ اور ان کا وجود ایک ایسی عورت کا ہے جو بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی چار حیثیتوں میں منقسم ہے لیکن ان کی کسی حیثیت پر مغرب کا غازہ نہیں چڑھا اور وہ شاعری اور مصوری کے فنی تقاضوں کو بھی ایک مشرقی تخلیق کار کی حیثیت میں ادا کرتی ہیں۔ ان کے یہ دونوں عمل مشاہداتی ہیں لیکن جب فن کا پیکر اختیار کرتے ہیں تو الہامی نظر آتے ہیں۔ اور ان کا موازنہ آذر زوبی، شمزا، شاکر علی اور زبیدہ جاوید سے کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ انہوں نے برش سے شاعری تو کی ہے لیکن فکر و خیال کو موئے قلم سے ادا نہیں کیا۔ وہ چغتائی اور صادقین سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان دو نامور مصوروں نے اپنے باطن میں جھانکنے کی بجائےء دوسرے بڑے شاعروں کے داخل کو ان کی شاعری سے بازیافت کرنے کی کاوش کی ہے۔

پروین شیر نے تخلیقی اظہار کے دو تاریک براعظموں کو منور کیا۔ ایک میں لفظوں سے نیرنگی پیدا کی اور دوسرے میں رنگوں کے امتزاج سے تاثرات کی نئی گرہیں کھولیں۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جمالیاتی اظہار کی دو وسیع تر کائناتوں کا ایک مشترکہ مدار تشکیل دیا ہے جس میں تصویر شعریت پیدا کرتی ہے اور نظم نہال دل

پرسحاب بن جاتی ہے۔ پروین شیر کی شاعری اور مصوری کی نئی کتاب کا مرکزی موضوع ۔۔ ماں ہے۔ جس کی موضوعی وسعت آفاقی ہے لیکن جس کے حقیقی اسرار زمینی عمل اور سماجی رشتوں سے آشکار ہوتے ہیں لیکن بالعموم اظہار کی راہ نہیں پاتے۔ پروین شیر کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس دنیائے فانی سے اپنی ماں کی رحلت کا سانحہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا، اس کا درد خون رستے دل سے محسوس کیا لیکن پھر ان کی تیسری آنکھ بیدار ہوگئی۔ انہوں نے ماں کو عالم گیتی پر موجود دیکھا اور اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ کر نغمہ خواں ہوگئیں:

وہ کس قدر تھی حسین ساعت
رحیم ساعت، کریم ساعت
کہ جب مرے دامن دعا میں
عطا کیا تھا تجھے خدا نے

لیکن اسی لمحے پروین شیر پر جو دکھ یلغار کر دیتا ہے وہ اپنی ماں سے محرومی کا دکھ ہے اور یہی وہ دکھ ہے جس نے غم مسلسل کی صورت اختیار کی، کبھی آنسو بن کر پلکوں پر نمودار ہوگیا اور کبھی یہ قطرہ ء خون بن کر دل میں سما گیا لیکن دوسرے لمحے لفظوں کی آبشار نظم کی صورت میں لفظوں میں ڈھلنے لگی۔ اس قسم کے مقامات پر پروین شیر نے ذاتی محرومیوں کا اظہار رثائی انداز میں کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے غم محرومی جاوید کو وسعت دے کر عالم گیریت عطا کر دی ہے اور اپنے غم کو پورے عالم کا غم بنا دیا ہے۔ پروین شیر نے 'ماں' کو دھرتی کی علامت کے طور پر قبول کیا ہے جس کی زرخیزیاں برگ و بار لاتی ہیں اور ننھی دانے کو ثمر دار درخت بنا دیتی ہیں لیکن پھر عمروں کے خرابے میں ۔۔ ماں ۔۔ کا وجود گم ہو جاتا ہے۔ اس طرح دھرتی بانجھ نہیں ہو جاتی بلکہ کئی ماؤں کے روپ میں منقسم ہو جاتی ہے۔ کائنات کا ارتقائی عمل جاری رہتا ہے۔ لیکن وہ ماں جس نے پروین شیر کو جنم دیا ہے، اپنا انوکھا وجود رکھتی ہے اور اس کتاب میں پروین شیر نے ان منفرد زاویوں کو لفظ اور رنگ میں پیش کیا ہے جن کے اسرار ان پر اپنی ماں کی وفات کے بعد کھلے اب انہیں احساس ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس احساس میں دنیا کی ہر عورت شامل ہے۔

''اے ماں میں تو
اک بے مایہ چھوٹا سا دانہ تھی، جس کو
تو نے اونچا پیڑ بنا کر
اپنی شفقت سے پروان چڑھا کر
میرے سر کو آسمان تک پہنچایا ہے۔'' **(اے ماں)**

''میں نے تیری انگلیوں کو تھام کر
ان کٹھن راہوں پہ چلنے کا ہنر
ایک دن سیکھا تھا، تجھ سے میری ماں
جب میں گرتی تھی، تو مجھ کو تھام کر

اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا فن
مجھ کو تجھ سے ہی ملا تھا میری ماں'' **(ماں)**

اٹھ کے رحمت کا ابر جیسے
پیاسی سوکھی زمیں پہ برسے
سلگتے صحرا میں ٹھنڈے سائے کی ایک چادر بچھائے
جیسے شجر ہو کوئی
اندھیری راتوں میں کوئی روشن
چراغ جیسے
جھلتے پتھر کو سرد ہاتھوں میں بھر کے جیسے
کوئی ندی اپنی تہہ میں رکھ دے
دہکتی لو کی تپش میں ٹھنڈی
ہوا کے جھونکے کا لمس گالوں کو گدگدائے
پناہ لینے کو جنگلوں میں ہو ایک کٹیا
یہی تو ہر درد کا ہے درماں
یہی تو ماں ہے'' **(یہی تو ہے وہ)**

اور ماں کے وجودی پیکر سے محروم ہو جانے کے بعد جسم و جاں کی حالت اس اقتباس سے عیاں ہے:

''مگر دیکھو
کہ جب سے تم گئی ہو چھوڑ کر اس کو
مری امی
وہ بچی سن رسیدہ ہوگئی ہے، کچھ دنوں میں ہی!''

لیکن اس سن رسیدہ بچی کو احساس ہے کہ اس کے سر پر اس کی ماں کی ردا ہے اور لیس کی چادر کی بیخ و بن بھی۔

''رگوں میں اب تمہاری خوشبو
کا خوں رواں ہے
ہر ایک تاگے میں ابھی تک
وہی حرارت
جو مجھ کو اپنی گداز آغوش میں چھپا کر
مرے ٹھٹھرتے ہوئے بدن کو
جمود کی موت سے بچا کر

محبتوں کی لطیف گرمی سے ڈھانپتی ہے۔‘‘ **(تمہاری چادر)**

یہاں ماضی کی قوس، حال کے دائرے سے منسلک ہوگئی ہے اور اس دائرے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ یہ مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

’’یکا یک اک روپہلی صبح کے جھل مل اجالوں میں
لچکتی جھومتی ڈالی پہ اک رنگیں شگوفہ لہلہا اٹھا
گلابی نرم ریشم سا
یہ کیسا معجزہ ہے؟ خود سے جیسے پوچھتی ہے وہ
نئی دنیا میں کھوئی اپنی باہوں میں
سمیٹے اپنے دل کش پھول کو وہ مسکراتی ہے
بہت نازاں سی
اپنی زیست کا مقصد سمجھ کر
اب نئے جذبات کی شبنم میں بھیگی کھلکھلاتی ہے۔‘‘ **(تکمیل)**

یہ زندگی کا نیا دائرہ ہے۔ اسے اوّل الذکر محرومی کا مداوا بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دائرے کی ہر قوس متحرک ہے۔ اس میں حرارت بھی ہے۔ نمو کی داخلی قوت سے یہ دائرہ نشو نما پا رہا ہے۔ لیکن اسے فنا سے مفر نہیں بلکہ یہ حقیقت کا بیانیہ بھی ہے کہ: ’’اجل، اجل ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے‘‘

پروین شیر کی خوبصورت یک موضوعی نظموں کی یہ کتاب ’’نہال دل پر سحاب جیسے‘‘ بظاہر ماں سے محرومی کی سلسلہ در سلسلہ تمثال ہے لیکن درحقیقت یہ زندگی کا اثبات بھی کرتی ہے اور پروین شیر کی فکری رجائیت کی آئینہ دار بھی ہے جس کی مصور صورتیں تصویروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے درست لکھا ہے کہ:

’’اس کتاب میں جو کارنامہ پروین شیر نے کر دکھایا ہے، اس کی اُردو میں مثال ملنی ناممکن ہے۔‘‘

میں اس کتاب کا ’’کرچیاں‘‘ کی طرح خیر مقدم کرتا ہوں۔ ’’نہال دل پر سحاب جیسے‘‘ اُردو کی نئی بستیوں سے آنے والی بے حد خوبصورت، معنی آفریں اور مشرقیت سے شرابور کتاب ہے۔ یہ کتاب دبیز آرٹ پیپر پر مکتبہ ’’شعرو حکمت‘‘ ۲۔۶۵۹۔۳۔۶۔ کپاڈیا لین۔ سوماجی گوڑہ حیدرآباد (دکن) ۵۰۰۰۸۲۔ انڈیا سے جناب مغنی تبسم کے اہتمام سے چھپی ہے۔

نوٹ: پروین شیر امریکہ میں نہیں بلکہ کینیڈا میں مقیم ہیں۔ (ادارہ)

عبدالرب اُستاد (گلبرگہ)

’’غزلیں‘‘......ایک جائزہ

’’غزلیں‘‘ وزیر آغا کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جو شان ہند پبلی کیشنز دہلی سے ۱۹۹۰ء میں چھپا۔ جس میں ۸۵ غزلیں شامل ہیں۔ ابتدائی گیارہ غزلیں محمود ہاشمی کے نام اور درمیانی انیس غزلیں میراجی کے نام اور آخری پینتالیس غزلیں، جیلانی اصغر انور سدید، جمیل یوسف اور سجاد نقوی کے نام منسوب ہیں۔

پچھلے دنوں وزیر آغا چل بسے، تو خیال ہوا کہ تعزیت کا اس سے بہتر اور طریق کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کے ادب کو سمجھنے کی کوشش کروں اور کچھ خامہ فرسائی کروں۔ وگرنہ میں اپنے آپ کو اس قابل تو نہیں پاتا کہ اردو کے اس مرد مجاہد کی تخلیقات پر قلم اُٹھا سکوں، ہاں طالب علمانہ کوشش ضرور ہے۔ ادب کا یہ مرد مجاہد جس نے ادب کی تقریباً ہر صنف پر اپنے اثرات مرتسم کئے اور آنے والی نسلوں کے لیے بہت ہی وقیع کام چھوڑا کہ وہ اس روشنی سے اپنے چراغ روشن کر سکیں اور ان کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر جانیں۔ حیدر قریشی نے ایک جگہ برملا اس کا اظہار کچھ انداز سے کیا کہ :

سارے اساتذہ ہیں مجھے محترم مگر | غالبؔ کا معتقد ہوں محبت ہے میرؔ سے
حیدرؔ نئے ادب میں تو گھائل انہیں کا ہوں | رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغا وزیر سے

وزیرؔ آغا جن کے متعلق میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ شاعر دوراں، ناقد عصر، محقق زماں، صحافی روزگار، انشائیہ نگار زمانہ، نکتہ داں، نکتہ سنج و نکتہ شناس، میر کاروانِ عصر جدید، نباض شعر و ادب، نابغہ روزگار شخص ہیں۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر ذہن کی کیفیت دگرگوں ہوگئی اور حفیظ جالندھری کا یہ مصرعہ نہ جانے کیوں زبان پر آیا کہ ع یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

وزیر آغا ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہوں نے دو صدیوں کے درمیان زندگی گذاری۔ عیسوی کے اعتبار سے بھی اور ہجری کے اعتبار سے بھی۔ بیسویں صدی میں نوجوانی اور اکیسویں صدی میں ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار فنکار کی حیثیت سے اپنے نقوش چھوڑے۔ اسطرح انھوں نے مختلف تہذیبوں اور توانائیوں کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس کا مطالعہ کیا، سوچا، اور برتا اور شعر و ادب کا حصہ بنایا۔ گویا وزیر آغا نام ہوا مختلف الجہات علمی

شخصیت کا، جس نے جس صنف ادب کو چھوا اسے ایک وقار اور مقام و معیار عطا کر دیا۔

مولانا حالؔی نے کہا تھا کہ شاعر کیلئے بلند تخئیل اور کائنات کا عمیق مطالعہ ضروری ہے۔ تو وزیر آغا کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ گویا حالؔی کی عملی تصویر تھے، کہ ان کا تخئیل بلند اور مطالعہ عمیق تو تھا ہی اور لفظوں کے تو مسیحا معلوم ہوتے ہیں۔

''غزلیں'' پڑھنے سے ایک تاثر میرے ذہن میں یہ قائم ہوا کہ وزیر آغا کو غزل لکھنے یا کہنے میں کہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی، بس آمد اور صرف آمد کی کیفیت نظر آئی ہے۔ انتہائی سبک روئی سے اور آسان اور عام فہم الفاظ میں گویا نزول شعر ہو رہا ہے۔ ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے غالبؔ کے مصرعہ کی تفہیم بھی ہوتی رہی کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

اور بیشتر غزلوں میں تو یوں محسوس ہوا اور علامہ اقبال کے مصرعہ میں تبدیلی کرتے ہوئے کہ، ع

دمادم رواں ہے یم شاعری

وزیر آغا کی زندگی شعر و غزل تو بس رواں دریا کی مانند جاری ہے۔ ہاں اس میں نہ سست روی ہے اور نہ ہی تند و تیز سیلاب کی کیفیت۔ بلکہ اس میں عجیب سی میانہ روی ہے جو اپنے اطراف و اکناف کو سیراب کرنا جانتی ہے اور وہ سیراب کرتی جا رہی ہے۔

ان پچاسی غزلوں میں کیا نہیں ہے۔ اس میں زندگی کے نشیب و فراز کی کیفیت ہے۔ حالات سے آگہی ملتی ہے۔ سیاسی و سماجی اتھل پتھل، تاریخ بھی ہے تہذیب بھی۔ مگر انداز میرؔ کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے اسلاف نے اور استاد شعراء نے بھی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا مگر وزیر آغا کا انداز دیکھئے۔

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصہ حیات　　　لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا تجھے

زندگی اک لہو کا چھینٹا ہے　　　عمر زخموں کی دیپ مالا ہے

فراغ گورکھپوری ایک جگہ لکھتے ہیں :

''شاعر کا فرض ہے کہ وہ تمام تحریکوں سے متاثر اور ان کے زندہ عناصر کو اپنی شاعری میں جذب کرتا رہے''۔

وزیر آغا بھی تقریباً تحریکوں سے متاثر رہے اور ان کے زندہ عناصر کو اپنی شاعری میں جذب کرتے ہوئے اسے ادب کا حصہ بناتے رہے۔ چنانچہ ان کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ بے رشتگی اور بے چہرگی، تنہائی رہی۔ اس میں ملکی سطح پر جو جبر و استبداد کا عالم رہا اور ایسے میں ایک حساس شخص جس انداز سے زندگی گذارتا ہے وہ بڑی کربناک ہوتی ہے۔ کچھ اس طور سے ہی گویا انھوں نے زندگی گذاری۔ ؎

جرم تھا میرا کہ میں نے جرم میں شرکت نہ کی　　　تھی مری تقصیر بس اتنی کہ بے تقصیر تھا

جھونکے سے بھی ہوا کے میں اب ٹوٹنے لگا　　　وہ دن کہاں کہ جھکتا تھا میں ٹوٹتا نہ تھا

دھنسنے لگا ہے گرد کی دلدل میں سارا شہر　　　کیا ہو گیا ہے، شہر کی آب و ہوا سے پوچھ

تجاہل کا انداز کچھ نرالا ہی واقع ہوا ہے

کیا کہوں، کس سے کہوں، کون سنے گا میری　　　ان سنی اس نے بھی کی گرچہ مرے سنگ تھا وہ

میں اس کا کچھ بھی نہیں تھا تو پھر دم رخصت　　　پلٹ پلٹ کے مجھے کس لئے وہ تکتا تھا

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا کہ وزیر آغا کی غزل میں ہر طرح کی کیفیات در آئی ہیں۔ ان میں کچھ ترکیبیں آئی ہیں جو ان کی ایجاد کردہ محسوس ہوتی ہیں کیونکہ دیگر شعراء کے ہاں نظر نہیں آتیں۔ جیسے یخ ہوا، دامن دریدہ، کوہ ندا، شہر بے مثال، شہر ناسپاس، آنسو کا دیا، مرکز عالم، ناقۂ خیال، موجۂ لباس، نخل نامراد، تن کی خشت، صحرائے بدن، یادوں کا اگنا، شگاف لب، قریہ جاں، اوس کی موتی، مشکیزہ ابر، قفل غم، سپرد پنجہ اغیار، سینے کے بند سیپ، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح ان کے یہاں ہندی لفظیات کا استعمال بھی ملتا ہے جن میں سندیسے، دیپ، آکاش، تال، دوش، سلونی، روپ، ساگر، مدھ ملتی وغیرہ۔

محبوب کا ذکر تو ہے مگر احساس کس قدر لطیف، سبک اور سہل طریقے سے کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چاپ ابھری ہے دل کے اندر سے　　　کوئی پلکوں پہ آنے والا ہے

آہ اس یاد کے پروں کا لمس　　　جس نے سارا بدن اجالا ہے

ملکی و سیاسی حالات اور خود پر گذرنے والے واقعات کو بیان کرنے کا انداز ؎

ستارہ جل بجھا، مختار تھا وہ　　　دیا مجبور تھا، جلتا رہا ہے

ستاروں اور شراروں میں ٹھنی ہے　　　محبت کی مگر یہ بھی ادا ہے

جو دل میں پھانس تھی سو رہ گئی ہے　　　بیاں ورنہ سبھی کچھ ہو گیا ہے

اس مجموعہ میں جہاں وجود کی مانوسیت اور رمزیت محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہیں فلسفیانہ فکر اور گہرائی و گیرائی بھی صاف طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خاص طور پر ''ہوا'' اور ''آنسو'' کا استعارہ ملتا ہے۔ اور مختلف انداز سے اسے برتا گیا ہے۔ ''ہوا'' کے متعلق اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

تو نے بھی خود کو مرکز عالم سمجھ لیا　　　لگ ہی گئی زمانے کی آخر ہوا تجھے

ہوا اس کو اڑا لے جا کہیں تو　　　یہ بادل اپنے پر پھیلا رہا ہے

ہاں! اے ہوا ہمیں بھی بتا ان کا کیا ہوا　　　وہ پھول سے بدن جو ترے آس پاس تھے

اندھی مسافتوں کا دیا اذن کس لئے　　　اب پوچھتا ہے میرا پتہ تو ہوا سے پوچھ

آہستہ بات کر کہ ہوا تیز ہے بہت ایسا نہ ہو کہ سارا نگر بولنے لگے

روک کر خوشبو نے میرا راستہ مجھ سے کہا اے ہوا کے سرد جھونکے چھوڑ کر مجھ کو نہ جا

اسطرح ''آنسو'' بھی بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

رو رہا ہوں ایک مدت سے مگر آنکھ سے آنسو کوئی ٹپکا نہیں

پی لیا؟ لوٹ گیا؟ خشک ہوا؟ کچھ تو بتا کیا ہوا آنکھ سے آنسو وہ ٹپکنے والا

آنسو، ستارے، جگنو، لرزتے ہوئے چراغ لاکھوں چمکتی کرچوں میں بٹنے لگی ہے شام

زمیں پر صورتیں ہی صورتیں ہیں فلک پر آنسوؤں کا سلسلہ ہے

میں یہ کہتا ہوں کہ آنسو کا دیا جل اٹھے اور پرشور سمندر کا کنارا ناچے

شاعری سے متعلق فراق گورکھپوری کا خیال کچھ اس طرح کا ہے۔

''شاعری عشقیہ غزل ہو یا نظم، اس کی حقیقی روح کئی عناصر کے باہمی حلول سے پیدا ہوتی ہے۔ .... بچپن کی معصومی و نرمی، حیات و کائنات کی سدا بہار دوشیزہ گی، فلسفی کے تفکر کا عمق اور روزن، تجربات میں حیرت و استعجاب، وجود کی مانوسیت، رمزیت اور طہارت کا احساس، محبت کا سوز و گداز اور اس کی سپردگی، انسانیت کی جوشیلی آواز اور وہ ترنم اور وہ قوت شفا، و پیام حیات جوان سب کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہیں حقیقی شاعری کے عناصر ترکیبی۔''

شعر و غزل کی جملہ عناصر ترکیبی جو فراقؔ نے گنائے ہیں بلا شبہ وہ تمام کے تمام وزیر آغا کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ ان کی غزلوں کا محض اجمالی جائزہ ہے۔

☆☆☆

''وزیر آغا جہاں توانا علمی، ادبی اور تہذیبی روایتوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہے، وہاں وہ فکر و فن کے نئے نئے رازہائے سربستہ کو دریافت کرنے کی دُھن میں بھی لگا رہتا ہے۔ اس کی شاعری کی عمارت ہماری ادبی دنیا میں ہی آباد ایک ہنستی بستی، جیتی جاگتی عمارت ہے، جس میں آنسوؤں اور ستاروں کے چراغ بیک وقت روشن ہیں۔ اس ایک ہی عمارت کی زیریں منزل میں نظم آباد ہے جس سے زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی ہے اور بالائی منزل میں غزل آوارہ خرامی کرتی ہوئی آسمان کی بے کراں وسعتوں میں اڑان پر نکل جاتی ہے۔-----

سرشت اس کی قصیدہ غزل مزاج مرا قریب لا کے بھی ہم کو جدا جدا رکھنا''

(**جمیل ملک** کے مضمون **وزیر آغا کی غزل** سے اقتباس

بحوالہ کتاب **شام کا سورج** مرتب کردہ **ڈاکٹر انور سدید** ص:۳۶۸)

حیدر قریشی

کتابِ دل و دنیا

افتخار عارف کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''مہرِ دونیم''، ''حرفِ باریاب''، ''جہانِ معلوم'' اور ''شہرِ علم کے دروازے پر'' یہ چاروں مجموعے اب تھوڑی سی نئی ترتیب کے ساتھ یکجا کر کے ایک ساتھ چھاپ دیئے گئے ہیں اور چار مجموعوں کے اس مجموعہ کا نام ہے ''کتابِ دل و دنیا''۔

ایک بار دوستوں کے ساتھ لفظ عیش کی حدود و قیود کا ذکر ہو رہا تھا تو ایک دوست نے کہا کہ انسان کا جو طبعی میلان ہو اس کے مطابق اسے کام مل جائے تو فی زمانہ یہ بہت بڑا عیش ہے۔ یہ تعریف دل کو لگی تو میرے ذہن میں کئی نام آئے لیکن سرسری گزرتے گئے اور پھر افتخار عارف کے نام پر آ کر نظر ٹک گئی۔ ادبی دنیا میں اس نوعیت کا مثالی عیش افتخار عارف کو نصیب ہوا ہے اور انہوں نے اس سے تخلیقی سطح پر بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ مختلف سرکاری علمی و ادبی اداروں میں انہیں شایانِ شان کام ملتے گئے۔ انہوں نے اپنے فرائض منصبی سے بھی ممکنہ حد تک انصاف کیا اور ان اداروں سے تعلق کے باعث اپنے اندر کے تخلیق کار کو اظہار کے لیے مناسب مواقع فراہم کیے۔ یوں ان کے شعری ممکنات کھل کر سامنے آتے گئے۔

جہاں تک افتخار عارف کی شاعری کی اہمیت کا تعلق ہے، میرا خیال ہے وہ ''مہرِ دونیم'' کی اشاعت سے پہلے ہی نہ صرف اہلِ ادب کو پوری طرح متوجہ کر چکی تھی بلکہ اپنا معترف و گرویدہ بھی کر چکی تھی۔ ''مہرِ دونیم'' سے لے کر ''کتابِ دل و دنیا'' تک صرف افتخار عارف کے شعری ممکنات ہیں جو مزید نمایاں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ افتخار عارف کی بنیادی پہچان ان کی غزل ہے۔ یہ غزل اپنی روایت اور جدید غزل کی درمیانی سرحد پر اس طرح نمایاں ہے کہ دونوں طرف اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

کوئی جنوں، کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش عذابِ دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر سگِ زمانہ ہیں ہم کیا، ہماری ہجرت کیا

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

حامی بھی نہ تھے منکرِ غالب بھی نہیں تھے — ہم اہلِ تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے

سمندر اس قدر شوریدہ سر کیوں لگ رہا ہے — کنارے پر بھی ہم کو اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

ہم نے چپ رہنے کا عہد کیا ہے اور کم ظرف — ہم سے سخن آراؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

کھیل تماشا بربادی پر ختم ہوا — ہنسی اُڑا کر بازی گر خاموش ہوئے

زعمِ حشم جُبہ و دستار بھی دیکھ آئیں — آئے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار بھی دیکھ آئیں

راس آنے لگی دنیا تو کہا دل نے کہ جا! — اب تجھے درد کی دولت نہیں ملنے والی

دل پاگل ہے روز نئی نادانی کرتا ہے
آگ میں آگ ملاتا ہے پھر پانی کرتا ہے

آگ جب آگ سے ملتی ہے تو لو دیتی ہے — خاک کو خاک کی پوشاک سے خوف آتا ہے

رحمتِ سیدِ لولاکؐ پہ کامل ایماں — امتِ سیدِ لولاکؐ سے خوف آتا ہے

جواب آئے نہ آئے سوال اُٹھا تو سہی — پھر اُس سوال میں پہلو نئے سوال کے رکھ

ایک ہم ہی تو نہیں ہیں جو اٹھاتے ہیں سوال — جتنے ہیں خاک بسر شہر کے سب پوچھتے ہیں

میں ایسے خواب کی پاداش میں معتوب ٹھہرا — جو ساری عمر بے تعبیر رہنے کے لیے ہے

اے اجرِ عظیم دینے والے!
توفیقِ گناہ چاہتا ہوں

ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں — دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں

قلم آلودۂ نان و نمک رہتا ہے پھر بھی — جہاں تک ہو سکے آزاد رکھنا چاہتے ہیں

ہم بھی سوچیں گے دعائے بے اثر کے باب میں — اک نظر تو بھی تضادِ منبر و محراب دیکھ

تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے — کہ کب پردہ گرے گا کب تماشا ختم ہوگا

تیر و شمشیر کی شہ پا کے اچھلتے ہوئے لوگ — یہ ہیں رسوائے زمانہ انہیں نامی نہ سمجھ

میں ایک سلسلۂ آتشیں میں بیعت تھا
سو خاک ہو گیا نام و نشاں کے ہوتے ہوئے

آرزوؤں کا ہجوم اور یہ ڈھلتی ہوئی عمر — سانس اکھڑتی ہے نہ زنجیرِ ہوس ٹوٹتی ہے

یہ میرے دشمن یونہی تو پسپا نہیں ہوئے ہیں
کوئی تو ہے لے رہا ہے جو انتقام میرا

شہرِ جاں بخش ہمیں تُو تو حقارت سے نہ دیکھ — جیسے بھی ہیں تری آغوش کے پالے ہوئے ہیں

غزلوں سے یہ اشعار کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں اپنے موجودہ موڈ اور کیفیات کے مطابق کرتا گیا ہوں۔تاہم صرف ان اشعار سے بھی افتخار عارف کی غزل کے موضوعاتی تنوع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس غزل کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔بعض لکھنے والوں نے کوئی نکتہ آفرینی کی ہے تو بعد والوں نے اس نکتہ آفرینی سے اختلاف کر کے بات سے بات نکالنے کا ہنر دکھا دیا ہے۔یہ نسخہ میرے لیے بھی کارگر ہو سکتا ہے لیکن میں کوئی تنقیدی کاری گری دکھانے کی بجائے صرف افتخار عارف کی غزل پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

بابِ عقیدت میں جتنی دینی شاعری شامل ہے وہ دینی شاعری ہو کر بھی ادب کے اعلیٰ معیار کی حامل ہے۔بات صرف عقیدے اور عقیدت تک نہیں رہتی بلکہ اس میں اس عہد کے المیوں کی گونج ایک دعائیہ آہنگ پیدا کر دیتی ہے۔ویسے بھی دعا افتخار عارف کی زندگی اور شاعری میں ایک مضبوط ستون کی طرح موجود ہے،جس نے ان کی زندگی اور شاعری کو مضبوط سہارا دے رکھا ہے۔عقیدت سے مملو شاعری نظمیہ ہے لیکن اس پر افتخار عارف کی غزل کا مزاج پوری طرح حاوی ہے۔بلکہ افتخار عارف کی دوسری نظمیں،آزاد نظمیں ہوتے ہوئے بھی حقیقتاً غزل ہی کے زیرِ اثر ہیں یا غزل کی توسیع ہیں۔وہ جدید نظم بہت اچھی کہتے ہیں لیکن اس کے ڈانڈے راشد اور میراجی کی نظم کی بجائے اقبال اور فیض کی نظم سے ملتے ہیں۔اقبال اور فیض کی نظمیں بھی غزل کی روایت کے زیرِ اثر رہی ہیں اور اسی روایت کی توسیع کرتے ہوئے ان کی نظموں میں ظاہر ہوئی ہیں۔کہیں کہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اقبال اور فیض کی نظمیہ روایت سے ہٹ کر اختر الایمان کی نظمیہ روایت کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں،جو خود اقبال کی نظم اور راشد و میراجی کی نظم کے درمیان اپنی الگ پہچان بناتے دکھائی دیتے ہیں۔

ان کی سیاسی علائم پر مبنی نظموں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہیں میڈیا کے حالاتِ حاضرہ کے سیاسی و عالمی حوالوں سے بھی سنایا جا سکتا ہے،اور مختلف اینکر پرسنز کے ذریعے سنایا جاتا رہتا ہے۔یہ کوئی ادبی خوبی والی بات تو نہیں لیکن جب ''گفتگو عوام سے ہے'' تو پھر ایسی نظموں کا بلکہ ساری شاعری کا میڈیا پر سنایا جانا اور پسند کیا جانا بھی بہر حال ایک اضافی خوبی بن جاتا ہے۔

''کتابِ دل و دنیا'' افتخار عارف کا اب تک کا شعری اثاثہ ہے لیکن یہ ''کلیاتِ میر'' یا کلیاتِ منیر'' نہیں ہے۔الحمدللہ افتخار عارف زندہ بھی ہیں اور تخلیقی لحاظ سے بدستور متحرک بھی۔سو اس کتابِ دل و دنیا کے نئے ایڈیشنز میں ابھی مزید اضافوں کی امید کی جانی چاہیے۔میں اسلام آباد سے بھیجے جانے والے اس خوبصورت تحفہ کے لیے افتخار عارف کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ''کتابِ دل و دنیا'' کا اپنی محدود دنیا میں تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں!

حیدر قریشی

ڈاکٹر حامد اشرف کی تنقید نگاری

چند برس پہلے ایک ادبی رسالہ میں ڈاکٹر حامد اشرف کا گوشہ شائع ہوا تو اس میں میری یہ رائے شامل تھی۔

''ڈاکٹر حامد اشرف نے تخلیقی طور پر افسانہ اور شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔اس میدان میں وہ کس حد تک کامیاب رہتے ہیں،اس کا بہتر اندازہ اس وقت کیا جا سکے گا جب ان کے افسانوی اور شعری مجموعے شائع ہوں گے۔تنقیدی طور پر ان کے مضامین اس حد تک موضوعاتی تنوع کے حامل ہیں کہ جہیز کی لعنت کے مسائل سے ہوتے ہوئے اور گلبرگہ اور حیدرآباد کے مقامی ادبی احوال سے گزرتے ہوئے انہوں نے دنیائے ادب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی ہوئی ہے۔اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے ذریعے انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اردو ادب کی تنقید کی طرف توجہ کی ہے۔یونیورسٹی مقالات کے بعد سے ان کی توجہ تنقید کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔مجھے ان کے مقالات میں جو ایک عمومی خوبی دکھائی دی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی بین الاقوامیت کی بجائے ادب کی مقامیت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ادب کو اس کے مقامی پس منظر اور مقامی موجود معیارات کی رو سے پرکھتے ہیں۔مجھے لگتا ہے کہ مغربی ادب کے معیارات سے مزید واقفیت کے بعد وہ اپنے اسی مقامیت کے انداز کو عمدہ طریق سے آگے بڑھا سکیں گے۔

مغربی ادبی تنقید کا مطالعاتی تاثر ذہن میں رہے تو اردو ادب کی پرکھ کے لیے ہم بہتر طور پر اپنے مقامی ادبی معیار وضع کر سکیں گے۔مغربی تنقید سے استفادہ کر کے اردو ادب کو مغرب کا تابع مہمل بنانے کی خواہش رکھنے والے بعض ''بڑوں'' کی مابعد جدید تنقیدی بصیرت کا بھانڈا تو عالمی چوراہے پر پھوڑا جا چکا ہے۔۔۔۔وہاں سے ان کے بلا حوالہ ترجمہ (دراصل سرقہ) کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔سو اب ضرورت ایسے ناقدین کی ہے جو مغربی ادب سے بھی واقفیت رکھتے ہوں، نئے عالمی تناظر سے بھی باخبر ہوں اور ان سب کے ساتھ ادب کی اپنی مقامیت سے ہی اپنی شناخت کو ظاہر کر سکیں۔مجھے ڈاکٹر حامد اشرف ایک ایسے ہی نوجوان نقاد معلوم ہوتے ہیں، جو آگے چل کر اسی نہج پر کام کر کے اردو ادب کے لیے اپنے معیارات کی تشکیل کا کام کر سکیں گے۔میری دعا ہے کہ ان سے اور ان جیسے دوسرے نوجوان نقادوں سے وابستہ میری توقعات پوری ہو جائیں!''

اب ڈاکٹر حامد اشرف کا مضامین کا مجموعہ ''ترازوئے شعر'' شائع ہونے جا رہا ہے تو مجھے ان کی تنقید نگاری کو

مزید قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔اور ایسے لگا ہے کہ وہ آہستہ روی کے ساتھ سہی لیکن تدریجاً آگے بڑھ رہے ہیں۔ادب کی مقامیت کو اہمیت دینے کا ان کا جو رویہ ہے وہ اپنی جڑوں میں اترنے جیسا لگتا ہے۔مخدوم کی نظم کا مطالعہ ہو یا ڈاکٹر راہی قریشی کی شاعری ہو،محمد علی مہکری ہوں یا ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی ان سب کی شاعری کو موضوع بنا کر اپنے مقامی ادبی منظر کے ماضی و حال کو روشن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔حیدرآباد کرناٹک کے لوک گیتوں کی بات ہو یا اس علاقہ کی غزل ہو،ڈاکٹر حامد اشرف اپنے مقامی،اپنے زمینی حوالوں کو ان کی خوشبو کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔پھر وہ موضوعاتی پھیلاؤ کے ساتھ عمر خیام،علامہ اقبال،مولانا الطاف حسین حالی سے لے کر ڈاکٹر وزیر آغا تک اپنے خیالات کا الگ الگ اظہار کرتے ہیں۔ان سب کے حوالے سے ان کے چار مضامین جہاں ان علمی و ادبی شخصیات کا تعارف کراتے ہیں وہیں ان سب کے تئیں ڈاکٹر حامد اشرف کے مطالعاتی انداز کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اردو ماہیا پر بھی ان کی تنقیدی نظر دکھائی دیتی ہے۔نذیر فتح پوری اور امین بابر کی ماہیا نگاری پر ان کے مضامین ان کی ماہیا فہمی کی غمازی کرتے ہیں۔

''نظم اور مطالعۂ نظم''،مضمون نصابی نوعیت کی معلومات فراہم کرتا ہے۔بعض دوسرے مضامین میں بھی کہیں کہیں ایسا احساس ہوتا ہے جیسے درسی نوعیت کی معلومات فراہم کی جا رہی ہے۔لیکن ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی اور بالخصوص نام نہاد ''بین الاقوامی شاعروں اور ادیبوں'' کی ایسے ادبی موضوعات سے عمومی عدم دلچسپی اور ناواقفیت کی بنا پر ایسی نصابی نوعیت کی معلومات کی فراہمی بھی ضروری ہو گئی ہے۔

مجموعی طور پر ''ترازوئے شعر'' کے نام سے لے کر اس کتاب کے مضامین کے مطالعہ تک ڈاکٹر حامد اشرف کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔انہیں حوالوں سے مستقبل میں ان کی تنقیدی سوجھ بوجھ کے امکانات بھی کافی حد تک دکھائی دے رہے ہیں۔ڈاکٹر حامد اشرف کی اس کتاب کی اشاعت پر انہیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے میں ان کی علمی و ادبی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ سقراط کے پاس کسی مسئلہ کے حل کرنے کی غرض سے گئے۔جواب میں سقراط نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔لوگوں نے اس سے کہا کہ ہم میں اور تم میں کیا فرق رہا۔ہم بھی نہیں جانتے اور تم بھی نہیں جانتے۔سقراط نے کہا۔مجھے یہ معلوم ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا اور تم لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔یہاں ایسی ہی ایک مشہورِ زمانہ ہستی کا ذکر مقصود ہے' جو شعبہ ہائے علوم و فنون کا ماہر تھا' لیکن اس کا کہنا تھا کہ زمین آسمان' سورج چاند' تو جاہل بھی جانتا ہے' کسان بھی زمین سے دو بار' اناج نکالنا جانتا ہے' لیکن عالم بھی خدا کو نہیں جان سکتا۔اس لیے عالم کو اپنی لاعلمی پر ناز کرنا چاہیئے' کیونکہ ہر آدمی لاعلمی کے مرتبے پر نہیں پہنچ سکتا۔

(**ڈاکٹر حامد اشرف** کے مضمون **عمر خیام**: **شرابِ حقیقت کا طلب گار** سے اقتباس)

آپ کے خطوط، ای میلز، تاثرات

راقم کے دفتر میں ۱۲ بجے حسب معمول شعبے کے تمام اساتذہ چائے کے بہانے اکٹھے ہو جاتے ہیں، چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ اتنے میں آفس سپرنٹنڈنٹ ڈاک لے کر اندر داخل ہوتا ہے۔ روایت کے مطابق ہمیشہ بند لفافوں میں سے کتب والے لفافوں کو اولیت دیتے ہوئے جب تیسرے لفافے کو میں نے کھولا تو ایک لیکچرار نے پیارے لہجے میں کہا، سر یہ کون سی کتاب آئی ہے جس کی وجہ سے آپ کے چہرے پر خوشی ابھر آئی ہے؟ (مجھے پہلی دفعہ کسی نے احساس دلایا کہ میرا چہرا خوشی اور دکھ کے معاملے میں دوسروں کا ہمراز ہوتا ہے) چہرے پر خوشی کے تاثرات خود بخود مسکراہٹ کا روپ اختیار کر جاتے ہیں اور میں اسی روپ میں جواب دیتا ہوں بھائی جرمنی سے جدید ادب آیا ہے۔ یہ تو پہلا تاثر تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے پہلی کی طرح اس شمارے کا ٹائیٹل مجھے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرتا ہے، اسے ذہن میں رکھتے ہوئے فہرست کے بعد گفتگو کے زیر عنوان ایک ہی سانس میں آپ کی تحریر پڑھ ڈالتا ہوں۔ مجھے حیرانگی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرانگی آپ کے سلیقے کو دیکھ کر ہوئی کہ آپ، قلم کی معرفت احساسات کو منظر میں بدلنے کا فن تو جانتے ہی تھے لیکن آپ کی طرف سے تصویر اور تحریر (ٹائیٹل اور ر گفتگو) کا یہ اتحاد اور اس کے پیچھے آپ کی محنت اور محبت کو دیکھ کر داد دینے کو جی چاہا۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ کینیڈا اور انگلینڈ کے تین دوستوں کے ہمراہ مصطفیٰ کمال پاشا صاحب نے آپ ہمت بندھائی اور جدید شمارہ ۱۵ ہم تک پہنچا۔ راقم آپ کے لیے اور فرشتہ صفت چار یاروں کے لیے دعا گو ہے جو دور دیس میں ایک دوسرے کی ہمت بندھائے چمن اردو کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ الماس کا گیارہواں شمارہ آپ کو مل چکا ہوگا۔

آپ کا اپنا **ڈاکٹر یوسف خشک** (شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور۔ سندھ)

جدید ادب جرمنی کا شمارہ نمبر ۱۵ شائع ہو گیا

حیدر قریشی اور ڈاکٹر نذر خلیق کی ادارت میں جدید ادب جرمنی کا شمارہ نمبر ۱۵ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء) شائع ہو گیا ہے۔ اس شمارہ میں **حمد و نعت** کے تحت غلام مرتضیٰ راہی، حفیظ انجم، ارشد کمال اور تبسم وڑائچ کی منظومات شامل ہیں۔ **مضامین** کے سیکشن میں سید حسن جعفر زیدی (نظریۂ پاکستان ایک تاریخی مغالطہ اور موجودہ بحران)، خادم علی ہاشمی، (الکندی اور رمز شناسی)، ڈاکٹر ارشد جمال (غالب کا احساس کمتری)، عبدالرب استاد (مولانا آزاد شش

جہت شخصیت)، صبیحہ خورشید (ماہیے کی تحریری ہئیت اور ماہیے کا وزن) اور نور الہدیٰ (ارشد کمال: مصلوب روزگار) کے مضامین اور کاوش عباسی کا مدیر جدید ادب کے نام ایک خط شامل ہیں۔ **ڈاکٹر وزیر آغا** کی دو طویل نظموں **''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی''** (دونوں کتابوں کو) اس شمارہ میں اس طور شامل کیا گیا ہے کہ دو طویل نظموں کا **گوشہ** سجایا گیا ہے۔ **غزلوں** کے باب میں میرا جی، ساقی فاروقی، مظفر حنفی، ندا فاضلی، اکبر حمیدی، نسیم سحر، شہناز نبی، کاوش پرتا پگڈھی، کاوش عباسی، احمد حسین مجاہد، صادق باجوہ، غلام مرتضیٰ راہی، راجہ یوسف خان، تبسم وڑائچ، حمیدہ معین رضوی، عاطر عثمانی، نصرت گوالیاری، منظور ندیم، جمیل الرحمٰن، رشید ندیم، رؤف خیر، علی زبیر، منور احمد، جان عالم، سرور عالم راز، سعید خان، نذر عباس، مسرت انجم کی غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ جبکہ شبانہ یوسف کی چھ، اور ارشاد عرشی و حیدر قریشی کی چار چار غزلیں شامل ہیں۔ **افسانوں** کے تحت جوگندر پال، عبداللہ جاوید، انور زاہدی، شہناز خانم عابدی، ڈاکٹر بلند اقبال، ماجد شاہ، احمد زغلول الشیطی، اقبال حسن آزاد، طالب کاشمیری اور فوزیہ مغل کے افسانے دیئے گئے ہیں۔ **نظموں** کے حصہ میں ستیہ پال آنند، افتخار عارف، ندا فاضلی، عامر سہیل، کاوش عباسی، طالب انصاری، توقیر عباس، فہیم شناس کاظمی، ساحل علی، پروین شیر، اشکر فاروقی، عاطر عثمانی، مبشر سعید، سعید خان، سلیمان جاذب، تصنیف حیدر کی نظمیں شامل ہیں۔ ان کے ساتھ انور زاہدی کی پانچ، تنہا تما پوری کی نو اور شبانہ یوسف کی چار نظمیں شائع کی گئی ہیں۔

خصوصی مطالعہ کے سیکشن میں ساقی فاروقی، احمد ہمیش، انجلا ہمیش اور ریکھا میترے کی **نثری نظمیں**، اکبر حمیدی اور محمد زبیر ٹیپو کے **انشائیے** اور حیدر قریشی کی یادوں کا نیا باب **"لبیک الھم لبیک"** دیا گیا ہے۔ اسی حصہ میں **ہائیڈل برگ یونیورسٹی** میں ہونے والی ایک ادبی تقریب میں ستیہ پال آنند کے خیر مقدم میں پڑھا گیا مضمون اور اس تقریب کی رپورٹ بھی شامل ہے۔ ممتاز شاعر **ایوب خاور کے لیے ایک گوشہ** مختص کیا گیا ہے۔ اس گوشہ میں احمد ندیم قاسمی، اختر حسین جعفری، گلزار، ڈاکٹر انور سجاد، عطاء الحق قاسمی، شکیل عادل زادہ، امجد اسلام امجد، حیدر قریشی کے مضامین ر تاثرات شامل ہیں، ایوب خاور کی شاعری میں سے حمد، نعت، سلام، دعا اور غزلوں، نظموں کا ایک عمدہ انتخاب بھی اس گوشہ کی زینت ہے۔

جدید ادب کے اس شمارہ کے **ماہیا سیکشن** میں ندا فاضلی، جگدیش پرکاش، امین خیال، نذیر فتح پوری، طاہر عدیم، امین بابر اور جیم فے غوری کے ماہیے شامل ہیں۔

کتاب گھر میں، پرواز (عزیز الرحمٰن سلفی)، بالا دست) نوشابہ خاتون)، کسک (آر کے نیازی)، اُس گلی میں (سید علی محسن)، کہانی کوئی سناؤ متاشا (صادقہ نواب سحر) پر مختصر تبصرے کیے گئے ہیں۔ جبکہ اکبر حمیدی کی کتاب ''جھاڑیاں اور جگنو'' پر منشا یاد، باقر نقوی کی ''نوبیل ادبیات'' پر سحر انصاری، فتح محمد ملک کی ''اقبال فکر و نظر پر ایک نظر'' پر ڈاکٹر نذر خلیق، امین بابر کے ماہیوں ''سپنوں کا میلہ'' پر ڈاکٹر حامد اشرف اور نعیم فاطمہ علوی کی ''سفرنامۂ

ہندوستان'' پر آر کے نیازی کے نسبتاً تفصیلی مضامین شامل ہیں۔**خطوط** کے حصہ میں ندا فاضلی ،احمد حسین مجاہد،فضیل جعفری،مظفر حنفی ،ارشد خالد،ستیہ پال آنند،علی احمد فاطمی،مبشر میر،رؤف خیر،شہناز خانم عابدی،عبداللہ جاوید،فوزیہ مغل،غلام مرتضٰی راہی،فیاض احمد وجیہہ،انجلا ہمیش،اقبال حسن آزاد،حمیدہ معین رضوی اور طالب کشمیری کے خطوط اورای میلز کوشامل کیا گیا ہے۔

۳۱۲صفحات پر مشتمل جدیدادب کا یہ شمارہ سابقہ شماروں کی طرح بھر پور ہے۔عصری ادب کی ایک نمایاں جھلک اس کے ذریعے دیکھی جاسکتی ہے۔ **ارشد خالد**(اسلام آباد)

جدیدادب ۱۵ ملا،شکریہ۔آپ کی ''گفتگو'' سے اندیشہ ہائے دور دراز سر اُٹھاتے ہیں۔آدھا کلو وزن تک کتابیں صرف پندرہ روپے میں پاکستان کے لیے اور ۲۷ روپے میں دیگر ممالک کو بھیجی جاسکتی تھیں۔اب ایک کتاب پر دو تین سو روپے خرچ آتا ہے،چنانچہ ہندوستان سے باہر کتاب بھیجنے کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔۔۔

نظریۂ پاکستان کے سلسلے میں حسن جعفر زیدی (لاہور) کا مضمون بہت آنکھیں کھولنے والا ہے۔اس نقطۂ نظر کو جانب داری سے بچانے کے لیے اس پر مذاکرہ کی ضرورت ہے تاکہ یہ غیر مذہبی نقطۂ نظر علمی حیثیت اختیار کر سکے۔ویسے یہ بحث ہی از کارِ رفتہ ہے۔جو ہونا تھا سو ہو چکا۔بہر حال آپ اس قسم کے مجتہدانہ مضامین سے ادب کے شائقین کو نوازتے ہیں تاکہ ہم محض قافیہ ردیف ہی میں نہ الجھے رہیں یا افسانہ نگاری ہی نہ کرتے رہیں بلکہ چوکنے رہیں،اپنے حال،ماضی و مستقبل سے آگاہ رہیں۔''الکندی اور رمز شناسی'' بھی چونکانے والا مضمون ہے۔

میں پندرہ سال تک عدالت (سٹی سول کورٹ حیدرآباد) میں سٹینو گرافر تھا اور پھر میرے ایک دوست پولیس میں ریڈیو آپریٹر تھے،یعنی وہی ٹِٹاں ٹاں ٹاں ٹِٹاں ٹاں ٹاں میں پیغامات بھیجتے اور قبول کرتے تھے۔پروفیسر خادم علی نے موجودہ دور کی رمز شناسی پر خوب روشنی ڈالی ہے۔یہ مضمون تیکنیکی ہوگیا ہے لیکن اربابِ ادب کو اس سے بھی واقفیت ہونی چاہئے۔ماہیے کی تحریری ہیئت پر صبیحہ خورشید نے بھر پور مضمون لکھا ہے۔آپ کو ماہیے سے جو فطری لگاؤ ہے اس کی روشنی میں جدید ادب میں یہ مزہ دیتا ہے۔

آپ کا لکھا **لبیک اللھم لبیک** پڑھتے ہوئے آپ کی سلامتی کی دعائیں نکلتی رہیں۔بھئی خواب بہر حال خواب ہوتا ہے۔میرا خیال ہے آپ کوئی پیغمبر نہیں جن کے خواب سچے ہوا کرتے ہیں۔اللہ آپ کو سلامت رکھے۔موت کا خیال دل سے نکال کر زندگی کو گلے لگانا ہی پڑتا ہے،ہر چند موت اک حقیقی سچائی ہے۔اسی لیے رسول اللہؐ نے فرمایا ہر نماز کو اپنی آخری نماز سمجھو۔میرے ہاں ایک تازہ غزل ہوئی ہے (وہ آپ کو بھیج رہا ہوں) اس کا ایک شعر سنیئے:

اسی لیے تو میں نمٹا رہا ہوں کام اپنے میں جانتا ہوں کہ مہلت ہے آج تک کی مجھے

اس موضوع پر آپ کے بہت سارے اچھے شعر پڑھنے کو مل گئے۔کسی ریسرچ سکالر کو موت پر اشعار جمع کرنے کا

موقع ملے تو ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔اللہ کرے پچھلی اکیس ستمبر جیسی عید الفطر آپ ہر سال مناتے رہیں۔یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے تمام بیٹے فرماں بردار ہیں۔مبارک۔۔۔آپ تین دسمبر کے خواب سے پریشان نہ ہوں،ہم تو چھے (۶) دسمبر کے بھیانک خواب (کابوس) کو برداشت کیے جا رہے ہیں۔

ایوب خاور کی تخلیقات پر گزشتہ شمارے میں آپ نے خوب لکھا تھا۔اس بار اُن سے مکمل تعارف ہوا۔گویا وہی خیمہ گاہِ سکینہ ہے،وہی سجدہ گاہِ امام ہے! ایوب خاور غزل کے قوافی کے بارے میں کچھ زیادہ ہی لبرل لگتے ہیں۔

خمار ذات کی حدت سے جھومتا ہوا دیکھ دیا ہوا کے سمندر میں تیرتا ہوا دیکھ

شعر تو خیر ٹھیک ہیں مگر جھومتا،تیرتا،رینگتا،ٹوٹتا،بیٹھتا،پھیلتا،گونجتا،کھیلتا کیسے قافیے ہوں گے؟ ان میں حرفِ روی کیا ہے؟ اللہ کرے جدید ادب کے مسائل حل ہوں اور ہم اس سے محروم نہ ہونے پائیں۔

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۵ (جولائی تا دسمبر) کے انٹرنیٹ پر جلوہ افروز ہونے سے قبل ہی جس خلوص سے آپ نے اس کی کاپی بذریعہ ای میل بھیجی اس کے لئے بے حد شکریہ۔حالیہ شمارہ بہت شاندار اور قابل تعریف ہے۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔اس جریدے کے لئے آپ کی عرق ریزی اور لگن کی داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔اللہ آپکو اس کارِ عظیم کے لئے مزید ہمّت اور صحت عطا فرمائے۔جریدے کے تمام ہی مشمولات توجہ طلب ہیں۔افسانوں میں جوگندر پال کا افسانہ بہترین افسانہ ہے جس میں شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور افسانے کا فطری بہاؤ اور تسلسل کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتا جبکہ جناب عبداللہ جاوید کا افسانہ گہرے معنی و مفاہیم کا آئینہ دار ایک شاہکار افسانہ ہے۔دور حاضر کا انسان جو مادّہ (matter) کی پرستش کے جنون میں مبتلا ہوکر اپنے باطنی اسرار کی رفعتوں سے شعوری اور لاشعوری طور پر چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہے عبداللہ جاوید نے نہایت خوبصورتی سے ان اسرار پر سے پردہ ہٹایا ہے اور یوں انکے قلم نے ایک کامیاب افسانہ تخلیق کیا ہے۔طالب کاشمیری اور شہناز خانم عابدی صاحبہ کی گرفت بھی افسانوں پر مضبوط رہی۔ڈاکٹر بلند اقبال کا اسلوب انکی کہانی پر حاوی رہا اور اسلوب نے کہانی کو اپنے حصار میں لئے رکھا۔دیگر افسانے بھی اچھے رہے۔ خصوصی مطالعے کے ذیل میں اکبر حمیدی صاحب کے انشائیے کی لطافت اور نزاکت قابل ستائش ہے۔حیدر قریشی کا لبیّک الھم ّ لبیّک مجموعی اعتبار سے ایک حساس مضمون ہے جو باطنی اور خارجی کیفیات کا بھر پور ترجمان ہے تفصیلی مطالعے میں بالخصوص منشا یاد اور نذر خلیق کے مضامین اچھے لگے۔خوبصورت اور معیاری جریدے کی اشاعت پر مبارکباد۔۔۔

منیزہ جمال۔ (جدّہ۔سعودی عرب)

آج ہی مجھے ''جدیدادب'' کا تازہ شمارہ ملا ہے جوحسبِ روایت اپنی تمام تر ادبی رعنائیوں سے مزّین ہے۔ٹائٹل کا ماہیا ہی سوچوں کے کئی در کھول گیا:

جب 'عصر' اشارہ ہوا/ سُو دمیں ڈھلنے لگا/ جتنا بھی خسارہ ہوا

اب معلوم نہیں یہ ''جدیدادب'' سے وابستگی کا اثر ہے کہ اب سب سے پہلے نظر ماہیوں پر ٹھہرتی ہے اس بار بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ ماہیوں میں ندا فاضلی ،جگدیش پرکاش، نذر عباس، استاد امین خیال، نذیر فتح پوری، طاہر عدیم، امین بابر، جیم فے غوری، تک کے ماہیے ایک ہی نشت میں پڑھ لیے۔طاہر عدیم کا ماہیا

پانی ہے مری ہستی/ اُبلوں جتنا بھی/ پر آگ نہیں لگتی

بہت خوبصورت معنی در معنی لیے ہوئے ہے۔محترمہ صبیحہ خورشید صاحبہ کی تحریر ''ماہیے کی تحریری ہیئت'' ماہیے کو سمجھنے میں بہت اہم لگی۔(آپ کے خطوط) میں پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد) کا بھرپور خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔میری پروفیسر صاحب سے دسمبر ۲۰۰۸ء میں جب یہ لاہور آئے ہوئے تھے تو فون پر بات ہوئی۔ پھر جب پچھلے دنوں افضل منگلوری لاہور آئے تو بھی پروفیسر صاحب کی خیر خیریت سے آگاہی ہوئی۔ ''جدیدادب'' شمارہ نمبر ۱۵ میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ایوب خاور صاحب کا گوشہ انشاءاللہ اطمینان سے پڑھوں گی۔ڈاکٹر وزیر آغا صاحب ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت یابی کے ساتھ عمرِ دراز عطا فرمائے۔

فوزیہ مغل (لاہور)

انٹرنیٹ پر پہلی بار جدیدادب کا مطالعہ کیا۔ بہت لطف آیا۔غزلیں، نظمیں، ماہیا نے میرے ذوق کو تقویت بخشی۔ میرا جی ،ساقی فاروقی ،مظفر حنفی ،ندا فاضلی ،اکبر حمیدی ،شہناز نبی ،کاوش پرتا پگڈھی ،کاوش عباسی ،صادق باجوہ ،غلام مرتضی راہی ،ستیہ پال آنند، افتخار عارف، جگدیش پرکاش، نذر عباس، امین خیال، طاہر عدیم اور دیگر شعراء کرام کے کلام نے بہت متاثر کیا۔اور تفصیلی مطالعہ، کتاب گھر، حسن جعفر زیدی (نظریہ پاکستان) ڈاکٹر ارشد جمال، ایک گوشہ میں آپ کا خوبصورت انداز تحریر نے دل موہ لیا۔ڈاکٹر وزیر آغا کا اپنا ہی منفرد انداز ہے۔ جدیدادب، عہد جدید کے تمام ادبی تقاضے پورے ہی نہیں کر رہا بلکہ دنیائے ادب کے چمن میں نوزائیدہ و توانا پودوں کی آبیاری بھی کر رہا ہے۔ میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔آپ کی یہ دیرینہ کوشش جو میرے لئے نئی ہے واقعی دنیائے ادب کا بیش قیمت خزانہ ہے۔

افضل چوہان (مظفر گڑھ)

جدیدادب ملا، شکریہ۔آپ کا ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' پر تبصرہ ایک قابل نقاد کا ریویو ہے۔تقریباً ہر جملے پر ایک آرٹیکل لکھا جا سکتا ہے۔شکریہ اور مبارک باد!

صادقہ نواب سحر ()

جدیدادب شمارہ نمبر ۱۵ میں حسن جعفر زیدی صاحب کا یہ عالمانہ مضمون تقسیم ہند کے موضوع پر ایک نئی سوچ کا آغاز ہے۔انہوں نے تاریخ کے پس منظر میں اس متھ پر روشنی ڈالنے اور اسے مسمار کرنے کی کوشش کی ہے کہ برِ صغیر کی تقسیم کا باعث جناب محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی مسلمانوں کے لیے اسلامی نظام پر مبنی ایک الگ ہوم لینڈ حاصل کرنا تھا۔حسن زیدی کے مطابق ان کا مطالبہ تو صرف مسلمان اکثریت والے صوبوں کو اٹانومی دے کر ہندوستان کی سرحدوں کے بیچ ہی ایک ''ڈھیلے ڈھالے'' نظام کی تشکیل کا تھا۔بقول حسن جعفر زیدی اگر'' کانگریس کی تنگ نظر قیادت اور برطانوی سامراج تھوڑی دانشمندی کا مظاہرہ کرتے اور ڈھیلے ڈھالے وفاق پر مبنی گروپنگ سکیم کے تحت انتقال اقتدار کر دیتے تو یہ عذاب نہ ٹوٹتا''۔ان کے مطابق: ''نظریۂ پاکستان، نظریاتی سرحدیں، نظریاتی ریاست، اسلامی ریاست، اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات، اسلامی نظام، نفاذِ شریعت، حکومتِ الٰہیہ کا قیام، اسلامی نظام کی تجربہ گاہ'' وغیرہ کا بیج بعد میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

قائدِ اعظم اور علامہ اقبال نے کبھی بھی مذہبی نظام کی وکالت نہیں کی۔اس سلسلے میں حسن صاحب نے مسلم لیگ کے اجلاسوں میں علامہ اور جناح صاحب کے بیانوں کا حوالہ دیا ہے۔ایک بات اور انہوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کی اٹانومی کا نظریہ Hindu borgouise and Muslim proletariat کے بیچ بڑھتی ہوئی کھائی اور برٹش حکومت کی پالیسیز کا نتیجہ تھا۔ یہاں حسن صاحب شاید اپنی لیفٹ اورئینٹیڈ پروگریسو سوچ کا نظریہ پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک جناح صاحب کے نظریے کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں اب مورخین تسلیم کرنے لگے ہیں کہ وہ کبھی بھی فرقہ پرست نہیں رہے۔اس سلسلے میں آسٹریلین ہسٹورین Jan Byrant Wells کی کتاب 'Ambassador of Hindu Muslim Unity: Jinnah's Early Politics' کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے:

" throughout his political career, Jinnah remained a nationalist and anti-imperialist and there is no difference between his early or late periods of political life"(Quoted by Mubarak Ali author of "Pakistan: In search of identity")

بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر جسونت سنگھ نے بھی اپنی کتاب " Jinnah: India,Partition, Independence " میں جناح کو سیکولرسٹ قرار دیا ہے۔اسی پارٹی کے سربراہ لال کرشن ایڈوانی بھی یہی سوچ رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ کانگریس کی قیادت کو تنگ نظر قرار دینا بھی تاریخ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔گاندھی جی نے مذہب کی بنا پر تقسیم کی مخالفت اپنی آخری سانس تک کی۔ وہ ہی ایک واحد شخص تھے کہ جب ہندوستان اور پاکستان اپنی آزادی کے جشن منا رہے تھے، وہ نواکھلی میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوئے لوگوں کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔اسی آپسی بھائی چارے کے قیام کی جستجو میں انہیں شہادت کا جام پینا پڑا۔نہرو کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا نظریہ مسلمانوں کے لیے تعصّبانہ تھا۔ یہ انہیں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان ایک ہندو

راج بننے کی بجائے ایک سیکولر ملک تسلیم کرلیا گیا جبکہ پاکستان کو جناح کے نہ چاہتے ہوئے بھی ''اسلامی'' قرار دیا گیا۔بہر حال میں حسن زیدی صاحب کے اس نتیجہ سے اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان میں اُبھرتے اس نظریے سے عوام کو باہر آنا ہوگا۔پاکستانی حکمرانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ملک کے عوام کی ترقی اور بہبودی کا انحصار دنیا میں تیزی سے بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنے پر ہے،ورنہ تاریخ انہیں ماضی کی تنگ و تاریک غاروں میں دھکیل دے گی۔اتنے اچھے اور عالمانہ مضمون کو جدید ادب میں جگہ دینے کے لیے آپ کو مبارک باد!

جگدیش پرکاش (دہلی)

نوٹ: جگدیش پرکاش صاحب! آپ کے خیالات کے لیے آپ کا شکریہ۔دراصل یہ بڑا احساس موضوع ہے۔انڈو پاک میں اس حوالے سے الگ الگ رائے پائی جاتی ہے۔پاکستان میں حسن جعفر زیدی صاحب کی بات کو تو کسی حد تک سن لیا جائے گا لیکن سرحد کے اس طرف سے آئی ہوئی رائے کو دوسرا رنگ دے دیا جائے گا۔یوں بھی دونوں طرف جو شبہات اور بے اعتمادی پائی جاتی ہے اس کے باعث اس موضوع پر مزید بحث سے احتراز ضروری ہے۔جتنا لکھا جا چکا،سب اپنے اپنے طور پر غور کرتے رہیں گے۔**(حیدر قریشی)**

Thank u for the current issue of your esteemed magazine.As I am interested in mathematical linguistics,the article on Alkindi was of special interest to me.I did not know that Alkindi was the founder of cryptography.I would like to be a regular subscriber of your magazine.Please indicate the amount of money to be remitted and the address to which it has to be sent....Anything new about Prof.Gopichand Narang?

Yours sincerely **Karamat Ali Karamat.**

''جدید ادب'' شمارہ نمبر ۱۵ر موصول ہو گیا۔شکریہ۔آپ کا اداریہ پڑھ کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔آپ نے لکھا ہے کہ ''اب پاکستان اور ہندوستان سے ڈاک خرچ ایک جیسا ہوشربا ہو گیا ہے۔جتنی لاگت کسی بھی اشاعتی منصوبے پر آتی ہے اس سے زیادہ ترسیل پر خرچ ہو جاتا ہے۔اس معاملہ میں دوست احباب کا تعاون ہمیشہ جیسا ہی ہے۔دو چار دوست جو تعاون کر دیتے ہیں سو کر دیتے ہیں،باقی یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہے کہ انہیں جو کتاب یا رسالہ مل رہا ہے اس پر کتنی مالیت کے ڈاک ٹکٹ لگے ہوئے ہیں۔''

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ کہ پاکستان کی تو مجھے خبر نہیں مگر ہمارے ہندوستان میں پچھلے کئی برسوں سے ڈاک خرچ میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوا ہے(۱)۔رجسٹرڈ پوسٹ سے ایک شمارہ بھیجنے پر یہاں مبلغ ۲۲ر روپے خرچ ہوتے ہیں۔اب رہی تعاون کی بات تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔پہلی صورت تو یہ ہے کہ احباب کو رسالہ ڈاک خرچ کی شرح سے وی پی سے بھیجا جائے اور اسی سے ڈاک خرچ نکال لیا

جائے۔دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ رسالے کی ایک قیمت مقرر کر دی جائے اور یہ قیمت ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے پتے پر بھیج دی جائے اور اسی سے سارے خرچے نکال لئے جائیں۔تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ رسالے کی نکاسی کی ذمہ داری ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کو دے دی جائے۔آپ صرف مواد انہیں ای میل کر دیں۔باقی وہ سمجھیں اور ان کا کام۔وہ صرف پبلشر ہی نہیں بلکہ ڈسٹری بیوٹر بھی ہیں۔ہندوستان میں رسالہ خرید کر پڑھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔اس طرح اس رسالہ کا حلقہ بھی بڑھے گا اور یہ عام قاری تک بھی پہنچ جائے گا۔اس خط کے لکھنے کی تحریک مجھے آپ کے اس جملے سے ملی کہ ''کسی نے بھی دلچسپی نہ لی تو اسی کو آخری شمارہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔''

اقبال حسن آزاد (مونگیر)

(۱) اقبال حسن آزاد صاحب! انڈیا میں اندرون ملک ڈاک کی حد تک آپ کی بات بجا ہے،لیکن بیرون ملک کے لیے ڈاک خرچ اس لیے مہنگا ہو گیا ہے کہ وہ اب سرفیس میل یا سی میل سے نہیں صرف ائر میل سے بھیجنا پڑتا ہے۔آپ کتابوں کے ایک کلو وزن کے پیکٹ کے ائر میل چارجز کا پتہ کر کے اندازہ کر لیجیے۔حیدر قریشی

جدید ادب شمارہ نمبر ۱۵ر سابقہ شماروں کی مانند نہایت وقیع اور جامع ہے۔کئی مضامین کافی عمدہ ہیں اور دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔خادم علی ہاشمی کا مضمون ''الکندی اور رمز شناسی'' تو اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ڈاکٹر ارشد جمال کا مضمون ''غالب کی احساس کمتری'' بھی اچھی کوشش ہے۔محترمہ صبیحہ خورشید نے ماہیے کے تعلق سے ایک اچھا مضمون پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا پر اردو ادب کا ایک اہم نام ہے۔موصوف ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔آپ نے ان کی دو طویل نظموں کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا۔وزیر آغا کی یہ دو طویل نظمیں واقعی عمدہ ہیں اور دعوت غور و فکر دیتی نظر آتی ہیں۔

غزلوں کا حصہ بھی بڑا بھاری بھرکم ہے۔۔میرا جی،ساقی فاروقی،مظفر حنفی،ندا فاضلی،شہناز نبی،کاوش پرتاپ گڈھی،کاوش عباسی،احمد حسین مجاہد اور صادق باجوہ کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔خصوصی مطالعہ کے تحت شبانہ یوسف،ارشاد عرشی اور حیدر قریشی کی غزلیں بھی دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔کئی اشعار تو نوٹ کئی جانے کے قابل ہیں مگر طوالت کے خوف سے مثالیں پیش نہیں کر رہا ہوں۔

افسانے حسب معمول عمدہ ہیں۔مگر مجھے جو افسانے خاص طور پر پسند آئے ان میں جوگندر پال کا ''بھرم''،شہناز خانم عابدی کا ''سیٹھ''،ماجد شاہ کا ''صبورہ''،احمد زغلول الشیطی رمحمد الیاس ندوی کا ''تین ہری چڑیاں'' اور فوزیہ مغل کا ''دلال'' شامل ہیں۔علامتی،تجریدی اور تجرباتی افسانے مجھے پسند نہیں آتے۔میرے خیال میں تخلیقی ادب کے لیے کسی مقدس سنجیدگی کی نہیں بلکہ ایک شیریں دیوانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

نظموں سے میں سرسری گزر جانے کا عادی ہو گیا ہوں۔آزاد نظمیں میرے مزاج سے میل نہیں

کھاتیں۔البتہ اکبر حمیدی اور محمد زبیر ٹیپو کے انشائیے مزا دے گئے۔ایوب خاور کا گوشہ بھی سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے اور خاصہ ہے۔لیکن سچ پوچھئے تو جو تحریر حاصل شمارہ ہے وہ حیدر قریشی کا ''**لبیک الھم لبیک**'' ہے۔دوران مطالعہ جانے کن کن جہانوں کی سیر کرآیا اور موت وحیات کے فلسفے پر پڑھے ہوئی باتیں ذہن میں آتی گئیں اور ساتھ ہی ساتھ فرائڈ کا نظریہ خواب بھی یاد آ گیا۔تحریر کی روانی کی تو کچھ مت پوچھئے۔ چند ایک مقامات پر مزاح کی چاشنی نے مزے کو دوبالا کر دیا ہے۔ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

''پانچ مہینوں میں مبارکہ اس حد تک صحت یاب ہو گئی کہ مجھے باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔کامیاب شوہر بخوبی جانتے ہیں کہ بیوی جب شوہر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکی ہے۔وگرنہ ناکام ونامراد شوہر تو بیوی سے سرعام جوتے یا دھکے کھا کر بھی کچھ نہیں سمجھ اور سیکھ پاتا۔البتہ اس کے انجام سے لوگ سبق ضرور سیکھ لیتے ہیں۔''

ایسی رواں دواں زبان لکھنے والے اب خال خال ہی ملتے ہیں۔ **اقبال حسن آزاد** (مونگیر)

حیدر قریشی صاحب جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے ناچیز کو آپ نے اپنا معیاری پرچہ فراہم کرایا۔

ایک وقت تھا کہ کافی دلچسپی تھی ادب میں لیکن ماحول کچھ اور ہونے کے ناتے میں اپنے اندر ادبی رمق پانے کے باوجود ادب سے دور ہوتا گیا جس کا 'پرواز' میں میں نے تذکرہ کیا ہے۔یہ بات حقیقت کہ جدید ادب جیسا شمارہ اب بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ ادبی سرگرمیوں میں جدید ادب میں جو پایا وہ کسی اور پرچے میں نہیں ملتا، متنوع رسالہ پڑھنے کو ملا۔بہت پسند آیا۔ایک دفعہ پھر شکریہ۔ **عزیز الرحمن سلفی** (بنارس، یوپی)

جدید ادب پڑھا۔آپکی محنت ہر صفحہ پر بولتی ہے۔افسانے بہت معیاری اور نئے ٹاپک لئے ہوئے ہیں۔آپکا شاعرانہ ذوق وشوق بھی جدت کے ساتھ تمام مطبوعہ کلام سے ظاہر ہے۔ 'بریکنگ نیوز' نے کچھ دہلا دیا۔بہت تیز دھاردار نشتر ہے جو دل میں درد جگاتا ہے۔'آگہی' 'دلال' 'آسودگی' 'صبورہ' 'سیٹھ' بس ٹھیک لگے۔'بھرم' اور 'جیون کا کھیل' بہترین کاوشیں ہیں۔

بہت سی بے نیازی اور ایک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے

شعر پسند آیا۔ **رخشندہ روحی** (دہلی)